رازئ ہند

پروفیسر حکیم محمد طیب

حکیم فخر عالم

ادارہ علم و ادب، علی گڑھ
2024

380847

رازیٔ ہند: پروفیسر حکیم محمد طیب

حکیم فخر عالم

ادارہ علم وادب، علی گڑھ
2024

©جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

کتاب :	رازیٔ ہند: پروفیسر حکیم محمد طیب
ترتیب :	حکیم فخر عالم
تعداد :	500
صفحات :	306
قیمت :	=/500 روپے
ناشر :	حکیم فخر عالم
طبع اول :	2013م
طبع دوم :	2024م
اہتمام :	ادارہ علم وادب، علی گڑھ
طابع :	اے آر انٹرپرائزز، نئی دہلی
تقسیم :	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ

ISBN: 978-81-940846-9-3

مصنف سے رابطہ:

Hakim Fakhre Alam

D -2nd Floor, Samreen Apartment,

Shah Basheer Colony,

Hadi Nagar,Dhaurra Mafi,Aligarh-202002,India

Mob: 9411653041 / 7078281442

e mail:fakhrealamx7598@gmail.com

حکیم فخر عالم

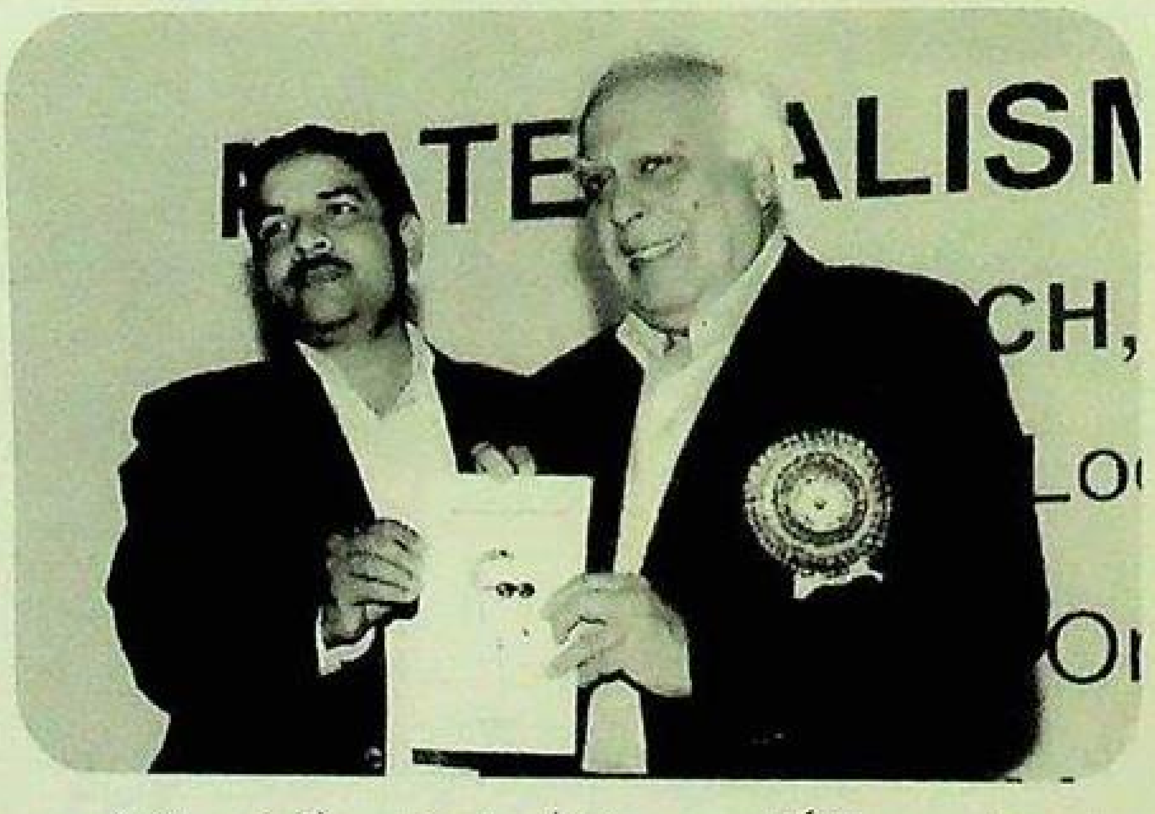

"رازیٔ ہند: پروفیسر حکیم محمد طیب" کے طبع اول کے اجراء کی ایک یادگار تصویر
جناب کپل سبل مرکزی وزیر برائے کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی، حکومت ہند (دائیں)
اور ساتھ میں حکیم فخر عالم (بائیں)

ہدیۂ محبت

عشرت جہاں

کے لیے

یہ وہ نام ہے، جس کی رفاقت ایک اچھے دوست اور شریک حیات کا احساس عطا کرتی ہے

دعاء ہے کہ یہ رشتۂ الفت تا حیات قائم رہے۔ آمین!

فخر عالم

ترتیب

نمبر شمار	عنوان	مقالہ نگار	صفحہ
۱	دیباچہ طبعِ ثانی		۱۱
۲	اظہارِ دروں	حکیم فخر عالم	۱۴
۳	تقریظ	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۱۹
۴	تأثرات	پروفیسر رئیس الرحمان	۲۳
۵	تأثرات	پروفیسر حکیم سید شاکر جمیل	۲۵
۶	چند لمحے تیری قربت کے (اپنے شوہر پروفیسر محمد طیب کی یاد میں)	بدر طیب	۲۸
۷	پروفیسر حکیم محمد طیب۔ حیات و خدمات	پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی	۳۶
۸	تقدمہ 'کتاب العشر مقالات فی العین'	شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی	۴۳
۹	تعارف 'قانون صحت'	شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی	۴۶
۱۰	تعارف 'کتاب العشر مقالات فی العین'	علامہ حکیم محمد کبیر الدین	۵۱
۱۱	بڑا ہے درد کا رشتہ (ڈاکٹر حکیم محمد طیب کی یاد میں)	پروفیسر ابوالکلام قاسمی	۵۲
۱۲	حکیم محمد طیب: ایک عبقری انسان	ڈاکٹر محمد خالد صدیقی	۶۱
۱۳	حکیم محمد طیب سے 'یونانی کونسل' کے روابط	پروفیسر حکیم سید شاکر جمیل	۶۶
۱۴	حکیم محمد طیب بحیثیت مصنف، مؤلف اور مترجم	حکیم وسیم احمد اعظمی	۷۰

15	حکیم محمد طیب بحیثیت مورخ	حکیم وسیم احمد اعظمی	۹۷
۱۶	ایک قابل تقلید شخصیت	پروفیسر حکیم نعیم احمد خاں	۱۰۹
۱۷	حکیم محمد طیب صاحب. ایک باکمال طبیب اور منفرد انسان	پروفیسر حکیم عبدالمنان	۱۲۰
۱۸	حکیم محمد طیب کے معالجہ کا ایک معجزاتی واقعہ	حکیم صغیر احمد صدیقی	۱۲۹
۱۹	حکیم محمد طیب بحیثیت معالج	حکیم وسیم احمد اعظمی	۱۳۴
۲۰	پروفیسر حکیم محمد طیب۔ ایک مثالی استاذ	پروفیسر انیس احمد انصاری	۱۴۱
۲۱	پروفیسر حکیم محمد طیب	ڈاکٹر غفران احمد	۱۴۴
۲۲	حضرت الاستاذ حکیم محمد طیب صاحبؒ	پروفیسر حکیم جلیس احمد	۱۶۵
۲۳	حکیم محمد طیب کا طریقۂ تدریس	ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی	۱۷۰
۲۴	پروفیسر حکیم محمد طیب بحیثیت ایک استاذ	پروفیسر حکیم عبدالودود	۱۷۵
۲۵	استاذ الاساتذہ پروفیسر حکیم محمد طیب مرحوم	حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی	۱۸۰
۲۶	پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب۔ یادیں اور تأثرات	پروفیسر حکیم سید مودود اشرف	۱۹۰
۲۷	حکیم محمد طیب صاحب سے ہمارے مراسم	طبیبہ ام الفضل	۱۹۷
۲۸	پروفیسر حکیم محمد طیب۔ یادوں کے حصار میں	پروفیسر حکیم سعد عثمانی	۲۰۳
۲۹	آہ! حکیم محمد طیب	حکیم سید غلام مہدی راز	۲۱۱
۳۰	ایک جامع اوصاف وکمالات شخصیت	پروفیسر ابوبکر خاں	۲۲۴
۳۱	حکیم محمد طیب۔ یونانی طب کی ایک عبقری شخصیت	پروفیسر اقتدار الحسن زیدی	۲۲۷
۳۲	حکیم محمد طیب صاحب	پروفیسر تاج الدین	۲۳۵
۳۳	حکیم محمد طیب۔ اپنی شرائط پر زندگی گزارنے والا ایک انسان	حکیم اشہر قدیر	۲۴۰
۳۴	پروفیسر حکیم محمد طیب۔ ایک طبی دانشور	ڈاکٹر خاور ہاشمی	۲۵۴
۳۵	حکیم محمد طیب صاحب اور آر آر آئی یو ایم، علی گڑھ	ڈاکٹر شارق علی خاں	۲۶۱
۳۶	پروفیسر حکیم محمد طیب۔ پیکر علم وعمل	حکیم شمس الآفاق	۲۶۶

۳۷	حکیم محمد طیب	حکیم ظل الرحمٰن	۲۷۱
۳۸	باتیں ایک منفرد انسان کی	پروفیسر منصور احمد صدیقی	۲۷۵
۳۹	کتاب العشر مقالات فی العین ۔ ایک تجزیاتی مطالعہ	ڈاکٹر وسیم احمد اور ڈاکٹر بدر الدجی خاں	۲۸۰
۴۰	حکیم محمد طیب صاحب	حکیم شمیم ارشاد اعظمی	۲۸۵
۴۱	استاذی پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب ۔ احوال و آثار	حکیم اقبال احمد قاسمی	۲۹۲
۴۲	پروفیسر حکیم محمد طیب: کچھ یادیں، کچھ باتیں	پروفیسر مشتاق احمد/ڈاکٹر مسعود المظفر علی	۲۹۴
۴۳	زندگی نامہ		۳۰۰

دیباچہ طبعِ ثانی

رازیٔ ہند مشاہیر کے مقالات پر مشتمل پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کا سوانحی تذکرہ ہے۔اس مجموعہ میں معاصر طبی دنیا کا شاید ہی کوئی ایسا بڑا نام ہو جو شامل ہونے سے رہ گیا ہو کسی کی عظمت کا سارا زمانہ معترف ہو جائے، ایسا کم دیکھنے کو ملتا ہے۔۵ جون ۲۰۱۳ء کو حکیم طیب صاحب نے وفات پائی، ۶/دسمبر ۲۰۱۳ء کو یہ مجموعہ تیار ہو کر پریس میں طباعت کے لیے تھا۔ چھ ماہ ایسے کاموں کے خاکے بنانے میں لگ جاتے ہیں اور ہم اس مدت میں سب کچھ کر گزرے ،اہلِ علم سے رابطہ، ان سے مقالات کا حصول، کمپوزنگ اور اشاعت کے سارے کام۔ یہ سب آسان نہیں تھا، مگر طیب صاحب کی شخصیت کے فیضان نے ساری مشکلوں کو سہل بنا دیا۔ پھر شایانِ شان انداز میں انڈیا اسلامک کلچر سنٹر دہلی میں کمیونیکیشن اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی کے مرکزی وزیر جناب کپل سبل نے اس کا اجراء کیا، اس سلسلے کی دوسری تقریب اجمل خاں طبیہ کالج میں منعقد کی گئی، یہاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ لفٹننٹ (ر) ضمیر الدین شاہ اور آنریری ٹریزرر جناب نواب ابن سعید خاں چھتاری کے ہاتھوں اس کے اجراء کی رسم ادا پائی۔اس مجموعہ کی پانچ سو کاپیاں چند مہینے میں ختم ہو گئیں، پھر بھی بہت سے لوگوں کو شکوہ رہا کہ انہیں یہ مجموعہ نہیں مل سکا، اسی وقت سے طبعِ ثانی کا اصرار تھا، مگر گونا گوں علمی مصروفیات نے اس کا موقع نہیں دیا۔اب تقاضے اتنے شدید ہو چکے ہیں کہ طبعِ ثانی کے لیے وقت فارغ کرنا از بسکہ ضروری ہو گیا ہے۔

طبع اول میں پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی ازدواجی اور گھریلو زندگی پیش نہیں کی جاسکی تھی، یہ کمی شدت سے کھل رہی تھی، اس کا ازالہ صرف طیب صاحب کی اہلیہ (بدر آپا) کرسکتی تھیں، جن سے بوجوہ رابطہ نہیں ہو پایا تھا، جب انہوں نے 'رازیٔ ہند' دیکھا تو کہنے لگیں کہ آپ نے اس مجموعہ کے لیے مجھ سے لکھنے کی فرمائش کیوں نہیں کی؟، تو میں کوئی جائز عذر نہیں پیش کرسکا، تاہم عرض کیا کہ آپ اپنی یادیں قلم بند کردیں اشاعتِ ثانی میں شامل کرلوں گا۔ پھر ایک ملاقات میں انہوں نے ایک نوٹ بک دی، جس میں ایک مضمون 'چند لمحے تیری قربت کے' اور کچھ رثائی اشعار تھے جو انہوں نے طیب صاحب کی یاد میں کہے تھے۔ ان کے اشعار پر میں نے حکیم سید غلام مہدی رازؔ صاحب سے اصلاح لے لی تھی تاکہ ان کا فنی سُقم دور ہوجائے اور قابلِ اشاعت ہوجائیں، مگر یہ جستجو کے باوجود اس وقت مل نہیں پارہے ہیں، یاد نہیں کہاں رکھ دیا۔

بدر آپا حیات ہوتیں تو اپنی تحریر کو مطبوعہ صورت میں دیکھ کر بے حد خوش ہوتیں۔ 'رازیٔ ہند' پڑھنے کے بعد وہ مجھ سے ملنے کی اس قدر خواہش مند تھیں کہ اپنی بیٹی شاذیہ سے روز پوچھتیں کہ فخر عالم مجھ سے ملنے کب آرہے ہیں۔ وہ منظر میری نگاہوں میں ہے، شاذیہ مجھے لے کر بدر آپا کے پاس پہونچیں، جب بتایا کہ یہی فخر عالم صاحب ہیں، جنہوں نے 'رازیٔ ہند' مرتب کیا ہے۔ وہ کھڑی ہوئیں اور بیٹے کی طرح گلے لگالیا، پھر بڑی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ انہوں نے اپنی ازدواجی اور گھریلو زندگی سے متعلق کھل کر بات کی، ان کی باتوں میں علی گڑھ کے کئی لوگوں کا تذکرہ تھا جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں۔ بدر آپا کی بے شمار یادوں کے ساتھ ان کی تحریر اس مجموعہ میں شامل کی جارہی ہے، اس سے ایک بڑی کمی پوری ہوگئی ہے، امید ہے اسے پڑھ کر طیب صاحب کی گھریلو زندگی سے متعلق لوگوں کے تاثرات بدل لیں گے، جو افواہوں کی وجہ سے کچھ ذہنوں میں پائے جاتے ہیں۔

پہلی اشاعت میں پروفیسر مشتاق صاحب کا مضمون Reminiscence of My Association with Prof.Hakeem Mohammad Taiyab انگریزی میں

تھا، ڈاکٹر سعود الظفر علی نے 'پروفیسر حکیم محمد طیب: کچھ یادیں، کچھ باتیں' کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کر دیا ہے، اس سے مجموعہ میں لسانی یک رنگی پیدا ہو گئی۔ امید ہے قارئین کو طبع جدید کے یہ اضافے اور تبدیلیاں پسند آئیں گی اور اس کی پذیرائی ہو گی۔

حکیم فخر عالم

علی گڑھ

اظہارِ دروں

سوانحی ادب کا شمار اہم نثری اصناف میں ہے، اس کا ایک ذیلی عنوان تذکرہ نگاری ہے۔ یہ ایک قسم کی داستان ہے جو صاحبِ تذکرہ کے بارے میں تذکرہ نویس کے احساسات، جذبات اور تاثرات پر مشتمل ہوتی ہے، اس میں مثبت اور منفی دونوں طرح کے خیالات کی گنجائش ہے، مگر چونکہ اس کا محرک اظہارِ تعلق ہوتا ہے، اس لیے عموماً اس میں صاحبِ تذکرہ کے محاسن اور اوصاف وکمالات ہی قلم بند کیے جاتے ہیں، معایب اور کمزور پہلوؤں سے بالقصد صرفِ نظر کرلیا جاتا ہے، ورنہ ظاہر ہے، ہر انسان میں خوبیوں کے ساتھ کچھ کمیاں بھی ہوتی ہیں، اسی لیے انسانی کمزوریوں کو تقاضائے بشریت کہا جاتا ہے۔ تذکرہ نویس کو ان دونوں شخصی پہلوؤں کے بیان کا اس لیے پابند نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ وہ اپنے جذبۂ تعلق کا اظہار کررہا ہے، اپنائیت کی باتوں میں تو خوبیاں ہی بیان ہوتی ہیں اور مذہبی تاکید بھی یہی ہے کہ جانے والے کا تذکرہ خوبیوں کے ساتھ کیا جائے۔

'تذکرہ' محض ایک زندگی کی داستان نہیں ہوتا، بلکہ اس کے مطالعہ سے انسانی عظمت کے وہ راز منکشف ہوتے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اوصاف وکمالات کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوسکا ہے۔ مختلف ادبی اصناف میں تذکرہ کے مطالعہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کا قاری ادبی چاشنی سے محظوظ ہونے کے ساتھ شخصیت سازی کی باتیں اور اس کی تعمیر وترقی کے بہت سے سامان اور اقدار واخلاقیات کا درس پاتا ہے۔ تذکرہ خوانی کی اہمیت کا ایک پہلو

یہ بھی ہے کہ اس میں صاحبِ تذکرہ کے سوانحی واقعات کے علاوہ بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں، جن سے مستقبل کی تاریخ اخذ مواد کرسکتی ہے۔ بایں ہمہ ایک تذکرہ ادب، اخلاقیات اور تاریخ کا مجموعہ ہوتا ہے۔

چونکہ تذکرے تعلقِ خاطر کی بنیاد پر لکھے جاتے ہیں، اس لیے راقم کو اپنے متعلق کے معایب سے اغماض کی رخصت تو ہے، لیکن محاسن کے بیان میں غلو کی اجازت نہیں، کیونکہ یہ ایک قسم کی غلط بیانی ہے، جو قاری کے ساتھ دھوکہ کے مترادف ہے، علمی دیانت داری کے منافی ہونے کی وجہ سے یہ طرزِ عمل معیوب اور مذموم خیال کیا جاتا ہے، تذکروں میں یہ نقص بہت عام ہے۔ بسا اوقات تذکرہ نویس مبالغہ کی حدوں سے تجاوز کرکے صاحبِ تذکرہ میں ایسی صفات اور ایسے کمالات پیدا کرڈالتا ہے، جو کبھی اس میں تھے ہی نہیں۔ تذکروں میں مدح کے عناصر کا در آنا عام بات ہے، اردو تذکروں میں یہ اور بھی عام ہے، اس لیے کہ اردو اسلوب بیان میں مبالغہ کا انداز، اس کے ہیئتی خمیر کا حصہ ہے، غالباً ایسا اس لیے ہے کہ یہ زبان زیادہ تر شعر و ادب کے لیے استعمال ہوئی ہے، خالص علمی، تکنیکی اور سائنسی علوم کے لیے اس کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ زیرِ نظر تذکرہ اردو زبان میں ہے، اس لیے اس میں بھی اس نقص کے راہ پانے کا پورا امکان تھا، لیکن اس کے بارے میں یہ بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس میں تذکرہ نگاری کے لوازم تو ہیں، مگر بے جا اوصاف و کمالات اور مبالغہ آمیزی کے نقائص سے یہ محفوظ ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ مجموعہ ایک ایسی جامعِ صفات، شخصیت کے تذکرہ پر مشتمل ہے، جس کے اظہارِ عظمت کے لیے کسی مبالغہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

جو شخصیت اس تذکرہ کی موضوع ہے، اسے دنیائے علم و طب پروفیسر حکیم محمد طیب کے نام سے جانتی ہے۔ طیب صاحب ۷/جنوری ۱۹۳۲ء کو بارہ بنکی کے مشہور قصبہ ردولی میں پیدا ہوئے، وہ ذاتی عظمتوں کے علاوہ اعلیٰ خاندانی پس منظر کے حامل تھے، ان کے اسلاف میں شیخ احمد عبدالحق توشہ ردولوی، چشتیہ صابریہ سلسلہ کے مشہور بزرگ گزرے ہیں، وہ شیخ جلال الدین کبیر الاولیاء پانی پتی سے خرقۂ خلافت سے سرفراز تھے، ردولی میں ان کا مزار آج بھی مرجعِ خلائق

ہے۔ شیخ عبدالحق کے جد بزرگوار شیخ داؤد، سلطان علاء الدین خلجی کے دورِ حکومت میں افغانستان کے صوبہ بلخ سے ہندوستان آئے تھے، وہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی کے حلقۂ ارادت سے وابستہ تھے اور ان سے خلافت پائی تھی، شیخ داؤد کا سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب پر منتہی ہے، ان کو صوبۂ اودھ کی طرف سے جاگیر عطا ہوئی تھی، اسی لیے وہ رودولی میں سکونت پذیر ہوئے، پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب اسی بزرگ خانوادہ کے فرد تھے، فاروقیت اور افغانیت کی نسبتوں نے ان کے مزاج میں ایک قسم کا کرّ وفر اور جاہ وجلال پیدا کر دیا تھا، جو ان کی شخصیت کی ہر ادا سے عیاں تھا، انہیں ان نسبتوں کے بیانیہ اظہار کی چنداں ضرورت نہیں تھی، بلکہ ان سے ملنے والا چند ساعت ہی میں اس کا ادراک کر لیتا تھا۔ اعلیٰ خاندانی نسبت اور بزرگ خانوادہ سے تعلق تو ان کو بطور میراث ملے تھے، اس سے قطع نظر وہ ذاتی طور پر گونا گوں کمالات سے متصف تھے، جسے انہوں نے مبدأ فیض سے کسب کیا تھا۔ ذہانت وفطانت، اعلیٰ تدریسی صلاحیت، علاج ومعالجہ میں حذاقت، ترجمہ وتالیف کی معرفت، رموزِ تحقیق کی بصیرت، عمدہ انتظامی لیاقت، زبان وبیان کی نفاست اور جوہرِ خطابت جیسے مجموعۂ صفات نے ان کی شخصیت کو ہشت پہلو بنا دیا تھا۔ عظیم خاندانی پس منظر اور حسنِ ذات کی ان متنوع صفات نے ان کے مزاج میں ایک قسم کا احساسِ عظمت پیدا کر دیا تھا، اسے خود شناسی بھی کہا جا سکتا ہے، جو دراصل اسرارِ خودی کی معرفت اور عرفانِ ذات کی ایک شکل ہے۔ اکثر خودی کی بلندیوں کا سرا انانیت کی حدوں کو چھو جاتا ہے، اس کے مظاہر حکیم طیب صاحب کے مزاج میں بھی محسوس ہوتے ہیں، جسے عموماً مزاجی کرختگی، تندی اور سخت گیری سے بیان کیا جاتا ہے، اس کی چاہے جو تعبیر کی جائے، لیکن اسے صحیح تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔

حکیم طیب صاحب کے تمام کسبی کمالات میں معالجانہ حذاقت کا وصف زیادہ نمایاں تھا، ان کے اوصاف میں اس کا چرچا سب سے زیادہ رہا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی دیگر صلاحیتوں کی فیض رسانیاں، فن اور اہلِ فن کے لیے خاص تھیں، جبکہ طبی حذاقت کا تعلق عوام وخواص دونوں کے استفادے سے تھا، ایک طبیب میں یہ وصف اس لیے بہت اہمیت کا حامل ہے کہ تمام طبی سرگرمیاں چاہے وہ تعلیم وتحقیق سے جڑی ہوں یا تصنیف وتالیف سے متعلق

ہوں، ان سب کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ شفا بخشی کی صورت میں ان کے مظاہر سامنے آئیں اور ان سے بیمار انسانیت کو مستفید ہونے کا موقع فراہم ہو، ورنہ یہ بے سود ہیں اور زمانہ کی نظر میں لن ترانی کے مترادف ہیں۔

حکیم طیب صاحب کے اندر متنوع علمی کمالات تھے، وہ کسی کے بھی ذریعہ شہرت اور ناموری حاصل کر سکتے تھے، مگر انہوں نے طب کے عملی میدان کا انتخاب کیا اور زندگی کے آخری لمحہ تک اس میں سرگرم عمل رہے۔ ۵ر جون ۲۰۱۳ء کی شب میں انہوں نے وفات پائی، معمول کے مطابق اس روز بھی انہوں نے امیر نشاں، علی گڑھ میں اپنی رہائش گاہ، 'الشفاء' میں واقع مطب پر شام چھ بجے تک مریضوں کو فیض بخشا۔ انہوں نے اپنے مکان کا نام 'الشفاء' رکھا تھا، یہ نام مطب و معالجہ سے ان کی غیر معمولی دلچسپی کا مظہر تھا، مکان کا یہ نام صحیح معنوں میں اسم با مسمیٰ تھا اور ہمیشہ مریضوں کے لیے شفاء گاہ بنا رہا۔

حکیم طیب صاحب کی شخصیت اطبائے سلف کا نمونہ تھی، جس میں عربی عہد کے نامور طبیب ابوبکر محمد بن زکریا رازی کا عکس محسوس ہوتا تھا، اس مماثلت کی وجہ سے جب میں نے اس تذکرہ کو 'رازیٔ ہند' کے نام سے موسوم کرنے کا قصد کیا اور اپنے احباب سے اس خیال کا اظہار کیا تو انہوں نے میری اس تجویز کو نہ صرف پسند کیا، بلکہ اسے حکیم طیب صاحب کی شخصیت کی نہایت جامع تعبیر قرار دیا۔

اس تذکرہ کے اکثر قلم کاروں نے اپنے تأثرات میں حکیم طیب صاحب کی معالجانہ حذاقت کی تحسین کی ہے اور علاج و معالجہ کے میدان میں ان کے کارناموں کا ذکر نہایت تفصیل سے کیا ہے۔ بلاشبہ حکیم طیب صاحب ایک بڑے طبیب تھے اور ان کا مطب اس زمانہ میں یونانی معالجہ کی آخری امید تھا، ان خوبیوں کے ساتھ اس کا سب سے قابلِ ذکر وصف یہ تھا کہ وہ ایک قسم کا 'کلینکل ریسرچ سنٹر' تھا، جس کے تجرباتی نتائج دنیائے طب کے سامنے ان متعدد مرکبات کی صورت میں ہیں، جو حکیم صاحب کے تلامذہ اور علی گڑھ کے سینئر اساتذہ کے مطابق دوا خانہ طبیہ کالج کی مصنوعات کا حصہ ہیں۔ ابھی ۲۰۱۱ء میں وزارتِ صحت حکومت ہند نے

National Formulary of Unani Medicine (NFUM) کی چھٹی جلد شائع کی ہے۔ NFUM کا یہ حصہ دواخانہ طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی پیٹنٹ دواؤں کی تفصیل پر محیط ہے، اس میں حکیم طیب صاحب کے تالیف کردہ متعدد نسخے بھی شامل ہیں۔

اس وقت میڈیکل سائنس کے لیے عسیر العلاج امراض کی دواؤں کی تلاش سب سے بڑا چیلنج ہے، New Drug Development کے اس مسئلہ کے حل کے سلسلہ میں حکیم طیب صاحب کے مخترع نسخے قابل قدر تحقیقی بازیافت کی حیثیت رکھتے ہیں، NFUM میں شمولیت سے ان پر حکومت کی مہر تصدیق لگ گئی ہے اور ان نسخوں نے استناد کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ اب حکیم طیب صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی یہ ادویاتی اختراعات، ان کی فیض رسانیوں کو ان کے بعد بھی جاری رکھنے کا ذریعہ ہیں۔

حکیم طیب صاحب موجودہ طبی دنیا کی محض نمائندہ شخصیت نہیں تھے، بلکہ اس عہد کی سب سے بڑی علامت تھے، اس لیے ان کی رحلت ایک عہد کا خاتمہ ہے اور ان کا یہ تذکرہ، ان کی شخصیت کے ساتھ ان کے زمانہ کی طبی سرگرمیوں کی ایک مکمل تاریخ ہے، امید ہے کہ اس 'تذکرہ' کا مطالعہ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کے سوانحی حالات، ذاتی اوصاف، شخصی امتیازات اور فنی کمالات سے واقفیت کا اہم ذریعہ اور مستقبل کی طبی تاریخ کے لیے کسبِ مواد کا معتبر وسیلہ ہوگا، نیز قاری کے لیے ایک سبق آموز داستان ثابت ہوگا، جس کی روشنی میں اسے شخصیت سازی اور کردار و عمل کی تزئین و تہذیب کا موقع فراہم ہوگا، مزید برآں یہ 'تذکرہ' یونانی طب کی موجودہ نسل کے فنی جذبہ کو مہمیز کرنے میں معاون ہوگا اور ان کے اندر فن کی تعمیر و ترقی کا شوق بیدار کرے گا، تا کہ وہ اپنے اسلاف کے اہل جانشیں بن سکیں۔ یہی اس 'تذکرہ' کی ترتیب کے مقاصد ہیں۔

فخر عالم

مورخہ ۶ر دسمبر ۲۰۱۳ء

تقریظ

حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

حکیم فخر عالم نئی پود کے ابھرتے ہوئے قلمکاروں میں ہیں، ان سے مستقبل میں بجا طور پر بڑی امیدیں وابستہ ہیں، فخر عالم کا تعلق اعظم گڑھ کے ایک علمی و دینی خانوادہ سے ہے، جو دیندار ہونے کے ساتھ ایک خوشحال گھرانہ ہے۔ گاؤں میں ابتدائی تعلیم کے بعد اعظم گڑھ کی مشہور و معروف دینی درسگاہ 'مدرسۃ الاصلاح' سے انہیں اسلامیات کے علاوہ اردو، عربی، فارسی اور انگریزی زبان و ادب پر دستگاہ حاصل کرنے کا زریں موقع ملا۔ مدرسۃ الاصلاح سے سند فضیلت حاصل کر کے انہوں نے مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کا رخ کیا اور اجمل خاں طبیہ کالج سے طبی علوم میں منتہی بن کر نکلے، یعنی بی یو ایم ایس اور ایم ڈی (گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن) کی ڈگری حاصل کرنے کی سعادت حاصل کی۔ طبی تعلیم سے فراغت کے بعد ان کی مختلف اداروں سے مختصر مدتی وابستگی رہی، بالآخر ۱۴ر جولائی ۲۰۰۶ء سے وہ یونانی کونسل سے وابستہ ہیں۔ سی سی آر یو ایم کے ایک علمی تحقیقی منصوبہ کے تحت وہ پانچ سال تک ابن سینا اکیڈمی علی گڑھ سے وابستہ رہے ہیں، یہاں انہوں نے عربی و فارسی کے کئی طبی مخطوطوں کی تدوین و تہذیب اور ترجمہ کا کام نہایت سلیقہ سے انجام دیا ہے، مدرسۃ الاصلاح اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جیسے گہوارۂ علوم سے استفادہ کی وجہ سے قدیم علوم و فلسفہ کے ساتھ ساتھ، جدید علوم کی تنویریں بھی

ان کی تحریروں میں ضوفشاں نظر آتی ہیں۔

فخر عالم کے اسلوب نگارش میں بڑی جاذبیت ہوتی ہے، لیکن یہ جاذبیت محض ظاہری کشش تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ اس میں حقیقت تک رسائی کی بھرپور کوشش ہوتی ہے۔ بقول شخصے

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن　　　جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ تعلیم وتربیت اور اخلاق حسنہ جیسے ارکان ثلثہ سے ان کی شخصیت کی تعمیر ہوئی ہے، جس کا مظہر ان کی ذات بھی ہے اور تحریر بھی۔

میں نے ان کو ہمیشہ علم کا نہ صرف جُویا، بلکہ اس کے لیے سرگرداں بھی پایا، ان کے اسی جذبۂ بیتاب نے بہت جلد انہیں اپنے ہمعصروں میں اہم مقام عطا کر دیا، جو خونِ جگر کے بغیر ممکن نہ تھا

رنگ ہو یا سنگ وخشت، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

فخر عالم کو اکثر علمی موشگافیوں میں غلطاں وپیچاں اور فکر وفن کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے پایا گیا ہے، جس کی خاطر وہ مختلف لائبریریوں اور شخصی ملاقاتوں کا غیر مختتم سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ تلاش وجستجو کا یہ صبر آزما وطیرہ انہیں بہر حال علم وفن سے بہرہ ور کرتا رہتا ہے، جسے وہ اپنے مخصوص اسلوب میں ڈھال کر علم دوست اربابِ فن کی خدمت میں بڑے خلوص کے ساتھ بطور نذرانہ پیش کر کے فخر محسوس کرتے ہیں، جسے دیکھ کر بیساختہ یہ دعا نکلتی ہے۔ع

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

اردو کے علاوہ عربی وفارسی زبانوں پر دسترس ہونے کے سبب اصل مآخذ تک رسائی ان کے ذہن وفکر کا ادنیٰ اعجاز ہوتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ عصری طبّی ادب پر ان کی نظر نہیں، بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ معاصر ادب سے بھرپور آگہی رکھتے ہیں اور اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں عصری حسیت، عالمانہ بصیرت بھرپور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر رہتی ہے، جس کے مظہر سو سے زائد ان کے مطبوعہ مقالات ہیں،

علاوہ بریں ایک درجن کتابوں کی تدوین وتہذیب اس پر مستزاد۔

دورانِ گفتگو تو خیران کی ذہانت وفطانت نیز زیرکی صاف محسوس ہوتی ہے، تاہم ان کے سکوت اور خاموشی کے دوران بھی ان کے چہرے بشرے سے غور وفکر کی تحریریں بآسانی پڑھی جاسکتی ہیں۔ان کے افکار وخیالات میں رجائیت اور شگفتگی کی فراوانی ہوتی ہے، قنوطیت سے ان کی تحریریں آشنا نہیں۔ان کا مطالعہ بہت وسیع اور عمیق ہے، اس کے باوجود وہ خود کو طالب علم سمجھتے ہیں، منسکر المزاجی ان کے خمیر میں داخل ہے۔ یہ وہ اوصاف حمیدہ ہیں، جو انہیں ہمیشہ نئی رفعتوں سے ہمکنار کرتے رہیں گے۔

طبّی ادب میں بظاہر جس کا کوئی مقام نہ ہو، اس کا اسے جائز مقام دلا دینا بڑے حوصلے اور عزیمت کی بات ہے، جو کم عیار شخص انجام ہی نہیں دے سکتا۔اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ پروفیسر حکیم محمد طیب سریری میدان کے سرخیل تھے، اس کے باوصف ان کے قریبی لوگوں کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کا فنّی شعور بھی بہت پختہ اور بلند تھا، تاہم طبّی ادب میں انہیں وہ مقام حاصل نہ تھا، جس کا مطالبہ یہ کتاب کر رہی ہے۔ فخر عالم نے مختلف اربابِ قلم سے رابطہ قائم کر کے بڑے وقیع مقالات لکھوائے ہیں، جس کے لیے انہیں کتنی تگ ودو اور منت وسماجت کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ کچھ اہلِ قلم ہی لگا سکتے ہیں۔اس سلسلے میں جب وہ میرے پاس آئے تو تھوڑی دیر کے لیے میں سکتے میں آ گیا، ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا کہ اس شخص کے بارے میں کیا لکھا جاسکتا ہے جو نام ونمود سے تاحیات کوسوں دور رہا ہو اور زندگی کے آخری پڑاؤ پر عزلت نشیں ہو گیا ہو۔فخر عالم میری کیفیت بھانپ گئے اور میری مشکل آسان کرتے ہوئے کہا کہ اپنے تاثرات ہی لکھ دیجیے، کیونکہ وہ چار سال تک علی گڑھ میں آپ کے پروجیکٹ آفیسر رہ چکے ہیں، میں نے وعدہ تو کر لیا لیکن تلاشِ گمشدہ کی فکر میں صرف حواس مجتمع کرنے میں دو تین دن لگ گئے اور بالآخر ایک مضمون (جیسا بھی ممکن ہوا) لکھ کر دے دیا، جب اوائل دسمبر میں فخر عالم نے کتاب کا کمپوز شدہ مسودہ لا کر دکھایا تو میں نم دیدہ ہو گیا، جس سے حیرت ومسرت کی ملی جلی کیفیت کی غمازی ہو رہی تھی، اس قلیل مدت میں اتنی وقیع کتاب،

واقعی حیرت انگیز ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ کام کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں کام لینے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ ان کی عجلت پسندی کا ایک راز غالباً یہ بھی تھا کہ ابھی خوش قسمتی سے وہ لوگ موجود ہیں جنہوں نے حکیم محمد طیب کو دیکھا ہے، بعد میں یہ کام مشکل سے مشکل تر ہوجائے گا، جب کہ ان کا انحصار بیشتر ثانوی ذرائع پر ہوجائے گا۔ ظاہر ہے اس میں وہ بات کہاں سے پیدا ہوسکتی ہے۔ ع

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

اس کتاب کی چند ممتاز خوبیاں یہ ہیں:

اس میں طیب صاحب کی شخصیت اور فکر وفن کے متعدد پہلو اجاگر کیے گئے ہیں، چنانچہ ان کی شخصیت اور فکر وفن کا شاید ہی کوئی پہلو ایسا ہو، جس سے صَرفِ نظر کیا گیا ہو۔ ان کی شخصیت کے ہر زاویہ پر اس طرح روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، جس سے ان کے سبھی گوشۂ حیات احاطہ میں آگئے ہیں اور ان کا ایک ایسا خاکہ بن گیا ہے، جس میں تأثرات، تحسین و توصیف اور تحلیل وتجزیہ، ہر رنگ نہایت متوازن انداز میں موجود ہے۔

خوبصورت اندازِ پیشکش اور دلکش ترتیب وتہذیب نے اسے انتہائی دلچسپ اور معلومات آفریں بنادیا ہے۔ حکیم فخر عالم کی اس کاوش کو اس موضوع پر ہمیشہ اوّلیت اور طیب شناسی کے بنیادی ماخذ کی حیثیت حاصل رہے گی، جس کے لیے وہ مستحقِ مبارک باد ہیں۔

تأثرات

پروفیسر رئیس الرحمان

ایڈوائزر (یونانی)، شعبۂ آیوش، وزارتِ صحت و خاندانی بہبود، حکومت ہند

آزادی کے بعد طبّی تعلیم اور تحقیق کے تعلق سے ایک قسم کی خوشگوار تبدیلی محسوس ہو رہی ہے۔ ملک گیر سطح پر طبّی درسگاہوں کے قیام سے جہاں تعلیم کے مواقع میں اضافہ ہوا ہے، وہیں سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جو تحقیقی سرگرمیاں پیدا ہوئی ہیں، ان سے اس طریقۂ علاج کے روایتی خدوخال میں مثبت بدلاؤ کی امید ہوئی ہے، بلکہ کافی حد تک اس کے اثرات بھی نظر آ رہے ہیں، لیکن حیرت ہے کہ تعلیم و تحقیق کے وہ نتائج منتج نہیں ہو رہے ہیں، جو متوقع تھے۔ اس لیے کہ علاج و معالجہ ہی ان کے عملی مظاہر ہیں، مگر انہیں نہ دیکھ کر مایوسی کا احساس ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تعلیمی و تحقیقی سرگرمیاں بڑھنے کے ساتھ مطب و معالجہ کے چلن میں مزید اضافہ ہوتا اور روایتی طرز کے بجائے اطباء کے جدید انداز کے مطب ہوتے، جن سے عوام کو تعلیم و تحقیق کے اس نئے عہد میں ماضی سے زیادہ بہتر شکل میں طبِ یونانی سے مستفید ہونے کا موقع ملتا، جب کہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ ہر سال یونانی فارغین کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، مگر معالجاتی میدان میں طبیبوں کی تعداد مستقل گھٹ رہی ہے اور یہ اتنی کم ہوگئی ہے، جسے برائے نام ہی کہا جا سکتا ہے، جو ہیں بھی ان میں سے بیشتر عطائی ہیں۔ اس تاریک فضا میں حکیم طیب صاحب کی

شخصیت ایک روشنی جیسی تھی۔ وہ اس لحاظ سے اس عہد کے فرد فرید تھے کہ ان کی ذات سے مطب و معالجہ کی روایت زندہ تھی اور اس کا وقار و اعتبار قائم تھا۔ جس طرح ان کی شخصیت بحیثیت طبیب کے ممتاز تھی، اسی طرح تعلیم و تدریس کے حوالہ سے بھی انہیں معاصرین میں امتیاز حاصل تھا۔ ان کمالات کے ساتھ ان کا بڑا وصف یہ تھا کہ وہ یونانی طب کے روایتی کردار کی حمایت کے ساتھ، عصری تقاضوں کے مطابق اس کی تجدید اور تشکیلِ نو کے بھی موید تھے، دراصل وہ چاہتے تھے کہ یونانی طب کی فنی روح کو ایک ایسا جسم عطا کیا جائے کہ یہ اپنی کلاسیکیت کے ساتھ اس عہد کا چہرہ معلوم ہو۔

اعلیٰ فکری بصیرت، طبی حذاقت اور علمی لیاقت جیسے گوناگوں کمالات کی وجہ سے، حکیم طیب صاحب کی شخصیت حاملین فن کے لیے ہمیشہ مشعلِ راہ رہی۔ ان کی وفات کے بعد ان کے 'تذکرہ' کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کرنے کی ضرورت تھی، تاکہ وہ اس کے مطالعہ سے کسبِ فیض کرسکیں۔ حکیم فخر عالم نے یہ اہم کام انجام دے کر مستقبل کی ضرورت کا سامان فراہم کیا ہے۔ یہ بڑی جانفشانی کا کام تھا، ہندوستان کے مختلف گوشوں میں بیٹھے حکیم طیب صاحب کے شناساؤں تک پہنچنا اور ان سے مضامین حاصل کرنا کس قدر دشوار ہے، اس کا صحیح اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جنہیں اس پُر صعوبت مرحلہ سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہو۔ حکیم فخر عالم نے اس مشکل معرکہ کو بڑی خوش اسلوبی سے، وہ بھی نہایت قلیل عرصہ میں سر کرکے جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ لائقِ ستائش ہے۔

اس مجموعہ میں بڑی خوبصورتی سے حکیم طیب صاحب کی شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے مستقبل کی طبی نسل کو حکیم طیب صاحب سے مستفید ہونے کا موقع ملے گا اور ان کا یہ 'تذکرہ' اردو زبان کے سوانحی ادب میں ایک بیش قدر اضافہ ہوگا۔

تأثرات

پروفیسر حکیم سید شاکر جمیل

ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب معاصر طبّی تاریخ میں کئی لحاظ سے ممتاز تھے، ان کے امتیاز کا سب سے قابلِ ذکر پہلو یہ تھا کہ وہ بیک وقت عظیم طبیب اور عظیم انسان تھے۔ ادھر طبّی پیشہ جس طرح اخلاقی اعتبار سے آمادۂ زوال ہوا ہے اور اس کی پیشہ وارانہ شرافت مجروح ہوئی ہے، اس سے اس کے وقار پر سوال اٹھتا نظر آرہا ہے، ایسے حالات میں طیب صاحب کی شخصیت نہ صرف فنّی اعتبار سے عظمت کی حامل تھی، بلکہ اعلیٰ انسانی اقدار اور پیشہ ورانہ اخلاقیات سے بھی متصف تھی۔ اُن کے اِن گوناگوں امتیازات کا تقاضا تھا کہ ان کے سوانحی تذکرے کو ضبط تحریر میں لاکر محفوظ کیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کو ان کی داستانِ حیات سے مستفید ہونے کا موقع فراہم ہو۔ یہ کام بڑی ذمہ داری کا تھا، مجھے خوشی ہے کہ کونسل کے ایک لائق آفیسر، حکیم فخر عالم نے نہایت خوش اسلوبی سے اس کے ہر مقتضا کو پورا کیا ہے۔ حکیم فخر عالم نے اس 'مجموعہ' کی فہرست میں ہندوستان کے تقریباً تمام اہم ناموں کو شامل کرلیا ہے، اس سے موجودہ طبّی دنیا پر ان کی وسیع نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور 'مجموعہ' کی خوبصورت پیش کش سے ایڈیٹنگ جیسے مشکل کام سے ان کی گہری واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔ جب انہوں نے یہ 'مجموعہ' مجھے دکھایا تو میں حیرت میں پڑ گیا کہ ابھی طیب صاحب کی وفات کو محض چھ سات ماہ ہوئے ہیں، اس قلیل عرصہ میں اتنا جامع کام،

یہ بغیر فنی صلاحیت اور محنت شاقہ کے ممکن نہیں ہے، صُوری اور معنوی خوبیوں سے مزین یہ دیدہ زیب 'مجموعہ' ہر لحاظ سے طیب صاحب کے شایانِ شان ہے۔

اس کتاب کے عنوان نے 'صاحب تذکرہ' کی شخصیت کے ہر پہلو کو اپنے اندر سمولیا ہے، 'رازیٔ ہند' کا ٹائٹل طیب صاحب کی شخصیت کی نہایت جامع تعبیر معلوم ہوتا ہے، یہ ان کی ذات پر پوری طرح منطبق ہے اور ان کے اوصاف وکمالات کی کافی حد تک ترجمانی کررہا ہے۔

رازی اور حکیم طیب صاحب کے احوال وکوائف میں صرف یہی مماثلت نہیں ہے کہ دونوں عملی میدان کے سرخیل تھے، بلکہ ان میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ان دونوں کی عظمت کا صحیح درجہ متعین کرنے میں طبی دنیا نے انصاف سے کام نہیں لیا ہے، رازی کے ساتھ یہ زیادتی اب تک ہورہی ہے، مگر امید ہے کہ حکیم فخر عالم کے اس مرتبہ 'مجموعہ' سے طیب صاحب کو طبی تاریخ میں وہ جائز مقام ملے گا، جس کے وہ مستحق تھے، 'حق بہ حق دار رسید' تاریخ کا یہ بھی ایک اہم کام ہے۔توقع ہے کہ یہ کتاب اس مقصد کو پورا کرے گی۔

حکیم طیب صاحب کے اس 'تذکرہ' پر جب حکیم فخر عالم نے مجھ سے تأثر لکھنے کے لئے کہا تو میں نے ان سے شکایت کی کہ آخر اس کی اطلاع مجھے پہلے کیوں نہیں دی، میں بھی ان کے بارے میں اپنے جذبات قلم بند کرنے کی سعادت سے سرفراز ہوتا، اس لیے کہ میرے خیال میں اس عہد میں حکیم طیب صاحب کی شخصیت ایسی تھی، جس سے تعلق کی کوئی بھی نسبت افتخار کی بات ہے، مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ بالواسطہ ہی سہی، ان سے مجھے بھی ربط وتعلق کا شرف حاصل ہے۔

معالجات کے ایک استاذ کی حیثیت سے گزشتہ تیس برسوں سے میں اس شعبہ سے وابستہ ہوں، اس وقت ہندوستان میں اس مضمون کے جتنے ماہرین ہیں، تقریباً سبھی سے واقف ہوں، 'بیڈ سائڈ' کی ٹیچنگ میں طیب صاحب کو جو درک حاصل تھا، اس مضمون میں اس طرح کا عبور مجھے کسی اور معاصر استاذ میں نظر نہیں آیا، میں نے اپنے اکیڈمک میٹریل کے لیے ایک فائل بنا رکھی ہے، اس میں محفوظ کاغذات میں حکیم طیب صاحب کا ترتیب دیا ہوا ایک 'اِکزام پیپر' بھی موجود ہے، یہ نہ صرف معالجات کے مضمون پر ان کی مہارت کا

ثبوت ہے، بلکہ یہ ان کے وژن اور بعید نظری کا مظہر بھی ہے، بظاہر لگتا ہے کہ پیپر جیسی عام چیز جو چند سوالوں پر مشتمل ہوتی ہے، بھلا اُس سے کسی ممتحن یا اُستاذِ فن کی علمی صلاحیتوں کے اظہار کا کیا تعلق ہوسکتا ہے؟، لیکن فی الواقع ایک ایسے اِکزام پیپر کی ترتیب جس کے کچھ سوالوں سے ایک طالبِ علم کی مجموعی صلاحیتوں کا اندازہ لگانا ہوتا ہے، اس کی اچھی ترتیب وہی استاذ کرسکتا ہے جو مضمون میں درک ومہارت کے ساتھ، صلاحیتوں کے پرکھنے کے گُر بھی جانتا ہو، کسی استاذ میں یہ وصف بڑے ریاض اور مشق ومزاولت کے بعد آتا ہے۔ حکیم طیب صاحب کے پیپر کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یہ کمالات بدرجۂ اتم تھے۔

میں نے ڈیمانسٹریٹر سے لے کر پروفیسر شپ اور سی آر یو ایم کے ڈائرکٹر جنرل کے عہدہ تک کے سفر میں اب تک پانچ سلیکشن کمیٹیوں کا سامنا کیا ہے، ان میں سے ابتدائی تین کمیٹیوں کے اکسپرٹ حکیم طیب صاحب تھے، میں اس بات کو اپنے لیے اعزاز سمجھتا ہوں کہ میں ان کی نگہِ انتخاب کی پسند ہوں، جو ہر معاملہ میں بے حد دیانت دار تھے۔

حکیم طیب صاحب کی شخصیت اس بات کی سزاوار تھی کہ اس کے عظیم پہلوؤں کی تاریخ مرتب کر کے، اس سے یونانی طب کی آئندہ نسلوں کو متعارف کروایا جائے، یہ معاصر طبی تاریخ کی ایک اہم ضرورت تھی، جسے اس 'مجموعہ' کے ذریعہ پوری کرنے کی کوشش کی گئی ہے، حکیم طیب صاحب ہمارے زمانے کا نمائندہ چہرہ تھے، ان کے ذکر کے بغیر اس عہد کی تاریخ ادھوری تھی، اس لیے یہ 'مجموعہ' محض ایک سوانحی تذکرہ نہیں، بلکہ ایک طرح سے یہ یونانی طب کی عصری تاریخ کا تکملہ ہے، اس کام کے لیے حکیم فخر عالم طبی دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں، میں انہیں اس کارنامہ پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

چند لمحے تیری قربت کے

(اپنے شوہر پروفیسر محمد طیب کی یاد میں)

بدر طیب

سابق پرنسپل گرلس ہائی اسکول

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۱۴ ارمارچ کے اخبار پر نظر پڑی تو دیکھا کہ اس میں ''رازیٔ ہند'' کے اجراء کی تصویر چھپی تھی۔ تعجب ہوا اتنی قلیل مدت میں ایک کتاب کیسے چھپ گئی۔ میں نے بیٹی شاذیہ کو فون کیا کہ اس کتاب کو جلد سے جلد حاصل کر کے مجھے بھجوا دیں۔ آٹھ دس دن بعد یہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی اور میں حیران ہو کر جلدی جلدی اسے پڑھ رہی تھی۔ پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس کتاب میں ملک کے بڑے نامور اور مشہور و معروف اطباء کے مقالات ہیں، اور مرحوم کی شخصیت کے ہر پہلو پر بڑی گہری نظر ڈالی گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر خراجِ عقیدت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا اور یہ کمال کر دکھایا ہے حکیم فخر عالم نے۔

کتاب پڑھنے کے بعد مجھے حکیم فخر عالم سے ملنے کا اشتیاق ہوا اور میں نے خبر بھجوائی کہ میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔ آٹھ دس دن کے بعد وہ مجھ سے ملنے آئے۔ دورانِ گفتگو میں نے اندازہ لگایا کہ اُن میں اور طیب صاحب میں کچھ باتیں ضرور یکساں ہیں، مثلاً چمکتی ہوئی ذہین آنکھیں، کام کرنے اور جلدی کرنے کی عادت۔ کاش! حکیم فخر عالم وہ جگہ پُر کرسکیں جو اُن کے گزر جانے سے طبی دنیا میں پیدا ہو گئی ہے (آمین!)۔

دورانِ گفتگو میں نے کہا کہ طیب صاحب کے ہر سوانحی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، مگر ایک

پہلو چھوٹ گیا ہے، جو ان کی ازدواجی اور گھریلو زندگی کا ہے۔ حکیم فخر عالم نے کہا کہ اس پہلو پر میں ہی کچھ لکھوں ۔ میں نے وعدہ تو کرلیا، پھر خیال آیا کہ جہاں اتنے بڑے لوگوں کے مقالات ہوں وہاں میری تحریر کی کیا حقیقت!۔ میں جو لکھ رہی ہوں یہ کوئی مقالہ نہیں، بلکہ وہ یادیں اور لمحات ہیں جو میں نے ان کے ساتھ گزارے ہیں، اچھے بھی اور برے بھی۔

میری شادی حکیم طیب صاحب سے ۲۸ر فروری ۱۹۶۶ء کو ہوئی۔ یہ شادی ویمنس کالج کی سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کی ایک لکچرر مسز ورما اور ان کی بیٹی ڈاکٹر پروین مراد (معروف اداکار نصیر الدین شاہ کی پہلی بیوی) نے کرائی تھی۔ مجھے ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے جگر میں خرابی آگئی تھی۔ مسز ورما نے والد صاحب سے کہا کہ اس کا یونانی علاج کرائیں، میری جانکاری میں ایک حکیم ہیں، میں بدر کو لے جا کر انہیں دکھا دوں گی۔ والد صاحب راضی ہو گئے۔ طیب صاحب نے معائنہ کرنے کے بعد ایک ہفتہ کی دوا دی، اس کے بعد پھر دکھانے کو کہا۔ دوسری بار میں ڈاکٹر پروین کے ساتھ ان کے مطب گئی۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد مسز ورما نے والد صاحب سے کہا کہ اگر آپ کی رائے ہو تو میں بدر کی شادی حکیم صاحب سے کرانے کی بات کروں۔ ادھر رشتے کی بات شروع ہوئی کہ حکیم صاحب کے مخالفین نے والد صاحب کے کان بھرنے شروع کر دیے کہ حکیم صاحب دل کے مریض ہیں، تند مزاج ہیں، ان کے کیریکٹر کو بھی لے کر باتیں کی گئیں، انہیں سن کر والد صاحب نے رشتے سے انکار کر دیا۔ دو تین مہینے کے بعد طیب صاحب نے میرے بڑے بھانجہ ڈاکٹر مشہود کو بلایا اور کہا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ میرے بارے میں آپ لوگوں سے کچھ غلط باتیں کہی گئی ہیں، میری صحت کے بارے میں۔ یہ سب رپورٹس ہیں آپ اس کو دیکھ لیں، میں دل کا مریض نہیں ہوں۔ مشہود نے والد صاحب کو یہ سب بتایا، کچھ دن بعد رشتہ طے ہو گیا۔ شادی کے وقت طیب صاحب طبیہ کالج میں لکچرر تھے اور میں گرلس ہائی اسکول میں فرسٹ گریڈ ٹیچر تھی۔ وہ تاربنگلہ کے لکچرر کوارٹر میں رہا کرتے تھے اور میں ویمنس کالج کے ٹیچرس کوارٹر میں رہتی تھی۔ بارہ بنکی سے ان کے والد نے آکر تاریخ مقرر کی اور شادی بخیر وخوبی انجام پا گئی۔ سسرال والوں نے پُر تپاک خیر مقدم کیا اور

بہت محبت سے پیش آئے اور ساتھ میں چند دن رہ کر چلے گئے، اس لیے کہ میری نند کے امتحان ہونے والے تھے۔

شادی کے دن صبح ہی سے میرے سر اور بدن میں سخت درد تھا۔ مہندی لگنے سے کچھ بخار بھی آ گیا تھا، اسی حالت میں دلہن بنا کر مجھے رخصت کر دیا گیا۔ دوسرے دن صبح کو طبیعت اور خراب ہوگئی، اب متلیاں بھی شروع ہوگئیں۔ گھر سے لینے کے لیے میرے بھائی وغیرہ آ گئے۔ جب ابو (سُسر صاحب) کو معلوم ہوا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو انہوں نے امی (ساس) سے کہا کہ ان کو آج نہ بلاؤ، کل دوپہر بعد بلا لینا، ان کو آرام کی ضرورت ہے۔ شام کو طیب صاحب چار بجے کے قریب میرے گھر آئے، سیدھے میرے کمرے میں چلے آئے۔ ہنس کر بولے، کیسی ہو!، میں نے کہا ٹھیک ہوں۔ اچھا سنو! کل تمہیں لینے لوگ آئیں تو چلی آنا، بہانا نہ کرنا، یہ کہہ کر چلے گئے۔ دوسرے دن میں سسرال آ گئی۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ طیب صاحب مغرب کے بعد کمرہ میں آئے اور لات سے دروازہ کھولا۔ دیکھا کہ ان کے ایک ہاتھ میں دوا دوسرے میں پانی کا گلاس تھا۔ دوا کھلائی اور گلاس لے کر چلے گئے۔ رات آٹھ بجے پھر تشریف لائے، ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ کہا کھانا کھالو اور میز پر کھانا رکھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد جب آئے تو دیکھا کہ کھانا ویسے رکھا ہوا ہے، بولے تم نے کھانا نہیں کھایا! میں نے کہا، بھوک نہیں ہے، ٹھیک ہے، یہ کہہ کر کھانے کی ٹرے لے کر چلے گئے۔

شادی کے لیے میں نے ایک مہینے کی چھٹی لے رکھی تھی۔ جب طیب صاحب کے گھر والے چلے گئے تو وہ کالج جانے لگے۔ جاتے وقت خدا حافظ کہہ کر جاتے۔ میں نوکر کے ساتھ گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔ ٹھیک دو بجے گھنٹی بجتی، میں دروازہ کھولتی، فوراً کہتے کھانا کھالیا، میں کہتی آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ چلو میز پر میں آرہا ہوں، یہ کہہ کر وہ ہاتھ منہ دھل کر میز پر آجاتے۔ وہ خاموشی کے ساتھ کھانا کھا کر اٹھ جاتے اور میں بیٹھی کھاتی رہتی، وہ کھانے سے جلد فارغ ہو جاتے۔ ان کا معمول تھا کہ پہلے میری پلیٹ میں کھانا نکالتے، پھر اپنی پلیٹ میں۔

ایک دن میں اُن سے پوچھ بیٹھی کیا آپ کو کھانا پسند نہیں آتا، اس لیے کہ آپ کچھ کہتے نہیں ہیں۔ بولے کہ اگر میں خاموش رہتا ہوں تو سمجھو مجھ کو کھانا پسند آیا ہے، اگر پسند نہیں آئے گا تو میں خود بتا دوں گا۔ ان کی مرغوب غذا گوشت تھا، بکرا، مرغا، تیتر، بٹیر اور شکار کا گوشت۔ وہ تیتر اور بٹیر اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے۔ کھاتے وقت تعریف کرتے اور کروانا بھی چاہتے۔ بڑے کا گوشت نہیں کھاتے تھے، اس کا کباب ضرور کھالیتے۔ کھانے میں دال، چاول، دو قسم کا گوشت اور میٹھا ضرور ہوتا۔ کسی دن میٹھا نہ ہوتا تو شکر ہی پھانک لیتے۔ پھلوں کے شوقین نہیں تھے۔ کبھی کبھی کیلا کھالیتے تھے۔ البتہ خربوزہ اور آم بہت پسند کرتے۔ پائے اور نہاری بھی انہیں پسند تھی۔ کچھ دوسرے پکوان جیسے پوری سبزی، سموسے، کچوری، نمک پارے اور دہی بڑے بھی پسند کرتے تھے۔ اکثر انہیں وہ خود بناتے۔ رمضان میں ان چیزوں کا استعمال زیادہ ہوتا۔ رمضان میں افطاری اور کھانا ساتھ لیتے۔ پانی کے دو گھونٹ پینے کے بعد نماز اور فوراً کھانا شروع کر دیتے۔ مجھے افطار اور نماز میں دیر لگ جاتی تو میز پر ہی چیختے، آو نا جلدی! کیا قضائے عمری ادا کر رہی ہو۔ میرے آتے آتے ان کا کھانا ختم ہو چکا ہوتا اور اکثر میں میز پر اکیلی رہ جاتی۔ کھانے کے بعد وہ اپنی پلیٹ سنک میں ڈال دیتے یا دھوڈالتے۔

ایک دن کہنے لگے، سنو! تم سے شادی کر کے مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ میں نے کہا، آپ نے تو مجھے دیکھا تھا، جب پسند نہیں تھی تو شادی کیوں کی۔ بولے، بات یہ نہیں۔ تم مجھے پسند ہو، خوبصورت ہو، کھانے اچھا بناتی ہو، امور خانہ داری میں ماہر ہو۔ دراصل میں ایک ایسی بیل ہوں، جس پر دوسری بیل چڑھ جائے تو وہ مرجھا جاتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم چلی جاؤ۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، آپ فکر نہ کریں، ہم اس کا حل ڈھونڈ لیتے ہیں۔

کالج کی سیاست سے بہت پریشان رہتے تھے۔ میں سمجھانے کی کوشش کرتی تو کہتے تمہیں کچھ نہیں معلوم۔ شادی کے چند ماہ بعد ہی وہ ریڈر، پرنسپل پھر پروفیسر ہو گئے۔ ساتھ ہی وہ گھریلو زندگی سے دور ہوتے چلے گئے۔ ادھر میں وائس پرنسپل، پھر پرنسپل ہو گئی۔ ۱۹۸۴ء میں بیسٹ اسکول ایوارڈ ملنے پر وہ بہت خوش تھے۔ میں نے سکونِ دل کے لیے خود کو تعلیم نسواں میں

گم کرلیا، وہ تو پہلے ہی سے گم تھے۔

۱۹۸۴ء میں میں نے حج کرلیا۔ دراصل میرے گھر کے کچھ لوگ حج کو جارہے تھے، یہ میرے لیے بہتر موقع تھا۔ جب میں طیب صاحب سے اجازت لینے گئی تو ہنس کر بولے، چوہے سب پورے ہوگئے، میں نے بھی مذاق میں کہا کچھ آپ کے لیے چھوڑے جارہی ہوں۔

وہ میرے کہیں آنے جانے سے خوش نہیں ہوتے تھے، نہ ہی میرے رشتہ داروں اور ملنے والوں سے۔ انہیں خود کلامی کی عادت تھی، اکثر تنہائی میں لیٹے باتیں کرتے رہتے، یہ باتیں زیادہ تر ان کے مسائل سے متعلق ہوتیں۔

بیٹی (شاذیہ) کو بہت چاہتے تھے۔ جب تک گھر رہتے، اس کا کام خود کرتے، پوٹی تک دھلا دیتے۔ وہ ان سے کام کروانے کی اتنی عادی تھی کہ میں کوئی کام کرتی تو کہتی، پپا سے کروانا ہے، آپ سے نہیں۔ ایک دن نپل خرید لائے اور بچی کے منہ میں لگادیا، وہ چوسنے لگی، بولے مجھے یہ نپل چوستی اچھی لگتی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ نپل چوسنے کی عادی ہوگئی۔ اپنی باہوں پر اس کا سر رکھ لیتے، وہ سوجاتی تو اس کو مسہری پر لٹا کر چلے جاتے۔ وہ بیٹی سے بے حد قریب تھے، ایک بار میں چھٹیوں میں بارہ بنکی چلی گئی، جب واپس آئی تو دیکھا کہ ایک چھڑی پر اس کی فراک ٹنگی ہوئی ہے، جسے وہ دیکھا کرتے ہیں۔ جب ہم ڈیوٹی پر ہوتے تو آیا بچی کی دیکھ بھال کرتی۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ امتحان چل رہے تھے، میری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی، ایک دن بچی کو بخار آگیا، وہ اسے دوا دے چکے تھے، جب میں کالج جانے کے لیے تیار ہوئی اور جانے کے لیے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ میں ڈیوٹی کرنے نہیں جاسکی، دوسرے دن بچی کا بخار اتر گیا، میں کالج چلی گئی، جب وہ آئے تو آیا سے میرے بارے میں پوچھا، اس نے کہا وہ تو چلی گئیں۔ فوراً گاڑی نکالی اور ویمنس کالج آگئے۔ چپراسی نے بتایا کہ صاحب آئے ہیں، آپ کو یاد کررہے ہیں۔ میں آئی تو کہا فوراً گاڑی میں بیٹھو، میں نے کہا جانے کی اطلاع تو کردوں، بولے، ہاں ضرور!۔ دوسرے دن میں نے عبداللہ ہال کی پرووسٹ سے حالات بتائے اور ان سے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت مانگی، انہوں نے بخوشی اجازت دے دی۔

طیب صاحب کی مرضی کے بغیر میں ہوسٹل میں رہنے آ گئی تھی۔ میں نے عبداللہ نرسری میں بچی کا داخلہ کروا دیا تھا۔ ایک دن نوکر آیا اور کہنے لگا، بی بی کو صاحب نے بلایا ہے، وہ بچی کو ساتھ لے گیا اور دو تین گھنٹے بعد واپس لے آیا۔

ایک دن ایک پرچہ آیا، لکھا تھا میں گھر جا رہا ہوں وہاں شاذیہ کو سب یاد کر رہے ہیں، اسے ضروری سامان کے ساتھ تیار کر کے بھیج دو۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ تین چار دن بعد بارہ بنکی سے واپس آ گئے، مگر شاذیہ کو لے کر نہیں آئے۔ میں نے فون کیا کہ آپ شاذیہ کو لے کر نہیں آئے، کہنے لگے، وہ وہاں بہت خوش ہے، اب وہیں رہے گی۔ مغرب بعد میں تار بنگلہ گئی، وہ گھر پر موجود تھے، دروازہ کھلا میں اندر آ گئی، وہ اپنے کمرے میں چلے گئے، میں بھی ان کے پیچھے آ گئی اور وہی سوال کیا کہ شاذیہ کو کیوں نہیں لائے؟ بولے گھر والوں کی مرضی نہیں ہے کہ وہ تمہارے پاس رہے۔ میں نے کہا بچی وہیں رہے گی جہاں اس کی ماں ہوگی، اگر آپ نہیں لائے تو میں خود جا کر لے آؤں گی، یہ کہہ کر رونے لگی۔ روتا دیکھ کر ایک دم پلنگ سے اٹھے، میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر بٹھایا اور کہا میں اتنا ظالم ہوں کہ ایک ماں سے اس کا بچہ چھین لوں۔ یہ سن کر میں خوش ہو گئی، صبح انہوں نے مجھے ہوسٹل چھوڑ دیا، دو دن بعد بچی آ گئی، بعد میں پتہ چلا کہ وہاں بچی نے ہم دونوں کو بہت یاد کیا۔

جب بھی ان کا دل چاہتا، فون کر دیتے کہ مغرب کے بعد گیٹ پر آ جانا اور ہم دونوں کو ہوسٹل سے گھر لے جاتے۔ ایک دفعہ میں نے ابو سے کہا سوچتی ہوں نوکری چھوڑ دوں، ابو نے کہا بالکل نہیں، اسے کہنے دو، ہاں! ممکن ہو تو کچھ دن کی رخصت لے لو۔ ایک دن میں نے طیب صاحب سے کہا میں نوکری چھوڑ رہی ہوں، پھر مجھے تالے میں بند کر کے رکھیے گا، سن کر خاموش رہے، کچھ نہیں بولے۔

وہ نہ سگریٹ پیتے تھے، نہ تمباکو کھاتے تھے، البتہ کھانے کے بعد ایک پان ضرور کھاتے۔ پان وہ خود بنا کر کھاتے تھے۔ اپنا ہر کام وہ خود کرتے تھے۔ کپڑا پھٹ جاتا تو خود سلتے، بٹن ٹوٹ جاتا تو خود لگا لیتے۔ اپنے جوتے پر پالش کرتے تو بچی کے جوتوں پر بھی کر دیتے۔ اگر کبھی فون نہ

ہوسکتا تو خط لکھتے تھے، خط بغیر القاب کے لکھتے، پتہ نہیں ہوتا کس کے نام ہے۔ایک خط میں لکھا جانِ طیب ہم نے کبھی نرم گرم دن بھی گزارے ہیں۔دوسرے خط میں لکھا جانِ طیب !، میری تین چیزیں تمہارے پاس ہیں، ان کی حفاظت کرنا۔مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون سے نرم گرم دن اور وہ کون سی چیزیں، جن کی وہ مجھ سے حفاظت چاہتے تھے، کبھی بتایا نہیں۔

جب کبھی میں گھر جانا چاہتی اور اُن سے اجازت مانگتی تو غصہ ہوجاتے اور کہتے یہ کیا ہے؟۔میں کہتی کہ یہ آپ کا گھر ہے، میرا نہیں، یہاں آپ کا حکم چلتا ہے اور آپ کی مرضی کے بغیر کوئی سانس بھی نہیں لے سکتا۔کہتے اور میں کس کا ہوں !۔میں غصہ میں کہتی، اپنے پیشے کے ہیں، مریضوں کے ہیں، دوستوں کے ہیں، والدین کے ہیں، میرے نہیں۔یہ سن کر کروٹ بدل لیتے، اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اب بات نہیں کرنی ہے۔

پرنسپل ہونے کے بعد میں پرنسپل کی رہائش گاہ میں رہنے لگی۔انہوں نے امرنشاں میں گھر بنوالیا تھا، وہ وہیں رہتے تھے، جب ان کا جی چاہتا آجایا کرتے تھے۔کھانے کے لیے میں روٹی بھجوادیا کرتی تھی، سالن وہ خود بنالیتے تھے۔شاذیہ کی بچیوں (اپنی نواسیوں) کو بہت چاہتے تھے۔ان کی تعلیم کا بہت خیال رکھتے تھے۔ان کے لیے کھانے پکا کر بھجواتے اور ان کی پسند کی چیزیں بھجواتے۔جس دن انتقال ہوا، اس رات مٹھائی بھجوائی تھی، بڑی نواسی نے ہائی اسکول پاس کیا تھا۔

وہ اپنے گھر میں رہتے تھے، میں ریٹائر ہونے کے بعد قلعہ روڈ پر اپنی بڑی بہن کے پاس آگئی، آنا جانا بہت کم ہوگیا تھا کبھی بیماری یا کسی خاص موقع پر آجاتے۔

جب ہم تار بنگلہ میں رہتے تھے۔جاڑوں کا زمانہ تھا، میں ان کے کمرے میں تھی، کھڑکیاں کافی دن سے بند تھیں، میں نے کھڑکیاں کھولیں تا کہ دھوپ اندر آجائے۔باہر لان میں ایک گلاب کی بیل لگی ہوئی تھی۔کھڑکی کھولنے پر ایک شاخ اندر آگئی، اس پر ایک دھاگہ لٹک رہا تھا، اس میں ایک تعویذ بندھا ہوا تھا۔میں نے اسے نکال لیا، جب وہ آئے تو یہ تعویذ انہیں دکھایا، کہنے لگے یہاں تو کوئی ایسا نہیں ہے جو اس کے بارے میں بتا سکے، نظام الدین اولیاء

کی درگاہ میں ایسے لوگ ہیں جو اس کے بارے میں بتا سکتے ہیں۔ جب وہ دہلی گئے تو وہاں تعویذ دکھایا۔ یہ تعویذ اس لیے تھا کہ ہمارے تعلقات خراب ہو جائیں اور ان کی جان ختم ہو جائے۔

۷ر جون کی رات ڈھائی بجے میں نے خواب دیکھا کہ تار بنگلہ والا گھر ہے، گھنٹی بجتی ہے، میں دروازہ کھولتی ہوں، وہ ہرے پتوں میں بندھی ہوئی کوئی چیز میرے ہاتھ میں دیتے ہیں، کھول کر دیکھتی ہوں تو اس میں مہکتے ہوئے دو سفید گجرے ہیں۔ میں کہتی ہوں آج آپ گجرے کیسے لے آئے، آپ تو ایسی چیزیں لاتے نہیں تھے، بولے بک رہے تھے، میں نے تمہارے لیے خرید لیے۔ دو تین دن بعد پھر خواب دیکھتی ہوں کہ تنہا اداس بیٹھی ہوں کہ وہ آ گئے، کہنے لگے تم یہاں اکیلی بیٹھی ہو، آؤ میرے ساتھ چلو گھما لاؤں۔ تیسری دفعہ خواب میں صرف آواز سنی، وہ دکھائی نہیں دیے، کہہ رہے تھے، میرے لیے دو اچھی سی روٹیاں پکوا کر بھیج دو۔ ۵ر جون کی شب میں جب سے وہ وفات پائے ہیں، تب سے ان کی یاد میں ان کی پسند کے کھانے غریبوں کو بھجواتی رہتی ہوں۔ ان کے بعد ان کے کاموں کو اس طرح یاد کیا جا رہا ہے، یہ دیکھ کر فخر محسوس ہوتا ہے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب- حیات وخدمات

پروفیسر حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی
سابق صدر، شعبۂ کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

پروفیسر حکیم محمد طیب ایک ماہر طبیب ہیں، ان کی خودنوشت سوانح سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا وطن بارہ بنکی، لکھنؤ سے تقریباً اٹھارہ میل کے فاصلہ پر جانب مشرق واقع ہے۔ ان کا نانیہال بارہ بنکی سے سات میل دور قصبہ گدیہ ہے، آپ کی والدہ ماجدہ تعلقہ دار ریاست گدیہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کے دادا حضرت عبدالحق مرحوم کے خاندان سے تھے، جو ردولی، ضلع بارہ بنکی کے ایک نامور بزرگ تھے، ان کا مزار ردولی میں واقع ہے، دادی کا تعلق لکھنؤ کے قریب قصبہ امیٹھی سے تھا اور ان کے اجداد میں کوئی صاحب شہنشاہ اورنگ زیب کے شہزادگان کے اتالیق تھے۔ آپ کے دادا حافظ محمد احمد صاحب بارہ بنکی میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ سے ریٹائر ہو کر امیٹھی میں آباد ہوئے، آپ کے والد حافظ محمد طاہر صاحب ہیڈ اسسٹنٹ کمشنر کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی ابتدائی تعلیم گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی میں ہوئی، ۱۹۴۷ء میں ہائی اسکول کا امتحان فارسی کے اضافی مضمون کے ساتھ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور اچھے نمبر پانے پر رجواڑہ جہانگیر آباد اسٹیٹ سے انعام بھی پایا، مزید تعلیم کے لیے لکھنؤ آئے اور گورنمنٹ جوبلی انٹر کالج میں داخلہ لیا، انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کر کے اسٹیٹ ایڈیڈ طبی کالج

لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ اس وقت کالج کے پرنسپل حکیم محمد امین صاحب تھے۔ جب آپ نے یہاں سے دوسرے سال کا امتحان پاس کیا تو کالج کے حالات کی خرابی کے باعث کالج بند کر دیا گیا۔ اس وقت آپ کے پھوپھا صالح الدین صاحب انکم ٹیکس آفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ میں ملازم تھے، ان کے اصرار پر آپ علی گڑھ مزید طبّی تعلیم کے حصول کے لیے آئے اور طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تیسرے سالِ نصاب میں آپ نے داخلہ لیا، اس وقت شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی لکھنوی طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پرنسپل تھے۔ یہاں آپ نے بہت محنت اور لگن کے ساتھ تعلیم حاصل کی، معالجات و تشخیص میں امتیازی نمبر حاصل کرنے کے باعث جولائی ۱۹۵۳ء سے اگست ۱۹۵۴ء تک کے لیے ہاؤس جاب کے لیے منتخب ہوئے۔

۱۹۵۴ء میں شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب پرنسپل تھے اور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے، 'تشخیصِ عملی' کے لکچرر کی پوسٹ مشتہر ہوئی، جس پر حکیم محمد طیب صاحب کا تقرر ہوا۔ ساتھ ہی انہیں میڈیکل وارڈ کی نگرانی بھی سونپی گئی اور شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کے مطب میں بھی ان کی ڈیوٹی لگی، جسے انہوں نے خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب لبنان سے کتاب العشر مقالات فی العین، مصنفہ حنین بن اسحاق مع ترجمۂ انگریزی ڈاکٹر مائر ہوف لائے، کتاب کا اصل متن مع ترجمہ مائر ہوف قاہرہ سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ ذاکر صاحب نے حکیم عبداللطیف صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ اس کا ترجمہ اردو میں کیا جائے، اس لیے کہ یہ منظم کتاب تھی، جو امراضِ عین پر لکھی گئی تھی۔ حکیم صاحب نے یہ کام طیب صاحب کے سپرد کیا، جسے انہوں نے اردو میں ترجمہ کر کے مولانا فضل اللہ صاحب سابق صدر شعبۂ عربی، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد کو دکھایا تو اطمینان ہوا کہ وہ ترجمہ عربی متن سے بھی مطابقت رکھتا تھا۔ یہ کتاب ڈاکٹر ذاکر حسین کے نام سے معنون ہے، اس وقت ذاکر صاحب گورنر بہار کے عہدہ پر فائز تھے، ۱۹۵۷ء میں یہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے شائع ہوئی ہے، اس کے بعد آپ نے ایک مقالہ بعنوان 'علم العین

اور اطبائے قدیم' لکھا، جسے آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے اجلاس منعقدہ برہان پور میں ۱۹۵۷ء میں پیش کیا، یہ مقالہ بھی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوا۔ مذکورہ کتب پر آپ کو آیورویدک اینڈ یونانی اکیڈمی اتر پردیش نے فرسٹ پرائز سے نوازا اور لکھنؤ میں منعقدہ ایک خصوصی جلسہ میں گورنر اتر پردیش نے چھ سو روپیہ کی رقم اور دو میرٹ سرٹیفکیٹ بھی عنایت فرمائے۔

حفظِ صحت پر کوئی درسی کتاب طبیہ کالج کے معیار کی موجود نہ تھی، جس کا احساس آپ نے شدت کے ساتھ کیا اور علامہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب و شفاء الملک حکیم عبد اللطیف صاحب کی فرمائش پر اس موضوع پر ایک کتاب لکھی۔ علامہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب نے اس کا نام 'قانون صحت' تجویز فرمایا، یہ کتاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے ۱۹۶۱ء میں شائع ہوئی۔

۱۹۶۶ء میں جب طیب صاحب کا تقرر ریڈر معالجات کی حیثیت سے ہوا تو انہوں نے معالجات کے نہایت اہم موضوع پر ایک کتاب تالیف کی، 'اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات' کے عنوان سے معنون یہ کتاب اطباء کے معالجاتی تجربات پر مشتمل ہے، اسے انہوں نے اہم طبّی مآخذ سے منتخب کیا ہے۔ یہ کتاب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پبلیکیشن ڈیپارٹمنٹ سے ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔

وہ جس زمانہ میں اسپتال سے وابستہ تھے، انہوں نے اسپتال کی اپنی ڈسپنسری قائم کی، اس سے پہلے مریضوں کو تجویز کردہ نسخے طبیہ کالج دواخانہ جاتے تھے اور ان کی قیمت کی ادائیگی اسپتال کے بجٹ سے کی جاتی تھی، یہ قیمت بڑھا چڑھا کر وصول کی جاتی تھی، چنانچہ آپ نے اسپتال سے ملحق جانب مغرب زمین کے پلاٹ پر اسپتال کی توسیع کا منصوبہ بنایا اور ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ صاحب اول پرنسپل طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی کے فرزند محمود بٹ صاحب سے لکھنؤ میں ملاقات کر کے امداد کی درخواست کی، وہ آمادہ ہو گئے اور روپیہ کی گرانٹ گورنمنٹ سے دلائی، جس پر اسپتال کا نیو بلاک تعمیر ہوا۔ مگر یونیورسٹی اپنی کم مائیگی کی بنا پر اس نئے بلاک کی عمارت کو اسپتال کی شکل نہ دے سکی، کئی برس یہ بلاک خالی پڑا رہا، بالآخر

آپ نے سید حامد صاحب وائس چانسلر کے عہد میں اس میں منسٹری آف ہیلتھ اینڈ فیملی ویلفیر کے زیرِ انتظام ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن قائم کرادیا، جو آج تک اسی عمارت میں چل رہا ہے۔

۷۲-۱۹۷۱ء میں اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ دو شعبوں میں تقسیم ہوا۔ ا۔شعبۂ یونانی طب اینڈ سرجری، ۲۔ شعبۂ علم الادویہ، اس کے پہلے چیرمین پروفیسر عبدالحسیب لکھنوی تھے ان کے بعد تیسرے چیرمین پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب مقرر ہوئے۔

۱۹۷۳ء میں پرنسپل کی پوسٹ پر، جو حکیم عبدالحسیب صاحب کے استعفےٰ کے بعد خالی ہوئی تو شیخ الجامعہ پروفیسر علی محمد خسرو صاحب نے طیب صاحب کو اس عہدہ کی پیش کش کی، جسے کچھ توقف کے بعد آپ نے ۱۹۷۹ء میں قبول کیا، ساتھ ہی پرنسپل کے فرائض بھی اعزازی طور پر آپ انجام دیتے رہے۔

حکیم محمد طیب صاحب کو یہ احساس تھا کہ طبیہ کالج کے اساتذہ کے لیے عربی اور سائنس سے واقفیت ضروری ہے، چنانچہ انہوں نے بطور پرائیویٹ امیدوار انٹرمیڈیٹ کا امتحان فزکس، کیمسٹری اور بائیلوجی میں پاس کیا اور مولوی کا امتحان سرشتۂ تعلیم الہ آباد سے ۱۹۷۱ء میں پاس کیا۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب وہ شعبۂ معالجات میں ریڈر ہو چکے تھے۔

مذکورہ امتحانات کے علاوہ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے بی اے فرسٹ ڈویژن و فرسٹ پوزیشن سے پاس کر کے یونیورسٹی میڈل بھی حاصل کیا تھا، اس کے بعد ایم اے (فارسی) کی ڈگری ۱۹۶۲ء میں فرسٹ ڈویژن و فرسٹ پوزیشن سے حاصل کر کے یونیورسٹی میڈل حاصل کیا۔ ایم اے فارسی کے بعد انہوں نے شہنشاہ بابر و ہمایوں کے درباری طبیب یوسف بن محمد یوسفی کی حیات و تصانیف پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ۷۰-۱۹۶۹ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے حاصل کی۔ ۱۹۸۳ء میں آپ نے ایک مقالہ بعنوان فلاسفی آف گریکو عرب میڈیسن، بزبان انگریزی لکھا۔

۱۹۸۷ء میں آپ کی سعیِ بلیغ اور پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب پرو وائس چانسلر

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی پرُزور حمایت سے فیکلٹی آف یونانی میڈیسن قائم ہوئی اور آپ اس کے پہلے ڈین مقرر ہوئے۔

۱۹۷۰ء میں سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن قائم ہوئی اور اس کی نمائندگی کے لیے پورے ملک کے طبیہ کالجوں کے نمائندوں کا انتخاب ہوا۔ اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے منتخب ہوکر آپ سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن کے ممبر مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد کونسل کی ایجوکیشن کمیٹی کے چیئرمین بھی منتخب ہوئے اور اس عہدہ پر پانچ سال تک فائز رہے۔

جب حکومتِ ہند نے ریسرچ کونسل قائم کی تو وہ یونانی، آیورویدک، سدّھا اور ہومیوپیتھک پر ایک ساتھ مشترک تھی، مگر بعد میں شری راج نرائن ہیلتھ منسٹر کے زمانے میں یہ سب خودمختار کونسلیں بنادی گئیں، یونانی کونسل کا نام سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن پڑا، حکیم طیب صاحب اس کی گورننگ باڈی اور اس کی سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر نامزد کیے گئے، ۱۹۹۵ء تک وہ ان عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۹۷ء میں اس کمیٹی کے چیئرمین مقرر ہوئے اور تین سال کی مدت تک اس کے فرائض انجام دیے۔ جب علی گڑھ میں کونسل کا ریسرچ یونٹ بنا تو وہ اس کے پروجیکٹ آفیسر مقرر ہوئے اور اعزازی حیثیت سے یہ فرائض ۱۹۷۰ء سے ۱۹۹۵ء تک انجام دیے۔

انہوں نے علی گڑھ میں قائم کونسل کی یونٹ کو ترقی دے کر اسے ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا درجہ دینے کی تحریک شروع کی۔ حکیم عبدالرزاق صاحب نے اس تحریک کی پرُزور حمایت فرمائی۔ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب نے اس عہد کے وائس چانسلر سید حامد صاحب کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اسپتال کا نیو بلاک، جو اسپتال کے جانب مغرب واقع ہے اور خالی پڑا ہوا ہے، اسے ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کے لیے دے دیا جائے۔ ان کی اس تجویز کو سید حامد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اکزیکیٹو کونسل میں پاس کرادیا اور ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن اس میں

قائم ہوگیا، پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کو اس کا کوآرڈینیٹر بنایا گیا، کئی برس تک وہ اس کے منصبی فرائض اعزازی طور پر انجام دیتے رہے۔

وہ برسوں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہے، پھر اس کے نائب صدر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ حکیم عبدالحمید صاحب کی وفات کے بعد حکیم محمد مختار اصلاحی صاحب عارضی صدر مقرر ہوئے تو پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب سینئر نائب صدر بنائے گئے، جب باضابطہ صدر کا انتخاب ہوا تو وہ اس کے صدر منتخب ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ جامعہ ہمدرد کی اکیڈمک کونسل کے ممبر اور بیورو فار پروموشن آف اردو، منسٹری آف ہیومن ریسورس ڈیولپمنٹ ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن کے میڈیکل پینل کے چیئر مین رہے۔ ان کی معالجاتی خدمات کے اعتراف میں حکیم اجمل خاں میموریل سوسائٹی دہلی کی جانب سے صدر جمہوریہ ہند شری شنکر دیال شرما کے ہاتھوں بیسٹ فزیشین کا ایوارڈ بھی ۱۹۹۶ء میں ان کو مل چکا ہے۔

آپ پینتیس تحقیقی مقالات لکھ چکے ہیں، بیرون ہند بھی مقالے پیش کرنے کا موقع آپ کو ملا۔ ۱۹۸۷ء میں منعقدہ انٹرنیشنل کانفرنس آف ایلیمنٹولوجی میں ایک مقالہ بزبان انگریزی پیش کیا، جو 'سم الفار' کے تحقیقی مطالعہ پر مبنی تھا۔ ۱۹۸۲ء میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں منعقد ایک بین الاقوامی کانفرنس میں "ٹرانسفر آف ٹکنالوجی ٹو دی تھرڈ ورلڈ" کے عنوان پر پیش کیا۔ ۱۹۹۱ء میں وینس (اٹلی) میں منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں مقالہ پیش کیا، جس کا عنوان تھا 'فروم کریڈل تو گریو۔ فیکٹس اینڈ فیسیٹیز'، ۱۹۸۸ء میں سنگاپور کی بین الاقوامی کانفرنس میں تحقیقی مقالہ "لیٹنٹ ایسپیکٹس آف راولفیا سرپین ٹائنا" پیش کیا اور مئی ۱۹۸۸ء میں بینکاک (تھائی لینڈ) میں منعقدہ کانفرنس میں مقالہ بعنوان 'اسٹڈی آف میکونا کوچن چائنسِس فار ہائپوگلائی سیمک ایکٹیوٹی' پیش کیا۔ اکتوبر ۱۹۹۱ء میں آپ کو چین کے دارالخلافہ بیجنگ جانے کا موقع ملا، وہاں بین الاقوامی کانفرنس میں اپنا مقالہ پیش کیا، جس میں پہلی بار یہ واضح کیا کہ اسرول میں الرجی کے خلاف عمل کرنے کی صلاحیت بھی موجود ہے، جبکہ دنیا اس کو محض جنون اور بلڈ پریشر کی دوا سمجھتی ہے۔

علم الادویہ کے پروفیسر ہونے کے بعد وہ تین سال تک چیئر مین شعبۂ علم الادویہ رہے، اس دوران چھ طلبہ نے ان کی نگرانی میں ایم ڈی کے تحقیقی مقالے لکھے۔ جنوری ۱۹۹۳ء میں ریٹائر ہو کر امیر نشاں دودھ پور، علی گڑھ میں مطب جاری کیا۔ شروع میں فیس لے کر مریضوں کو دیکھتے تھے پھر بلا معاوضہ دیکھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ پیشۂ طبابت میں لالچ اور تجارتی عنصر کی بڑھتی روش سے ایک طرف طبیب سے تنفر پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ احساس ہوتا ہے کہ کسی دکھی بیمار کی صحت کی بازیابی اگر طبیب کر سکے تو اس کی قیمت تھوڑی رقم کے عوض چکائی نہیں جا سکتی لہٰذا مریضوں کی معالجاتی خدمت بلا معاوضہ ہی بہتر ہے۔

تقدمہ 'کتاب العشر مقالات فی العین'

شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی
سابق پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ

ہندوستان کے بہت کم طبیب اس امر سے واقف ہوں گے کہ اوپتھلمالوجی یا علم العیون کا بیش بہا ذخیرہ ان کے گھر میں موجود ہے۔ یہ قومی اور جماعتی تنزل کا انتہائی ثبوت ہے کہ ہم کو اپنے گھر کی خبر نہیں، بلکہ جرمنی کا ایک عالم اس سے روشناس کرا رہا ہے۔

یوحنا بن ماسویہ کے شاگرد حنین بن اسحاق سے کون واقف نہیں، یونانی زبان سے عربی میں طب کو منتقل کرنے میں اس کا بہت بڑا ہاتھ ہے، اس کی ایک کتاب 'عشر مقالات' کو جو اوپتھلمالوجی کی سب سے پہلی کتاب سمجھی جاتی ہے، اسے زمانہ کی دستبرد نے ایک طویل مدت کے لیے پردۂ خفا میں چھپا دیا اور جب وہ ظاہر ہوئی تو اس کا مصنف ایک عیسائی راہب قسطنطین افریقی بن بیٹھا، جس کا پیشہ علمی چوریاں کرنا ہو گیا تھا، دوسروں کی نادر تصنیفات اپنے نام سے شائع کرنا اس کا شیوہ تھا۔ خدا بھلا کرے ڈاکٹر میکس مائرہوف کا، جس نے سب سے پہلے تحقیق کر کے اس کی چوری پکڑی اور 'عشر مقالات' کو اس کے اصلی مصنف کی طرف منسوب کیا۔ ہم تمام اطباء کو اس کی مساعی کا شکرگزار ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر موصوف نے ان مقالات پر بڑی ریسرچ کی اور ان کو مکمل کرنے کی نہ صرف کوشش کی، بلکہ انگریزی زبان میں اس کا صحیح ترجمہ کیا اور اس کے ساتھ اپنا ایک عالمانہ اور

محققانہ مقدمہ تحریر کیا۔ اس مقدمہ میں ان کی علمی تحقیقات، انمول موتیوں کے مانند بہت زیادہ قابل قدر ہیں۔

سب سے پہلے اس کتاب کے متعلق اطلاع علامہ حکیم محمد کبیر الدین صاحب سے ملی، میں نے اس کتاب کی جستجو شروع کی اور جب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، بیروت تشریف لے گئے تو میں نے اس کتاب کے متعلق ان کی خدمت میں عرض کیا، ممدوح کی سرپرستی کی وجہ سے جدوجہد میں کامیابی ہوئی اور اس کتاب کے دو چار نسخے حاصل ہو گئے۔

اگرچہ یہ توقع نہ تھی کہ اس کتاب کو اطباء خریدیں اور پڑھیں گے تاہم احیائے فن کی خاطر یہ جذبہ پیدا ہوا کہ اس کتاب کا اردو زبان میں ترجمہ کیا جائے اور اس کے واسطے میں نے عزیز ترین شاگرد حکیم محمد طیب صاحب لکچر رطبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو منتخب کیا، موصوف نے یہ کام نہایت محنت سے انجام دیا۔ تین چار مہینہ میں اس کا ایک مسودہ تیار ہو گیا اور وہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کیا گیا، ممدوح نے کچھ ایسی اصلاحیں تجویز فرمائیں، جن کے لیے سال دو سال کی مدت درکار تھی، تعمیل حکم کی گئی اور تقریباً ڈیڑھ سال کی مدت میں یہ ترجمہ معہ مقدمہ آپ لوگوں کی خدمت میں پیش ہو رہا ہے۔

لائق مترجم نے اس کے مقدمے میں حنین بن اسحاق کی یا یوں کہئے کہ متقدمین اطباء کی کچھ تشریحی غلطیوں پر توجہ دلائی ہے، ان غلطیوں سے ان کے فضل وکمال میں کسی قسم کی منقصت پیدا نہیں ہوتی، کیونکہ جو صحیح چیزیں انہوں نے بیان کی ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ غلطیاں ان کے مقابلے میں برائے نام سمجھی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے جس نے ہوائی جہاز بنایا تھا کمال تو اس کا ہے، لیکن بعد میں لوگ غلطیاں نکالتے رہتے ہیں یا مختلف قسم کی اصلاحات ہوتی رہتی ہیں تو اس سے موجد کے کمال میں فرق نہیں آتا۔ کیا معلوم کہ آج جو تشریحی نظریات صحیح سمجھے جاتے ہیں وہ کل بھی صحیح رہیں گے، دنیائے تحقیقات میں علمی انقلابات ہوتے رہتے ہیں

اورنظریات میں مفکرین کے دماغ کے لحاظ سے الٹ پلٹ ہوتی رہتی ہے۔

حنین بن اسحاق کا زمانہ عربی طب کا ابتدائی دور تھا، لیکن اس کے بعد کے آنے والوں نے بہت کچھ تشریحی ترقیاں کی ہیں، مثلاً زکریارازی نے سب سے پہلے آنکھ کا وہ باریک عضلہ جو پتلی (حدقہ Pupil) کو پھیلاتا اور سکیڑتا ہے، جس کو عضلۂ ہدبیہ (Ciliary Muscle) کہتے ہیں، دریافت کیا، جو اس سے پہلے کسی کو معلوم نہیں تھا اور جو آج تک مسلم ہے۔

لائق مترجم نے اپنے مقدمہ میں گلاکوما کے متعلق جو تحقیق کی ہے وہ قابلِ صد آفریں ہے، اس سے پہلے یہ خیال تھا کہ متقدمین اطباء گلاکوما سے ناواقف تھے اور بعض کتابوں میں جو اس کا ثبوت ملتا تھا وہ کسی قدر دھندلا تھا، لیکن مترجم نے اپنے مقدمہ میں جو ثبوت پیش کیا ہے وہ پہلا اور قابل اطمینان ثبوت ہے۔

خدا لائق مترجم کی اس پہلی کوشش کو بارآور فرمائے اور تمام اطباء کو اس کتاب کے مطالعہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

تعارف 'قانون صحت'

شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی
سابق پرنسپل، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ

انسان کی دو حالتوں، صحت و مرض میں سے صحت، انسان کی طبعی حالت ہے۔ انسان کی طبیعت کا ذاتی تقاضا یہ ہے کہ وہ انسان کو تندرست رکھے اور گرد و پیش کے دشمنوں سے اسے محفوظ رکھے، اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انسانی طبیعت کے لیے بہت سے اسلحے، آلات اور ساز و سامان قدرت نے مہیا کر دیئے ہیں۔ مفید اجزاء کو غذا کے واسطے جذب کرنا اور پھر مضر فضلات کو دفع کرنا طبیعت کا خاصہ ہے، دشمن جراثیم کو ہلاک کرنے کے لیے بھی طبیعت کے پاس بہت سی اینٹی جراثیم چیزیں موجود ہیں، جن کی وجہ سے جراثیم ہلاک ہو جاتے ہیں، مثلاً آنسو، تھوک، پسینہ، ہاتھ کی گرمی، دشمن جراثیم کو ہلاک کرتے رہتے ہیں، اندرونِ جسم کی رطوبات اور گرمی بھی جراثیم کو ہلاک کرتی رہتی ہے۔ جب تک جسم کی امیونٹی قوی ہے، بڑے سے بڑے جراثیم کو وہ ہلاک کرنے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ وبائی قسم کے سخت جراثیم بھی جسم کی قوت مدافعت سے شکست کھا جاتے ہیں۔ اگر امیونٹی کا تجزیہ کیا جائے تو آخر میں ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ عناصر کی ترکیب و ترتیب جب تک اپنے تناسب پر محفوظ رہتی ہے، قوتِ مدافعت تمام دشمنوں کو شکست دیتی رہتی ہے، لیکن جب اس کی ترکیب و ترتیب میں کوئی فرق آتا ہے تو ہر دشمن اپنا گھر کر لیتا ہے اور مختلف قسم کی بیماریوں میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے، اگر نیچرل اور قدرتی حفظانِ صحت کے اصول پر عمل کیا جائے تو ہر شخص اپنی مکمل صحت کے

ساتھ اپنی طبعی عمر یعنی ایک سو بیس برس تک پہنچ سکتا ہے، لیکن اصولِ حفظانِ صحت کی خلاف ورزی کی صورت میں ہر عمر میں انسان زندگی کو خیر باد کہہ سکتا ہے۔ اطباء کے اصولِ حفظانِ صحت کو اگر دیکھا جائے تو وہ اس قدر سادہ اور قوانین قدرت پر مبنی نظر آتے ہیں کہ ہر شخص کا اس پر عمل کرنا آسان اور آخر عمر تک صحت کے ساتھ پہنچنا ممکن ہے اور ہزاروں سال کے تجربہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ روزمرہ کی زندگی میں قدرتی قوانین کی پابندی بیماریوں سے کوسوں دور رکھتی ہے۔

حفظانِ صحت پر دو نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے، ایک گرد و پیش کے تمام دشمنوں اور تمام جراثیم کو ہلاک اور ختم کر دینا، دوسرے انسان کی قوتِ مدافعت کو اتنا قوی رکھنا کہ وہ تمام دشمنوں کو ہلاک کر دے۔ اطباء کے نظریۂ حفظانِ صحت کی بنیاد یہ آخری اصول ہے۔ لیکن اطبائے مغرب اس فکر میں مبتلا ہیں کہ جراثیم کش ادویہ کے ذریعہ جراثیم کو ہلاک کیا جائے اور بدنِ انسان پر بھی ایسی دوائیں استعمال کی جائیں جو اس کو جراثیم سے محفوظ رکھیں، اس نظریہ کی کامیابی یعنی تمام جراثیم کا دنیا سے ختم ہو جانا خواب و خیال ہی نظر آتا ہے، لیکن انسان کا بذریعہ ادویات، جراثیم سے تحفظ انسان کی قوتِ مدافعت کو تباہ و برباد کر دیتا ہے، دوائیں کتنی ہی مفید ہوں، بہر حال وہ جسمِ غریب ہیں اور طبیعت پر گراں بار پتھر ثابت ہوتی ہیں۔ طبیعت ہر جسمِ غریب سے متاذی ہوتی ہے اور اس کو جلد سے جلد دفع کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ دوائیں جسم کے اندر اگر باقی رہ جائیں اور طبیعت ان کو دفع نہ کرے تو یہ دوائیں بھی ہماری ہلاکت کا سبب بن سکتی ہیں، پھر دواؤں کے ری ایکشن اور تعامل سے انسان کی قوت اور انرجی بہت زیادہ ضائع ہو جاتی ہے۔ طبیعت کو جتنا بیماریوں سے مقابلہ کرنے میں قوت صرف کرنا پڑتی ہے اس سے کہیں زیادہ دواؤں کے ردِ عمل اور ان کے مقابلے میں صرف کرنا پڑتی ہے۔ دواؤں کے اثرات خود ایک بیماری ہیں، جو بیماری کی حالت میں کسی بیماری کو زائد کر دیتے ہیں۔ جب انسان کے جسم میں کوئی غیر طبعی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور روزمرہ کی معمولی تدابیر کارگر نہیں ہوتیں اور طبعی حالات اس کے زائل کرنے پر قادر نہیں ہوتے اور طبیعت عاجز ہو جاتی ہے تو اس

غیر طبعی کیفیت کو زائل کرنے کے لیے کوئی غیر طبعی کیفیت پیدا کرنی ہوتی ہے، مثلاً اگر انسان کا درجۂ حرارت اپنی طبعی حالت یعنی ساڑھے اٹھانوے درجہ سے زائد جتنی حرارت پیدا ہوگئی ہے اس کے مقابلہ کے لیے غیر طبعی برودت، مثلاً برف وغیرہ کے ذریعہ یا ٹھنڈی ہواؤں اور ٹھنڈی دواؤں کے ذریعہ اس کو دفع کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے، لیکن جتنی برودت غیر طبعی اور زائد حرارت کے لیے پہنچائی جاتی ہے اگر طبعی حالت یعنی ساڑھے اٹھانوے درجہ پر پہنچائی جائے تو نقصان دہ ثابت ہوگی، یعنی حرارت اپنی طبعی حالت یعنی ساڑھے اٹھانوے درجہ سے گر جائے گی، انسان پر سردی کی بیماریاں طاری ہونے لگیں گی اور یہ ٹھنڈی دوائیں کوئی غیر معمولی بیماری کا سبب بن جائیں گی۔ اس عالم میں کوئی دوا ایسی نہیں ہے جس میں منفعت کا پہلو ہو اور مضر اثرات نہ رکھتی ہو خواہ یہ دوائیں ایلوپیتھی ہوں یا یونانی یا ہومیو پیتھک ہوں، بیماریوں کے علاج میں اکثر یہ واقعات پیش آتے ہیں کہ جس بیماری کا علاج کیا گیا اس میں افاقہ تو ہو گیا لیکن دوسری بیماریاں اور پیدا ہو گئیں اور یہ عموماً دواؤں کے بے تحاشہ استعمال کا نتیجہ ہوتی ہیں، انہی حالات کے ماتحت بقراط نے بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے مریض کا علاج ضروریاتِ ستہ میں تغیر وتبدل کرنے سے کیا جائے یعنی کھانا، پینا، سونا، جاگنا۔

اس کے بعد اگر اس سے فائدہ نہ ہو تو ذوالخاصہ غذاؤں سے مثلاً کھانسی میں لوبیا اور باقلا، امراضِ حلق میں مسور کی دال، شہتوت، انجیر وغیرہ استعمال کرائیں، اگر اس سے فائدہ نہ ہو تو پھر کوئی مفرد دوا، اگر اس سے فائدہ نہ ہو تو نباتی وحیوانی مرکب دوائیں اور سب کے آخر میں معدنی ادویات استعمال کرانا چاہئیں۔ علاج میں یہ احتیاط اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ کوئی دواء مرض کو زائل کرنے کے بعد اپنی کیفیت کے مطابق کوئی دوسرا مرض پیدا نہ کر دے، آج کل کے زمانہ میں بیماریوں کے علاج کی جانب ان کے لیے اسپتال اور شفا خانے کھولنے، دوائیں مفت تقسیم کرنے کا تو خاص اہتمام اختیار کیا جاتا ہے لیکن ان کی صحت کو محفوظ رکھنے کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا جاتا ہے اور جو تدابیر اختیار کی بھی جاتی ہیں تو وہ محض اینٹی سپٹک دواؤں کا استعمال ہے، جو بجائے خود بیماریاں ہیں۔ انسان کی قوتِ مدافعت کو قوانینِ قدرت کے ماتحت

قوی رکھنے اور بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے نہ کوئی اسپتال ہے نہ کوئی پند و نصیحت کا انتظام ہے، لوگ نہ کھانے پینے کے آداب سے واقف، نہ ان کی مضرتوں سے آگاہ، سونے جاگنے کے اصول سے بے خبر، ہوا اور پانی کی اصلاح سے بے بہرہ، غذاؤں کی ترکیب و ترتیب اور ان کی صنعتِ طبخ سے غافل، طرح طرح کی بیماریوں کا خود اپنے ہاتھوں شکار ہوتے رہتے ہیں۔ معالجین اس انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ تندرست بیمار بنیں اور نہ بنیں تو وہ خود بیمار بنا دیں اور ایسا سلسلۂ علاج شروع ہو کہ زندگی بھر پنجۂ علاج سے نکلنے نہ پائے اور طریقۂ علاج کے اس رسم و رواج کا یہ بھی اثر ہوا کہ معالجین خود بھی اصولِ حفظانِ صحت کو بھلا بیٹھے اور سوائے چند دواؤں کی خاصیت کے، ضروریاتِ ستہ کی خاصیتوں کو فراموش کر بیٹھے۔

علمِ حفظانِ صحت قدیم زمانہ کا ایک کھویا ہوا سرمایہ ہے، جس کے اصول صرف زینتِ قرطاس بن کر رہ گئے، کبھی کبھی یاد آجاتا ہے تو اس کی تلاوت کر لی جاتی ہے۔ اس بھولے ہوئے سبق کو پھر یاد کرنے اور اس کھوئے ہوئے سرمایہ کو پھر زندہ کرنے کی انتہائی ضرورت ہے۔

پھر جدید اور قدیم کی تفریق نے اور بھی قیامت ڈھا دی ہے، جس کی وجہ سے قدرتی اصولِ حفظانِ صحت پر عمل کرنے سے لوگ قاصر رہتے ہیں اور زیادہ تر مصنوعی اور دوائی تدابیر کی جانب رجحان رکھتے ہیں۔ آج تک طلبہ کے کورس کے لیے بھی کوئی کتاب ایسی دستیاب نہیں ہوسکی، جس میں قدیم اصول کے ماتحت تمام مفید جدید چیزیں بھی اپنی زبان اور اپنی اصطلاحات میں جذب کر لی گئی ہوں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہمارے طبیہ کالج کے ہونہار فرزند اور لکچرر عزیزی حکیم محمد طیب صاحب نے ایسی کتاب تصنیف کی ہے، جس میں قدیم و جدید حفظانِ صحت کو اپنی زبان اور مصطلحات میں پیش کیا گیا ہے اور قدیم و جدید کی تفریق مٹا کر سچے مسائل کی پیروی کی گئی ہے، اس میں جدید حفظانِ صحت کے وہ اصول بھی بیان کیے گئے ہیں، جو یونانی اطباء نے اختیار کیے تھے اور اس ملک کی ضروریات حفظانِ صحت کو بھی پیش نظر رکھتے ہوئے مسائل کا اضافہ کیا گیا ہے۔ طبیہ کالج کے لڑکوں کے لیے جتنے بھی قدیم و جدید مواد کی ضرورت تھی، ان سب کو اس میں جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب

کے عنوانات ایسے رکھے گئے ہیں کہ قدیم وجدید طلبہ دونوں کے لیے غیر مانوس ثابت نہ ہوں، اگرچہ اس کتاب میں کسی کسی جگہ زبان کی روانی اور جملوں کی ترکیب کھٹکتی ہے جو شاید آئندہ تصانیف میں نہیں پائی جائے گی۔ مصنف کو اس سے پہلے کتاب العشر مقالات فی العین، علم العین اور اطبائے قدیم، ہر دو تصانیف پر یوپی اکیڈمی کی طرف سے اول درجہ کے انعام مل چکے ہیں، امید ہے کہ یہ کتاب بھی انعام کی مستحق ثابت ہوگی۔

تعارف 'کتاب العشر مقالات فی العین'

علامہ حکیم محمد کبیر الدین

دنیائے علم میں، جس میں ایشیا، افریقہ اور یورپ، سارا جہان شریک ہے، علم العین پر سب سے پہلی کتاب کون ہے، جو علمی حیثیت سے لکھی گئی ہو؟۔

اس سوال کا جواب حنین بن اسحاق کی شہرہ آفاق کتاب 'العشر مقالات فی العین' ہے، جس کے سرورق پر میکس مائرہوف نے 'اقدم کتاب فی العین' کے شاندار الفاظ سے دنیائے علم کو روشناس کرایا ہے۔

یوں تو کسی کتاب کی اہمیت کے لیے خواہ وہ ترجمہ ہو، تالیف ہو یا تصنیف، حُنین بن اسحاق کے نام کا انتساب ہی کافی ہے، چہ جائیکہ ایسی کتاب، جس سے کسی نئے علم کی بنیاد پڑ جائے۔

آج سے چند سال پہلے ۱۹۲۸ء میں میکس مائرہوف نے اصل عربی کتاب، انگریزی ترجمہ اور طویل مقدمہ (عربی وانگریزی) کے ساتھ مصر سے شائع کی ہے، جس پر وہ انگریزی، عربی دنیا کی طرف سے شکریہ کے مستحق قرار پائے۔

یہی کتاب حکیم محمد طیب صاحب کی مساعیٔ جمیلہ سے اس وقت اردو جامہ میں پیش کی جا رہی ہے، جس پر اردو دنیا اب ہدیۂ سپاس وتشکران کی خدمت میں پیش کرے گی۔

میں انہیں اس کام پر مبارکباد دیتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا ان کی اس پہلی خدمت کو قبول عام کے سہرے سے نوازے اور انہیں توفیق عنایت فرمائے کہ اس خدمت کے بعد فنِ عزیز کی بے شمار خدمات انجام دے سکیں۔

بڑا ہے درد کا رشتہ

(ڈاکٹر حکیم محمد طیب کی یاد میں)

پروفیسر ابوالکلام قاسمی
سابق ڈین، فیکلٹی آف آرٹ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ان سے نیاز تو بہت بعد میں حاصل ہوا مگر علی گڑھ میں اپنی طالب علمی کے زمانے سے شروع شروع میں ان کی سخت گیری اور اصول پسندی سے اور بعد کے زمانے میں ایک حکیم حاذق کے طور پر ان کی طبّی مہارت اور تشخیص کی ندرت وانفرادیت سے واقف ہوتا رہا تھا۔ بدمزاجی کی حد تک بڑھی ہوئی ان کی سخت گیری اور اصول پسندی کی ایسی شہرت تھی کہ ضرورت محسوس کرنے والے بھی بہت سے لوگ ان سے رابطہ قائم کرنے اور طبّی مشورہ لینے کی جرأت نہیں کرپاتے تھے۔ ہمارے رفیقِ شعبہ ڈاکٹر طارق چھتاری اکثر ان کی حذاقت کے ساتھ ان کے پُرلطف اور سخت رویے کے لطیفے مزے لے لے کر سناتے رہتے تھے۔ مجھے نہ جانے کیوں بحیثیت طبیب کے ان کی شخصیت میں ہمیشہ سے ایک کشش محسوس ہوتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں کسی بھی کاملِ فن اور اپنے میدان میں غیر معمولی انفرادیت اور مہارت رکھنے والی شخصیت کو مجھے بہت مرنجامرنج، بے ضرر اور غیر ضروری یا مضحکہ خیز حد تک نارمل دیکھنا کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ وہ جو سودا نے کہا ہے نا کہ:

ہنر پیدا کر اوّل ترک کیجیو تب لباس اپنا
نہ ہو جیوں تیغ بے جوہر وگرنہ ننگ عریانی

اگر وہ تیغِ بے جوہر ہوتے یا بے ہنر ہوتے تو ان کا آپے سے باہر ہو جایا کرنا نہ لوگوں کے لیے قابلِ قبول ہوتا اور نہ ان کی کوئی ناز برداری کی جاتی۔ طیب صاحب اپنی ملازمت کے زمانے میں شعبۂ علم الادویہ کے ایک پروفیسر کے علاوہ طبیہ کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ ان کے دورِ اقتدار میں طبیہ کالج کو علمی اور انتظامی اعتبار سے جو امتیازات حاصل ہوئے وہ امتیازی حیثیت دوبارہ لوٹ کر آج تک نہیں آئی۔ وہ علم طب میں محض ماہر طبیب اور معالج ہی نہیں تھے، بلکہ اپنے میدان میں ان کی اختراعی صلاحیتیں ان کو دوسرے نامور اطباء میں بھی منفرد اور بے مثال بناتی تھیں۔ علی گڑھ میں تو ہم نے اجمل خاں طبیہ کالج کی تاریخ بھی پڑھی اور بعض پرانے اساتذہ کی تعریف بھی سنی مگر اساتذہ میں حکیم عبداللطیف اور حکیم افہام اللہ کے علاوہ کسی اور کے ذکر میں نفسیاتی اور طبّی تشخیص اور دواؤں کی تجویز میں ندرت کے حوالے سے کم کم ہی سنا ہے۔ حکیم افہام اللہ صاحب کی صلاحیت تو اظہر من الشمس تھی اور علی گڑھ میں طبیہ کالج سے باہر اگر کوئی حکیم ان کی طرح کی علمی اور طبّی مہارت کا مالک تصور کیا جاتا تھا تو وہ حکیم خیری صاحب تھے جن کو طب کی روایت پر گہری دسترس تھی، اَن گنت فارسی زبان کے منظوم نسخے ازبر تھے اور روایتی مفردات میں مریض کی نوعیت کے اعتبار سے تبدیلی کرنے میں ان کی کوئی بڑی حکمت اور گہری سوجھ بوجھ پوشیدہ ہوا کرتی تھی، مگر ہمارے حکیم طیب تو ان سب میں بھی نرالے تھے۔ فارسی کے پی ایچ ڈی، طب کی ڈگریوں کے مختتم اور طب کی دنیا میں اپنے مقالات، معلومات اور تجربات کی بنیاد پر یکتا تصور کیے جانے والے طیب صاحب کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل تھا کہ انہوں نے انگریزی زبان میں اپنے لکھے ہوئے مضامین کے توسط سے یونانی طب کی مخصوص خصوصیات، اثرات اور ضمنی اثرات سے تحفظ اور متعدد باریکیوں سے ساری دنیا کو روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیا تھا۔

حکیم محمد طیب صاحب کی وفات حسرت آیات کی اطلاع مجھے اس وقت ملی جب میں اپنے بیٹے سمیر سے ملنے کینیڈا گیا ہوا تھا۔ دل مسوس کر رہ گیا۔ ابھی ہفتہ عشرہ قبل ہی تو ان سے مل کر اور ایک پرانے نسخے پر ان کی رائے لے کر کینیڈا کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اطلاع ملتے ہی

میں نے ایصال ثواب کا سلسلہ شروع کر دیا اور یہ بھی طے کیا کہ ان کے بارے میں اپنے تأثرات ضرور قلم بند کروں گا۔

کوئی دس پندرہ سال کا عرصہ گزرا جب میری بیگم ڈاکٹر دردانہ قاسمی کو بار بار نزلہ اور الرجی کی شکایت شروع ہوئی، انہیں دنوں مجھے بھی کسی قدر ہاضمہ کی شکایت درپیش تھی۔ طرح طرح کی دوائیں استعمال کر کے اور بھانت بھانت کے ڈاکٹروں، حکیموں اور ویدوں سے مشورے لے کر ہم لوگ تنگ آچکے تھے کہ ایک روز خیال آیا کہ کیوں نہ حکیم طیب صاحب کی ڈانٹ سنی جائے۔ ہم دونوں اس پس منظر میں طیب صاحب کے پاس حاضر ہوئے تھے۔ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ ان کی دواؤں سے مجھے کیا فائدہ پہنچا۔ البتہ میری بیگم کو نہ صرف یہ کہ فائدہ ہوا بلکہ ایسا لگا جیسے اس معاملے میں ساری پیچیدگی دور ہو گئی۔ واضح رہے کہ ان کو کسی خاص قسم کی زبردست الرجی تھی اور موسم کی ذرا سی تبدیلی، ٹھنڈی ہوا یا کسی بھی طرح کی تیز بو سے چھینکوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا، جو اگر ایک آدھ دن میں نہ رکتا تو پھر بغیر انٹی بایوٹک دواؤں کے افاقے کی کوئی صورت نہ نکلتی تھی۔ حکیم صاحب کی عادت تھی کہ دوسری ملاقات میں وہ دوا سے ہونے والے فائدے کا اندازہ لگاتے تھے اور پھر بعد کی دوائیں تجویز کرتے تھے۔ دوا سے پہنچنے والے فائدے پر ان کا کوئی غیر معمولی ردعمل نہیں ہوتا تھا، گویا ان کو اپنی دوا کے مثبت اثر کا تو یقین تھا ہی۔ ویسے وہ کچھ کہتے تو نہ تھے، خوش ضرور ہوتے تھے اور اکثر یہ جاننے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی دواؤں کا اثر کن چیزوں پر کیا پڑا اور کیا کسی طرح کے منفی اثرات بھی محسوس کیے گئے۔ وہ اکثر مریض کی باتوں سے بعض نتائج نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ بسا اوقات دیر تک قلم ہاتھ میں لیے سوچتے رہتے اور کوئی مزید بات دریافت کرنی ہوتی تو پوچھ لیا کرتے۔ ان کے مزاج کی نزاکت یا نرالے پن کی یہ خصوصیت ہم جیسے مریضوں پر کسی نہ کسی طرح ظاہر ضرور ہو جایا کرتی تھی۔ مریض کے الجھے ہوئے ذہن یا دواؤں کے استعمال کے سلسلے میں ان کی بات نہ سمجھ پانے پر وہ ہمیشہ اپنے شدید ردعمل کا اظہار کیا کرتے تھے۔ کمزور اعصاب کا آدمی تو ان کی ڈانٹ سن کر دوبارہ ان کے پاس جانے کی ہمت ہی نہیں کر پاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ مریض کی

اس نفسیات کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنی بیماری یا کج فہمی کے باعث خود اپنے آپ سے ہمدردی نہ کرے، بلکہ طبیب پر اپنے غصے یا ردعمل کو ظاہر کر کے یہ سمجھ بیٹھے گویا اس نے طبیب کا کچھ بگاڑ لیا ہو، حالانکہ درحقیقت وہ اپنا ہی نقصان کرنے کا مرتکب ہوتا ہے۔ آپ کو ایسے لوگ بڑی تعداد میں ملیں گے جو یا تو بعض دوائیں پسند نہیں کریں گے یا ان کے طریقہ استعمال کو ناپسند کریں گے یا دواؤں کے ذائقے یا شکل سے اپنی اُکتاہٹ کچھ اس انداز میں ظاہر کریں گے، گویا یہ اُکتاہٹ انہیں بیماری سے نجات دلادے گی۔

نہ جانے کیوں بچپن سے یہ بات ہماری نفسیات کا حصہ رہی کہ کوئی پہنچا ہوا ولی وہی ہوتا ہے جس میں مجذوبیت بھی کسی نہ کسی صورت میں ہو، یا حاذق حکیم بھی وہی ہوتا ہے جو کچھ نہ کچھ بد دماغ، تنک مزاج اور بہت شائستہ لفظوں میں نازک مزاج بھی ہو۔ یہ بات طیب صاحب پر پوری طرح صادق آتی تھی۔ میرے بہت سے جاننے والے اس بات پر حیران ہوتے کہ ان سے میرے اچھے خاصے مراسم کیسے پیدا ہو گئے تھے۔ وہ میری بعض شوخیوں پر مسکرا بھی دیا کرتے تھے اور بات ہی بات میں مختلف علمی، طبّی اور ادبی باتیں شروع کرتے تو دیر تک کرتے رہتے تھے۔ مجھے قدرے الجھن ہوتی تھی کہ باہر کچھ مریض انتظار کر رہے ہیں۔ باہر بیٹھے مریضوں اور ان کے ساتھیوں کو حیرت بھی ہوتی تھی یہ کون شخص بیٹھا ہے جس سے حکیم صاحب اپنی تمام تنک مزاجی کے باوجود نہایت خوش اسلوبی سے گفتگو کر رہے ہیں، ورنہ وہ تو غیر ضروری باتوں سے سخت احتراز بھی کیا کرتے تھے۔

حکیم طیب سے میری ذاتی اور ذہنی قربت اسی وقت سے شروع ہوئی جب انہوں نے ایک دن اچانک میرا نام سن کر کہا کہ ''لگتا ہے کہ آپ کا نام کہیں پڑھا ہے یا کسی سے آپ کا ذکر سنا ہے''۔ جس پر میں نے اپنی علمی و ادبی دلچسپیوں کا ذکر کیا۔ پھر کیا تھا، وہ تو میرے معاملے میں سنجیدہ ہوئے۔ یہ الگ بات ہے کہ پہلے مجھے اکثر یہ حیرت ہوا کرتی تھی کہ علی گڑھ ہی کیا، پورے اردو معاشرے میں کچھ ایسا گم نام بھی نہیں ہوں مگر حکیم صاحب نہ تو مجھے ایک پروفیسر کی حیثیت سے کوئی اہمیت دیتے ہیں اور نہ میرا نام ہی کبھی ان کو مانوس معلوم ہوتا تھا۔ بعد کے

زمانہ میں انہوں نے ایک روز رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا ذکر کیا اور کہنے لگے کہ آپ تو اس کے ایڈیٹر ہیں، مگر یہ رسالہ مجھے پابندی سے نہیں ملتا۔ میں نے واپس جا کر اس بات کا اہتمام کر دیا کہ رسالہ ان کو متعین تاریخ پر مل جایا کرے۔ انہوں نے اس ملاقات میں یہ بھی کہا کہ آپ نے بہت اچھا کیا کہ آپ اداریہ لکھنے لگے ورنہ پہلے اداریے کے نقطۂ نظر کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میرے اداریوں سے ان کی دلچسپی کچھ اتنی بڑھی کہ انہوں نے ایک روز رسالے کے لیے اپنے غیر معمولی اشتیاق کا ذکر کیا اور کہا کہ آپ کا آدمی رسالہ پہنچاتا ضرور ہے مگر کبھی کبھی تاخیر بھی ہو جاتی ہے، اس لیے ہر مہینے کی گیارہ تاریخ کو ہمارا آدمی خود جا کر رسالہ لے آیا کرے گا۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی آپ یہ بات دفتر میں نوٹ کرا دیں۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی ہوئی جب انہوں نے اداریے کے لیے نہ صرف اپنی پسندیدگی کا ذکر کیا بلکہ یہ بھی کہا کہ اب مجھے صرف آپ کے اداریے کے باعث رسالے کا سخت انتظار رہنے لگا ہے اور بقول ان کے مسلمانوں کے عام مسائل، اردو سے متعلق معاملات اور فکری یا دانش ورانہ موضوعات پر غور کرنے والے اور لکھنے والے ہمارے کیمپس میں اب محض گنتی کے لوگ رہ گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں نے اپنے مزاج کے مطابق ان تمام باتوں کو ان کی دعاؤں پر محمول کیا ورنہ اس نوع کے کلماتِ خیر کا اظہار پروفیسر مسعود الحسن، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، پروفیسر مسعود حسین خاں، پروفیسر فصیح احمد صدیقی اور بعض دوسرے قابلِ ذکر لوگوں نے بھی متعدد بار کیا تھا۔

پروفیسر حکیم محمد طیب علامہ اقبال سے خاصی عقیدت تو رکھتے تھے مگر اقبال کی شاعری کے براہ راست مطالعہ کا موقع انہیں شاید کم ملا تھا۔ جب انہوں نے مجھ سے اقبال کو پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا تو میں نے ان کی خدمت میں کلیاتِ اقبال کی ایک کاپی بھجوا دی۔ دوسری ملاقات میں پتہ چلا کہ وہ تقریباً پورے کلام کا مطالعہ کر چکے تھے۔ انہوں نے اقبال کی بعض نظموں اور شعروں کے بارے میں وضاحتیں بھی مجھ سے چاہیں اور میں نے ان کی طبابت کے اوقات سے الگ وقت لے کر ان سے اس موضوع پر دو تین بار تفصیلی ملاقاتیں کیں۔ وہ اس

بات پر اکثر حیران ہوتے کہ "آپ اردو والے اقبال یا بعض دوسرے شاعروں کے حوالے سے فلسفۂ وقت، تقدیر، تصورِ کائنات اور مشرقی اور مغربی فلسفے جیسے دقیق فلسفیانہ مسائل سے خاصی دلچسپی رکھتے ہیں، ہمیں پہلے اس بات کا اندازہ نہیں تھا۔"

پہلے بیش تر لوگوں کی طرح ان کا خیال تھا کہ اردو زبان و ادب محض شعرو شاعری اور عشقیہ موضوعات تک محدود ہے اور اس کا کوئی سنجیدہ اور دانش ورانہ پس منظر نہیں بنتا۔ طیب صاحب کو اقبال کے علاوہ بھی عام دلچسپی کی اہم تحریریں پڑھنے کا شوق تھا۔ ایک بار خود نوشت سوانحات کا ذکر نکل آیا تو انہوں نے بتایا کہ ادھر انہوں نے ساجدہ زیدی کی آپ بیتی پڑھی ہے۔ اس وقت تک میں نے خود بھی وہ کتاب بالاستیعاب نہیں پڑھی تھی۔ انہوں نے مجموعی طور پر ساجدہ زیدی کی آپ بیتی کو پسند کیا تھا مگر اس میں موجود بعض واقعات کے ذکر سے اتفاق نہیں کیا اور بتایا کہ اس میں بہت سی باتیں خلافِ واقعہ بھی ہیں اور خود مرکزیت کو بھی ظاہر کرتی ہیں جس کے جواب میں، میں نے ان سے اختر الایمان کی آپ بیتی 'اسی آباد خرابے میں' کا ذکر کیا تھا اور بہت تعریف کی تھی۔ انہوں نے اختر الایمان کی کتاب کے لیے جب اپنا اشتیاق ظاہر کیا اور کہا کہ وہ اسے ضرور پڑھنا چاہتے ہیں مگر اس کا انحصار میرے کتاب بھجوانے پر تھا، مگر افسوس کہ اس کی نوبت نہ آسکی، میں سفر پر روانہ ہوگیا اور وہ اس درمیان سفر آخرت پر۔

ڈاکٹر حکیم محمد طیب صحیح معنوں میں ایک غیر معمولی شخص اور تشخیص کے معاملے میں بے مثال طبیب تھے۔ وہ بڑی توجہ سے مریضوں کی باتیں سنتے، غور کرتے اور اگر نبض بھی دیکھتے تو دیر تک نبض کی کیفیت کا اندازہ لگاتے رہتے اور پھر کہیں جاکر کوئی دوا تجویز کیا کرتے یا تشخیص کا تعین کرپاتے۔ میں نے بوعلی سینا سے لے کر بہت سے طبیبوں کی حذاقت اور فطانت کے واقعات سن رکھے ہیں۔ اپنے زمانے کے ماہرین طب سے میرا زیادہ سابقہ تو نہیں رہا مگر انسان ہونے کے ناطے بیماری اور اس پر طبیب یا ڈاکٹر کے ردِ عمل سے ان کی فطانت اور نکتہ رسی کا اندازہ تو لگا ہی سکتا ہوں۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنی کتاب 'چہار مقالہ' کے اس

باب میں جو طب اور طبیبوں کے حیرت انگیز واقعات سے متعلق ہے، میں نے اس کا بغور مطالعہ کیا ہے مگر ایسے محیر العقول اطباء کی ملاقات سے محرومی رہی۔ میرے لیے تو میری معلومات کی حد تک اگر کوئی طبیب حاذق ہو سکتا تھا تو وہ طیب صاحب تھے۔ وہ محیر العقول کارنامے تو انجام نہیں دیا کرتے تھے اور محض چہرہ دیکھ کر پورے جسم کی کیفیات سے واقفیت حاصل کر لینے کے دعوے دار بھی نہ تھے، مگر ایک معقول، عملی اور روزمرہ کے معمولات کی بنیاد پر طبی نتائج اخذ کرنے والے وہ ایک غیر معمولی طبیب ضرور تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ چونکہ مفردات سے وہ خود اپنی دوائیں نہیں بنوایا کرتے، اس لیے مختلف طبی کمپنیوں کی پیٹنٹ دواؤں کی بنیاد پر اپنے نسخے سے مطابقت دیکھ کر وہ دوائیں تک تجویز کر دیا کرتے ہیں۔ بعض امراض اور دواؤں کے معاملے میں ان کے تحفظات خاصے شدید تھے۔ اس نوع کا ایک تجربہ میرا بھی تھا۔ یورک ایسڈ کے بڑھنے کے باعث میرے پیر کی انگلیوں میں شدید تکلیف شروع ہوئی۔ ڈاکٹروں نے یورک ایسڈ کم کرنے کی دوا تجویز کی اور مجھے فائدہ بھی ہو گیا مگر اس کی بنیاد پر ہمارے فیملی ڈاکٹر سید محمد عاصم رضوی نے گردے کے سارے ٹسٹ کرانے کی تجویز رکھی اور نتیجہ نکلا کہ میرا سیرم کریٹینین ایک ڈیڑھ سے بڑھ کر دو اور ڈھائی تک پہنچ گیا ہے۔ انہوں نے بعض دوائیں تجویز کیں اور میرے معلوم کرنے پر بتایا کہ براہ راست کریٹینین کم کرنے کی کوئی دوا نہیں ہوتی، بس یہ کہ ہم اس کے بڑھنے کے اسباب کو دور کرنے کی دوائیں تجویز کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں، میں نے ڈاکٹر حکیم طیب سے ملاقات کی۔ ساری رپورٹیں دکھلائیں انہوں نے سیرم کریٹینین کے ساتھ بلڈ یوریا پر بھی کافی زور دیا اور کچھ مفردات اس ہدایت کے ساتھ تجویز کیں کہ ان سب مفردات کو کوٹ پیس کر سفوف بنایا جائے اور صبح و شام اس کا استعمال کیا جائے۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، خدا کا کرم ہوا ڈیڑھ دو ماہ کے اندر اندر میرا سیرم کریٹینین نارمل پر آ گیا۔ اس ضمن میں میری کرید پر انہوں نے بتایا تھا کہ انہوں نے چالیس سال کے تجربے اور تلاش و جستجو کے بعد ان دواؤں کی دریافت کی ہے۔ اس سفوف سے متعدد لوگوں کو فائدہ پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک بار ان سے دریافت کیا کہ کیا سیرم کریٹینین کے بڑھانے میں بڑے کا گوشت

(Red Meat) بھی معاون ہوتا ہے؟ وہ بہت طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے، میاں! کیا بتاؤں چونکہ ایلوپیتھی کے ڈاکٹروں کے باوا آدم (بعض مغرب کے ڈاکٹر یا مغربی ماہرین کی ریسرچ) نے انہیں بتا رکھا ہے کہ یہ سارا نقصان بڑے کے گوشت یا ریڈ میٹ کی وجہ سے ہوتا ہے اس لیے وہ خود تو کوئی ریسرچ کرتے نہیں، اپنے قبلہ وکعبہ کے حکم پر وہی پرانا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ ان کم عقل ڈاکٹروں کو اندازہ بھی نہیں کہ وہ اپنے تقلیدی ذہن کی وجہ سے نہ جانے کن چیزوں سے پرہیز کراتے اور نہ جانے کتنے لوگوں کو خدا کی بہت سی نعمتوں سے محروم کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ تقریباً چالیس سال سے ان کے پاس اس بیماری میں مبتلا لوگ آتے رہتے ہیں، جن کی اکثریت غیر مسلموں کی ہوتی ہے جو اکثر گوشت کو ہاتھ لگانا بھی گوارہ نہیں کرتے، صرف سبزی وغیرہ پر گزارہ کرتے ہیں، تو پھر ان کی اکثریت کو یہ بیماری کیوں لاحق ہوتی ہے؟ جب کہ عام ایلوپیتھی ڈاکٹر اس کا سبب بڑے کے گوشت کو بتاتے ہیں۔ پھر وہ غلے اور سبزیوں کی پیداوار کی خاطر استعمال ہونے والی زہریلی کھادوں اور نقصان دہ دواؤں کا ذکر کرتے اور بتاتے تھے کہ جدید طریق پیداوار نے ہماری غذا میں نہ جانے کیسے کیسے مہلک عناصر شامل کر دیئے ہیں، جن سے ہمارا معاشرہ شب و روز دوچار ہے۔

یوں تو حکیم طیب صاحب شروع سے ہی مردم بےزار مشہور تھے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کی اصول پسندی اور سچائی کو مردم بےزاری کا نام دے دیا جاتا تھا۔ وہ غیر ضروری باتیں یقیناً نہیں کرتے تھے، اپنی شرطوں پر جینے کی کوشش کرتے تھے مگر خدا ترسی ان میں غضب کی تھی۔ وہ گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے اپنے گھر پر مریضوں کو دیکھتے اور دوائیں تجویز کرتے رہے اور اکثر بغیر کسی معاوضے اور فیس کے۔ ایک بار بتانے لگے کہ بھئی مجھے مریضوں کی فیس کی چنداں ضرورت تو نہیں مگر لوگ مفت کے علاج کی کوئی قدر و قیمت نہیں سمجھتے اور تصور یہی رکھتے ہیں کہ ڈاکٹر یا حکیم تو مفت میں دستیاب ہے۔ اسی لیے میں کبھی کبھی فیس بھی لینی شروع کر دیتا ہوں مگر کچھ دنوں پر جب مجھ پر وہ فیس اخلاقی بوجھ بننے لگتی ہے تو پھر بلا معاوضہ ہی دیکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔

حکیم صاحب خود سانس کی بیماری میں مبتلا تھے۔اس کے ساتھ دل کا بھی عارضہ تھا۔خدا نے ان کو اپنے نیک بندوں کی طرح خاموشی اور بغیر اذیت کے اُٹھالیا۔اب دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ ان کی روح کو اعلیٰ عِلّیین میں جگہ بھی مرحمت فرمادے ورنہ حقیقت تو یہی کہ اس دار فانی میں ہونا نہ ہونے سے زیادہ بے معنیٰ ہے:

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے
میں کل ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا

حکیم محمد طیب: ایک عبقری انسان

ڈاکٹر محمد خالد صدیقی
سابق ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی

آزاد ہندوستان کے طبّی منظرنامہ میں حکیم محمد طیب کی شخصیت ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔ انہوں نے اپنی ذات کے گرد جو حصار قائم کیا تھا، وہ ان کا خودساختہ تھا، لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ ان کے آس پاس ایسی مخلوق کا گزر نہیں ہو پایا، جو عام طور سے صاحب حیثیت اور اعلیٰ مرتبت لوگوں کی نفسیات میں حلاوت کی چاشنی کو کم کرنے کی منظم کوشش میں لگی رہتی ہے۔ اپنے گرد و پیش سے متاثر ہونا بشری خاصہ ہے۔ یہ اعلیٰ مرتبت لوگ بھی تھوڑا بہت تأثر لیتے ہیں، لیکن جس انسان نے اپنا ماحول خود تشکیل دیا اور اس میں فکری صحت اور ذہنی صالحیت کو برتا اور اس کے تناظر میں بنی نوع انسان کی خدمت کو اپنا نصب العین بنایا، وہ دنیا میں بھی نیک نام رہا اور عقبیٰ کو بھی سنوار لیا۔ چونکہ یہ روش عام نہیں ہے، اس میں بڑی سنگلاخیت ہے، اسی لیے اس راہ کے مسافر ذرا کم ہی نظر آتے ہیں، تاہم جو بھی نظر آتے ہیں، نظروں میں سما جاتے ہیں۔ حکیم محمد طیب بھی نظروں میں سما جانے والی ایک شخصیت تھے۔ انہوں نے اپنی زندگانی کے لیے جو راہ منتخب کی تھی، وہ بڑی سنگلاخ، دشوار گزار اور کٹھن تھی، پنگھٹ کی ڈگر سے بھی زیادہ کٹھن۔

حکیم محمد طیب شاداب زندگی سے کسی قدر رہبانیت کی طرف عمداً گئے تھے۔ یہ رہبانیت ان کو راس آئی یا نہیں؟ یہ ہماری گفتگو میں شامل نہیں ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ ایک منفرد

سوچ کا عبقری انسان کل وقتی طور پر طب یونانی کو مل گیا۔ میں نے اس انسان کی عبقریت کا مشاہدہ اپنی سرکاری ذمہ داریوں کے مختلف ادوار میں، مختلف حیثیتوں سے کیا ہے۔ ایسے انسان کے ساتھ کام کرنا اور اپنی ضرورت کے اعتبار سے کام لے لینا کس قدر دشوار ہوتا ہے، اس کو کچھ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے ان جیسے عبقریوں کے ساتھ کبھی کام کیا ہو۔ مجھے اس بات پر فخر ہے کہ حکیم محمد طیب کے ساتھ میرے برسوں پرانے مراسم رہے ہیں۔ ۱۹۷۰ء سے ۲۰۱۰ء تک، کسی انقطاع کے بغیر، میری ملازمت کے ۳۶ برس تک، بڑی شدت سے، اپنی تمام تر توجہات اور ترجیحات کے ساتھ اور میری سبکدوشی ۳۰/ جون ۲۰۱۰ء کے بعد بھی، تادم آخر۔

حکیم محمد طیب وسیع المطالعہ، خوش فکر، شاداب ذہن معلم، منتظم اور معالج تھے۔ طبی مبادیات اور بقراطی نظریات ان پر اپنی تمام تر کیفیات کے ساتھ منکشف تھے۔ علمی استحضار نے ان کی شخصیت کو اور بھی نکھار دیا تھا۔ کسی بھی علمی، تحقیقی موضوع پر ان کی آراء کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ وہ اپنا موقف بڑے مدلل اور سائنٹیفک انداز میں رکھتے تھے۔ ہم نے ان کی خدمات ارتجالاً بھی حاصل کی ہیں اور طویل مدتی بھی اور ہر مرحلہ میں ان کے یہاں صحتِ فکر وفن ملی ہے۔ طبی ادب عالیہ سے متعلق کوئی مسئلہ ہو یا معالجاتی تحقیق کی راہ کی کوئی دشواری، یا پھر دواؤں کی شناخت اور ان کی معیار بندی، حکیم محمد طیب کی رائے عقدہ کشا ہوتی اور ان کی فکریات سنگ میل کا کام کرتیں۔

سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن سے حکیم محمد طیب کی وابستگی مختلف حیثیتوں سے اس کے تاسیسی دور سے ہی تھی۔ وہ اس کی گورننگ باڈی اور سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی اور دوسری متعدد سب کمیٹیوں کے فعال رکن رہے۔ ۱۹۹۷ء میں سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی کے چیرمین مقرر ہوئے۔ فارماکوپیا کمیٹی سے ان کی وابستگی نے اس کو اعتبار بخشا تھا۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی (مشترکہ کونسل) کے دور میں ۱۹۷۰ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں جب کلینکل ریسرچ یونٹ کا قیام عمل میں آیا تو وہ اس کے پہلے پروجیکٹ آفیسر مقرر ہوئے اور جب اس یونٹ کو ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی شکل

دی گئی تو اس میں بھی ان کی خدمات بحیثیت پروجیکٹ آفیسر حاصل تھیں اور وہ ۱۹۹۵ء تک اس منصب پر فائز رہے۔

حکیم محمد طیب کی رہنمائی اور مشوروں سے کونسل نے متعدد مجالِ علم و تحقیق میں فتوحات حاصل کیں۔ وہ تقریر اور تحریر، دونوں میں یکتا تھے، ان کی تقریر اور تحریر میں جامعیت ہوتی، وہ الفاظ کی اہمیت جانتے اور مختلف سمتوں میں ان کے کھلنے کے امکانات سے واقف تھے، ان کی تحریروں پر نثری نظم کا گماں ہوتا۔ ان کی فکریات میں کسی طرح کا الجھاؤ نہیں تھا، اسی لیے ان کی باتوں میں اثر ہوتا، تبادلۂ خیال میں ان کا موقف واضح اور ہدف متعین ہوتا تھا۔ اپنی گفتگو کو مؤثر بنانے کے لیے اکابر کے اقوال اور معتبر شعراء کے کلام اختصاص کے ساتھ پیش کرتے اور ساری محفل ہمہ تن گوش ہو جاتی۔

حکیم محمد طیب کا علمی استحضار لائق ستائش تھا۔ میں نے بارہا ان کی اس صلاحیت سے فائدہ اٹھایا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک مبسوط تحقیقی کام ان کی خدمت میں شام کو علی گڑھ اس التماس کے ساتھ بھیجا کہ صبح تک اس پر کمنٹس مل جائیں۔ انہوں نے اسی شب اس تحقیق پر جس علمی وقار اور مضبوط دلائل کے ساتھ اپنے خیالات قلم بند کیے کہ ان کو پڑھ کر ورطۂ حیرت میں پڑنے کی اب میری باری تھی۔

حکیم محمد طیب کا مقام بحیثیت معالج بہت بلند تھا۔ انہوں نے علاج معالجہ کے حوالہ سے مضمحل سوچ اور بیمار انسانیت کی مسیحائی کی ہے۔ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کے زیر نگرانی انہوں نے طب کے دبستانِ لکھنؤ کے اسرار و رموز سیکھے تھے اور مفرد دواؤں کے ذریعہ عسیر العلاج بیماریوں کا میاب علاج کر کے شہرت اور ناموری حاصل کی۔ ان کے مطب میں مریضوں کا غیر معمولی ہجوم ہوتا، جو ان کی تلخ و تند سن کر بھی خنداں اور فرحاں رہتا، حکیم محمد طیب کی کڑوی، کسیلی باتیں ان کے کانوں میں گویا رس گھولتیں۔ اس کی وجہ یہ تھیں کہ مریضوں سے ان کا رشتہ ایک مونس و غم خوار حکیم اور دردمند طبیب کا تھا، اس میں کسی بھی طرح کے سود و زیاں کو دخل نہ تھا، انسانیت کا پاس اور وضع داری تھی۔ اسلامی اصولوں کی پاسداری تھی، لیکن آج کی بڑی

سچائی یہ ہے کہ ان کے انتقال سے معالجہ کے میدان میں جو خلاء پیدا ہوا ہے، اس کی بھرپائی مستقبل قریب میں مشکل نظر آتی ہے۔

حکیم محمد طیب کی آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس سے بھی فعال وابستگی رہی ہے۔ وہ اس کی میٹنگوں اور جلسوں میں پابندی سے شریک ہوتے تھے۔ ایک دور میں کانفرنس کے اجلاس میں ان کے تحقیقی مقالات کی دھوم رہتی تھی۔ جماعتِ اطباء ہمہ تن گوش ان کے مقالات سنتی اور مقدور بھر استفادہ کرتی۔ کانفرنس میں پڑھے گئے بعض مقالات کتابی شکل میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ حکیم محمد مختار اصلاحی کی صدارتی مدت کی تکمیل کے بعد ۲۰۰۵ء میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے اجلاس عام منعقدہ حیدر آباد میں کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا اور ۲۰۱۰ء تک وہ اس کے صدر نشیں رہے۔

حکیم محمد طیب کی شخصیت میں زاہد خشک کی سی بیزاری نہیں تھی، وہ اپنے بعض معاصر اطباء سے بڑا بے تکلف معاملہ رکھتے تھے۔ تکنیکی میٹنگ ہو یا خواص کی محفل، وہ کسی طبیب کو ٹارگیٹ بنا کر ایسے ایسے فقرے اچھالتے کہ محفل زعفراں زار ہو جاتی۔ اس وقت بالکل پتہ نہ چلتا کہ یہی حکیم محمد طیب ہیں، جن کی 'مزاجی یبوست' کے قصے ہر خاص و عام کی زبان پر ہیں، ایسا بھی نہیں کہ طنز و مزاح کا یہ معاملہ یکطرفہ ہوتا۔ حکیم محمد طیب بھی اس کا ہدف بنتے اور خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔

بحیثیت ماہر تعلیم حکیم محمد طیب کی خدمات بہت وقیع ہیں۔ طبی مبادیات اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ ان پر منکشف تھے۔ طبی مباحث میں کہاں 'صفا' ہے اور کہاں 'کدر'، وہ خوب جانتے تھے۔ ان کی تدریس کا انداز منفرد تھا، خشک سے خشک موضوع کو بہت دلچسپ اور افادی بنا دیتے تھے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ قدیم طبی ادب میں غیر معمولی بصیرت کے ساتھ ایلوپیتھی پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اسی لیے جب بھی نصاب تعلیم پر نقد و نظر کی بات ہوتی تو وہ قدیم کی معنویت کے تناظر میں عصری حسیت کے ساتھ اپنا موقف رکھتے تھے۔ طب یونانی میں پوسٹ گریجویٹ نصابِ تعلیم کی تشکیل اور اس کے نفاذ میں ان کی خدمات بہت وقیع ہیں۔

اس مرحلے میں ان کا 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا اصول بہت وجدانی تھا۔ انہوں نے اس تعلق سے جو بھی عملی اقدام کیے، ان میں طب یونانی کے مباحث اپنی جملہ کیفیات کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

آج حکیم محمد طیب صاحب ہمارے درمیان نہیں ہیں، لیکن ان کی فکریات ہمارے لیے مشعل راہ ہیں، جن کی روشنی میں چل کر بیمار انسانیت کو شفاء کی بشارت دی جا سکتی ہے۔

حکیم محمد طیب سے 'یونانی کونسل' کے روابط

پروفیسر حکیم سید شاکر جمیل
ڈائرکٹر جنرل، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، نئی دہلی

۱۸۵۷ء میں برطانوی استیلاء کے خلاف شروع ہونے والی جہدِ آزادی نو دہائیوں کے بعد ۱۹۴۷ء میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی، اس کوشش کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں 'سودیسیت' کو ترقی کے آزادانہ مواقع میسر ہوں، چنانچہ آزادی کے بعد حکومت ہند نے ۱۹۶۹ء میں پارلیمانی ایکٹ کے ذریعہ دیسی طبوں میں تحقیق کے فروغ کے لیے 'سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی' کے نام سے ایک مختار ادارہ کی تشکیل کی، ۱۹۷۸ء میں حکومت نے ایک اہم فیصلہ کے ذریعہ اسے تقسیم کرکے ہر دیسی طریقۂ علاج کے لیے ایک علاحدہ کونسل مختص کردی۔

حکومت تو بس موقع ہی فراہم کرسکتی تھی، جو اس نے کردیا تھا، اب باری اہل فن کی تھی، اس لیے کہ کام تو انہیں کو کرنا تھا، مگر ان کے لیے یہ ایک ایسا میدانِ عمل تھا، جس کا ان کے پاس اب تک کوئی تجربہ نہیں تھا۔ فنّی تقاضوں کی روشنی میں تحقیق کے خطوط متعین کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس مشکل سے سبھی دیسی طبوں کے حاملین دوچار تھے، یہ مسئلہ یونانی اطباء کے سامنے بھی تھا، اسے حل کرنے کے لیے صرف فنّی واقفیت کافی نہیں تھی، بلکہ کئی اور صلاحیتیں بھی مطلوب تھیں، یعنی فن کے گہرے شعور اور عصری حسیت سے آگہی کے ساتھ وِجدان سے

بہرہ ور ایک ذہن کی بھی ضرورت تھی۔ ان اوصاف کے اجتماع کے بغیر منزل کی ڈگر ڈھونڈ پانا ممکن نہیں تھا۔ یہ سی سی آر یو ایم کی خوش نصیبی تھی کہ اسے اس مشکل گھڑی میں حکیم محمد طیب اور حکیم شکیل احمد شمسی کی شکل میں دو شخصیات مل گئیں، ان کی رہنمائی سے یونانی کونسل کے لیے تحقیق کی راہ کا تعین کافی آسان ہو گیا۔

حکیم محمد طیب صاحب کی طبّی صلاحیتوں سے ان کے زیرِ علاج رہے مریضوں اور ان کے درس سے مستفید ہونے والے طالب علموں کے ساتھ کئی علمی اداروں نے استفادہ کیا ہے، موخر الذکر زمرہ میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی کا نام سرفہرست ہے۔ کونسل سے ہمیشہ طیب صاحب کا گہرا ربط رہا ہے، اس کی فکری رہنمائی کے ساتھ، وہ بڑی دلچسپی سے اس کے عملی منصوبوں میں شریک رہے ہیں۔

جو لوگ تحقیق کی معرفت رکھتے ہیں، وہ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ریسرچ کا سب سے اہم مرحلہ موضوع کا انتخاب ہوتا ہے، اگر اسے صحیح طور پر عبور کر لیا جائے تو اس کا تقریباً ساٹھ فیصد حصہ از خود انجام پا جاتا ہے، اس لحاظ سے کونسل کے کاموں میں حکیم طیب صاحب کا بڑا حصہ رہا ہے کہ قیام کے ابتدائی دنوں میں، اس کے تحقیقی منصوبوں کے بیشتر موضوعات انہیں کے سُوجھائے ہوئے ہیں۔ کونسل کے کلینکی کاموں میں 'برص' میں آطریلال کا تجربہ بے حد معرکۃ الآراء کام ہے، اس موضوع کا انتخاب اور اس کے کام کا خاکہ حکیم صاحب نے وضع کیا تھا۔ موضوعات کی نشاندہی کے علاوہ انہوں نے کونسل کو کئی نسخے بھی عطا کیے تھے، جن پر کونسل نے تجربات کیے۔

جب ۱۹۷۷ء میں حکومت ہند نے تیسری فارما کوپیا کمیٹی کی تشکیل کی تو حکیم طیب صاحب اس کے رکن تھے اور اس کے ذیل میں قائم فارمولری کمیٹی کے بھی ممبر نامزد کیے گئے تھے۔ ۱۹۷۸ء میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کو سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ کیا گیا، جب اس کا میمورنڈم آف ایسوسی ایشن تیار ہوا تو اس کے دستخط کنندگان میں حکیم طیب صاحب بھی تھے، وہ کونسل کی گورننگ باڈی کے اساسی ارکان میں تھے، ایک

عرصہ تک وہ اس حیثیت سے کونسل سے وابستہ رہے، اس کے علاوہ وہ کونسل کی سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی کے بھی ممبر رہے اور ۱۹۹۷ء میں اس کمیٹی کی چیئرمین مقرر ہوئے اور تین سال تک اس عہدہ پر فائز رہے۔

'جہانِ طب' سی سی آر یو ایم کا سہ ماہی علمی تحقیقی جرنل ہے، یہ جون ۱۹۹۹ء سے شائع ہو رہا ہے، حکیم طیب صاحب اس موقر جریدہ کی مجلس مشاورت کے تاسیسی رکن تھے اور دمِ آخر تک اس میں شامل رہے۔

علی گڑھ میں کونسل کے تحقیقی منصوبوں کا آغاز لٹریری ریسرچ اور کلینیکل اسکریننگ کی صورت میں ہوا، پھر سروے آف میڈیسنل پلانٹ اور ڈرگ اسٹینڈرڈائزیشن کی یونٹیں قائم ہوئیں، ان تمام شعبوں کو یکجا کر کے انہیں ایک علاقائی تحقیقاتی مرکز کی شکل عطا کرنے میں حکیم طیب صاحب کی مساعی کا اہم کردار رہا ہے، ان کی سرپرستی سے اس انسٹی ٹیوٹ کو استحکام اور ترقی کے مواقع ملے، وہ اس کے پہلے کوارڈینیٹر کے علاوہ ابتدائی ایام میں جب یہ یونیٹوں کی صورت میں تھا، انہوں نے پروجیکٹ آفیسر کے طور پر اس کے علمی اور کلینکی کاموں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔ انہیں کی کوششوں سے علی گڑھ ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو یونیورسٹی کے کیمپس میں ایک وسیع قطعۂ اراضی پر واقع عمارت بھی ملی، جس میں یہ آج تک قائم ہے۔ جس زمانہ میں طیب صاحب علی گڑھ کی لٹریری ریسرچ یونٹ کے پروجیکٹ آفیسر تھے، ان کی نگرانی میں، امراض قلب، کے موضوع پر ایک اہم تالیفی کام شروع ہوا، جسے حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی نے انجام دیا ہے، یہ کتاب ۱۹۹۵ء میں کونسل سے شائع ہوتی ہے۔

کونسل کے لیے حکیم طیب صاحب کی شخصیت ایک سرپرست جیسی تھی، وہ ہمیشہ اسے اپنی بزرگانہ شفقتوں سے نوازتے رہے ہیں، کونسل سے ان کا تعلق بے غرض اور بے لوث تھا، یہی وجہ ہے کہ وہ کبھی اپنی عنایتوں کے عوض، کسی منفعت کے طالب نہیں ہوئے، حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے، مگر طیب صاحب کا معاملہ مختلف تھا، شاید اسی لیے وہ زمانے کی عام بھیڑ سے ممتاز تھے۔ طیب صاحب سیمینار اور ورکشاپ جیسے بڑے پروگراموں کی صدارت یا اس میں

بطورِ مہمان خصوصی و اعزازی مدعو کیے جاتے ، پھر بھی مرضی نہ ہوتو منع کر دیتے تھے، ۴-۳ر مارچ ۲۰۱۳ء کو ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ میں، اس کی سلور جوبلی تقریب کی صدارت کے لیے انہیں دعوت دی گئی تو انہوں نے اسے قبول کرنے سے معذرت کرلی، حالانکہ اس پروگرام کے انعقاد کے سلسلہ میں جب بھی ان سے مشاورتی تعاون طلب کیا گیا، ان کی طرف سے مثبت ردعمل کا اظہار ہوا اور ہر موقع پر انہوں نے اپنے گرانقدر مشوروں سے نوازا۔

حکیم محمد طیب صاحب کونسل کے معماروں میں تھے، وہ ہر موقع پر اس کے تعاون کے لیے پیش پیش رہے اور ہمیشہ اسے اپنی بزرگانہ شفقتوں سے نوازتے رہے، ان کی وفات کونسل کے لیے ایک ذاتی خسارہ ہے، انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کونسل نے ان کی ایک قلمی یادگار 'کتاب العشر مقالات فی العین' کو اپنے باز اشاعتی منصوبہ میں شامل کیا ہے، یہ جلد ہی منظر عام پر آجائے گی، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم محمد طیب صاحب کی فنی خدمات کو ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین!

حکیم محمد طیب بحیثیت مصنف، مؤلف اور مترجم

حکیم وسیم احمد اعظمی

ڈپٹی ڈائرکٹر (یونانی) سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ

بیسویں صدی کے ہندوستان میں طب یونانی کے حوالہ سے حکیم محمد طیب (۲۰۱۳ء — ۱۹۳۲ء) کا نام بہت ممتاز ہے۔ یونانی طب کی ترویج و اشاعت میں ان کی خدمات اہم ہیں، ایک معلم کی حیثیت سے ان کا مقام بہت بلند ہے، ایک منتظم کی حیثیت سے ان کی مساعی مثالی ہیں، ایک معالج کی حیثیت سے ان کی حذاقت مسلم ہے، ایک مصنف کی حیثیت سے ان کے علمی آثار کو اعتبار حاصل ہے، ایک مترجم کی حیثیت سے ان کے یہاں صحت بیان اور جدت ہے اور ایک طبّی مورخ کی حیثیت سے ان کی تحریروں میں قطعیت ہے۔ علم و عمل اور ذہن و زندگی کے اتنے متنوع مجال میں انہوں نے تفرد کی جو راہ نکالی ہے، وہ صرف ان ہی کا خاصہ ہے، انہوں نے جس میدان میں قدم رکھا، اس میں منفرد اور یکتا نظر آئے ہیں۔

حکیم محمد طیب کا میں قریبی مشاہد کبھی نہیں رہا ہوں، ان سے میری کوئی براہ راست ملاقات بھی نہیں رہی ہے، البتہ وہ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۶ء کی میری سلیکشن اور ڈیپارٹمنٹل پروموشن کمیٹیوں کے رکن رہے ہیں، اس مناسبت سے میں نے عربی، فارسی، اردو زبان و ادب اور طب و حکمت سے متعلق ان کے کچھ سوالوں کے جواب دیئے ہیں، پسینہ میں نہائے جسم، کپکپاتے وجود، بے قابو تنفس، منتشر خیالات اور بے ربط جملوں کے ساتھ۔ ان تمام انفعالات

اور کیفیات کے باوصف انھوں نے میرے سلیکشن اور پروموشن کو یقینی بنانے میں 'یقیناً' حصہ لیا ہوگا، اسی لیے تو میں اس محکمہ میں بنا ہوا ہوں۔

۱۹۸۰ء تک میں نے حکیم محمد طیب کی صرف ایک تالیف 'قانونِ صحت' ہی پڑھی تھی، وجہ یہ کہ وہ نصابِ تعلیم میں شامل اور بآسانی دستیاب تھی۔ ۱۹۸۰ء کے انٹرویو کمیٹی کے ایک رکن کے سوال آپ نے 'حفظانِ صحت' کے لیے کن کتابوں کا مطالعہ کیا؟' میں نے 'قانونِ صحت' کا نام لے لیا، دوسرے سوال میں کہ وہ کتاب کیسی لگی؟ میں نے زبان وبیان کے بارے میں 'کچھ باتیں' عرض کر دیں اور بس۔ اُن دِنوں کی حقیقت کچھ یہ تھی کہ ہندوستان کے چند معتبر اور بیشتر نامعتبر رسالوں اور جریدوں میں میرے کم وبیش ۲۷ مضامین شائع ہو چکے تھے اور سب سے بڑھ کر اُس دور میں اردو ادب میری تحریروں کی زد میں تھا اور کچھ اس کا زعم بھی تھا، یہ بات اور کہ میں اس وقت (اور کسی حد تک آج بھی) بندھے ٹکے اسلوبِ نگارش پر عمل پیرا تھا۔ یہ بات تو جملۂ معترضہ کے طور پر آ گئی۔ 'کچھ باتیں' کیا عرض کیں کہ اُن محترم رکن کمیٹی نے ایک دوسرے ہم منصب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا 'کچھ سنا آپ نے؟' میں نے سطور بالا میں اپنی جن کیفیات کا ذکر کیا ہے، وہ دراصل 'کچھ سنا آپ نے؟' کے ردعمل میں طاری ہوئی تھیں۔ اس انٹرویو کے فوراً بعد مجھ پر واضح ہو گیا تھا کہ 'کچھ سنا آپ نے؟' کہہ کر سے میرے انٹرویو میں 'رنگ' بھرنے والے حکیم سید محمد خلیفۃ اللہ صاحب مدظلہ اور ان کے مخاطب پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب تھے۔ دونوں طب یونانی کی معتبر آواز، اس کے نقیب، داعی اور مبلغ۔

یونانی طبّی کونسل میں ملازمت کے دوران مختلف میٹنگوں اور سیمیناروں میں حکیم محمد طیب کو دور سے دیکھنے اور بغور سننے کا موقع ملا، لیکن 'بسوز د پرم' کے خوف سے کبھی قریب جانے کی ہمت نہیں جٹا پایا، اسی لیے حکیم محمد طیب مرحوم کے بارے میں جب مجھے کچھ لکھنے کا حکم ہوا تو میں نے ان کی تصنیفی اور تالیفی خدمات کے جائزے کے لیے ہی خود کو آمادہ پایا۔

حکیم محمد طیب کا شمار طبِ یونانی کی عبقری شخصیتوں میں ہوتا ہے، انھوں نے اپنی انتہائی مصروف اور کثیر الجہات زندگی میں سے تصنیف وتالیف اور ترجمہ کے لیے بھی وقت نکالا تھا،

لیکن ذرا کم کم، تاہم انہوں نے جو بھی علمی سرمایہ چھوڑا ہے، اس میں خوب خوب 'کیفیت' ہے۔ جس سے 'کمیّت' کی شکوہ سنجی کی بڑی حد تک بھرپائی ہو جاتی ہے۔

حکیم محمد طیب کی جو کتابیں میرے مطالعے میں رہی ہیں، ان میں چین میں قدیم طب (۱۹۵۵ء)، کتاب العشر مقالات فی العین، اردو ترجمہ (۱۹۵۷ء)، قانونِ صحت (۱۹۶۱ء) A Critical Evaluation of the Works of Yusuf Bin Muhammad، Yusufi (۱۹۷۰ء)، اطبائے قدیم کے کلینیکی مشاہدات (۱۹۷۱ء) اور Philosophy of Greco-Arabian Medicine (۱۹۸۳ء) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دیگر معاصر مصنفین کی کتابوں پر ان کے 'تقدمے' اور چند مقالات بھی مطالعے میں رہے ہیں۔

چین میں قدیم طب:

حکیم محمد طیب کی دستیاب کتابوں اور کتابچوں میں اس کو زمانی تقدم حاصل ہے، نیشنل پرنٹرس کمپنی علی گڑھ سے طبع اور شعبۂ نشر و اشاعت، دواخانہ طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع یہ ۱۴ صفحاتی کتابچہ دراصل چائنا پکٹوریل، مارچ ۱۹۵۵ء میں شامل لوچن چون، ڈائرکٹر چینی طب کے مقالہ کا اردو ترجمہ ہے، جس میں انہوں نے چینی طب اور علم الادویہ کا جائزہ لیا تھا۔ حکیم محمد طیب کے اس ترجمہ کے محرک وہ عوامل ہیں، جو چینی حکمرانوں میں وہاں کے قدیم نظامِ علاج کو فروغ دینے کے سلسلے میں ملتے ہیں اور جب وہ اس کا تقابل آزاد ہندوستان میں دیسی طبوں کی صورتِ حال سے کرتے ہیں تو شدید مایوسی کا شکار نظر آتے ہیں۔ حکیم محمد طیب انگریزوں کے تسلط سے پہلے کے ہندوستان کی صحتی صورتِ حال اور دیسی طریقۂ علاج کی پذیرائی کا مختصر جائزہ لیتے ہوئے اس کتابچہ میں 'تعارف' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> ''آزادی ملنے کے بعد مناسب تو یہ تھا کہ ہم اپنی پرانی تواریخ کو پھر منظرِ عام پر لاتے، خود اپنے پیروں پر کھڑے ہوتے، تاکہ دنیا دیکھتی کہ ہم آزادی کی صلاحیت رکھتے تھے، مگر افسوس یہ رہا کہ ہم پھر انہیں کی ایجادات پر فخر کرتے رہے۔ ہمارے ملک کی سربرآوردہ ہستیوں کا خیال ہے کہ دیسی طریقۂ علاج غیر محقق ہے۔ اس کو عوام کی صحت

کا ضامن نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ایلوپیتھی طریقۂ علاج سائنٹیفک ہے۔ ذرا غور فرمایئے! اگر یہ لوگ دیسی طریقۂ علاج کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کر لیتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ بنیادی طور پر کون سی طب سائنٹیفک ہے؟ اور فرض کیجیے کہ دیسی علاج میں کچھ خامیاں تھیں بھی تو اس بات کی ضرورت تھی کہ جمہوری راج ان کی جانچ پڑتال کر کے اپنے قدیم طریقۂ علاج کو زیادہ سے زیادہ سائنٹیفک بنانے کی کوشش کرتا، نہ کہ دوسروں پر فخر کرتا۔'' (۱)

حکیم محمد طیب کی ۱۹۵۵ء کی اس تحریر کے بعد سے آج ۲۰۱۳ء تک میں بظاہر صورتِ حال کچھ بدلی ہوئی اور بہتر نظر آتی ہے، لیکن جب ہم مالیاتی اعداد و شمار کے تناظر میں محکمۂ آیوش کا ایلوپیتھی سے تقابل کرتے ہیں تو حقیقت تاریک تر، بلکہ مہیب تر ہو جاتی ہے۔ غلطیاں کہاں ہو رہی ہیں اور تن آسانیاں کیوں کر راہ پا رہی ہیں؟ اس پر بھی سنجیدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

کتاب العشر مقالات فی العین (اردو ترجمہ):

حنین بن اسحاق کی کتاب کا یہ اردو ترجمہ ۱۶۴ صفحات پر مشتمل ہے اور شعبۂ تصنیف و تالیف، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے زیر اہتمام، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ سے ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا ہے۔ دراصل یہ اردو ترجمہ ڈاکٹر میکس مائر ہوف کے ایڈٹ کیے ہوئے متن اور اس کے انگریزی ترجمہ پر مبنی ہے اور طب کے بیش قدر ورثہ کی بازیافت اور اہم اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ حکیم محمد طیب نے اس میں علم العین کے حوالہ سے انتہائی اہم اطلاعات فراہم کی ہیں اور کسی بھی مجال علم میں تحقیقی رشتوں کی تلاش کے لیے اس عہد کے حکمرانوں کے ذہنی اور فکری رجحانات اور سماجی و سیاسی حالات اور ان کے مطالبات کے جائزے کو بھی لازمی قرار دیا ہے۔ اس کتاب کے 'مقدمہ' میں وہ لکھتے ہیں:

''کسی دور کے لوگوں کو الزام دینے سے پہلے نقاد اس دور کے کلی حالات کا جائزہ لے لیا کریں اور پھر رائے ظاہر کیا کریں تو ناحق ایمان داری کا خون نہ ہو۔ علوم کی ترقی کا انحصار بہت کچھ حکومت کی سرپرستی اور سماج کے تعاون پر ہوا کرتا ہے۔ بادشاہوں کی

تلون مزاجی اور نیم پاگل رویے، فتنہ و فساد اور بے جا ہوس ملک گیری، کہیں مذہب کے علم برداروں کے غلط فتوے۔ غرض ایسے تمام ناگوار، نقصان رساں ماحول میں علم طب کا گلا گھونٹا جا رہا ہے۔ مگر اس کے باوجود متقدمین کے روشن دماغ دوسرے علوم کی طرح علم طب کی وہ ٹھوس بنیادیں رکھ گئے کہ آج تک دنیا انہیں ہلا نہ سکی اور قرطاس کی چھاتیوں پر اطبائے قدیم اپنے بیش بہا نظریات اور بے نظیر معالجہ کے نقوش نہ چھوڑے ہوتے تو آج دنیا ہمارے وجود سے قطعاً انکار کر دیتی۔''(۲)

حکیم محمد طیب کی مندرج بالا تحریر بہت بامعنیٰ ہے اور اپنے قاری کو ہم خیال بنا کر اپنے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے پر مجبور کرتی ہے۔ ترجمہ نگاری میں پیش آمدہ دشواریوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''کسی دوسری زبان سے ترجمہ کرنا آسان نہیں۔ کسی زبان کا ماہر اپنے مخصوص انداز میں کسی مفہوم کو کم از کم الفاظ کی ترکیب سے ادا کر دیتا ہے۔ ترجمہ کرنے والا اگر اس کے منھ سے اس کی زبان بن کے بولتا ہے تو خیر، ورنہ ترجمہ غارت، بات کہیں سے کہیں پہنچتی ہے اور اگر لفظی ترجمہ کیا جائے تو محاوروں کی جان جائے اور ایسی ناہموار عبارت پلے پڑے کہ اصل غنیمت، مگر ترجمہ سے باز آئے۔ بہر حال اس کشمکش میں کوئی سلیس عبارت پیش کرنا کہیں کہیں پر تو جوئے شیر لانا ہو جاتا ہے۔''(۳)

اپنی لسانی صلاحیت اور ترجمہ نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں کسی زبان کا ماہر نہیں، لہٰذا اچھے ترجمہ کی امید ہی بے کار ہے، حتیٰ الامکان میں نے ترجمہ کو سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے یہ بھی خیال رکھا ہے کہ اصل عبارت کا مفہوم اپنی جگہ رہے، مگر عبارت کو جہاں تک ہو سکا ہے بامحاورہ کرنے کی سعی کی ہے، خواہ جملہ میں کافی الفاظ اضافہ کرنے پڑے ہوں۔''(۴)

اس کتاب کے مقدمہ میں حکیم محمد طیب نے فنِ طب کے ساتھ ساتھ تاریخِ طب سے بھی بھرپور آگہی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کتاب کے اردو ترجمہ سے پہلے انہوں نے یقیناً علم العین کے ادبِ عالیہ کا جائزہ لیا ہوگا، اسی لیے اس ترجمہ میں حنین بن اسحاق العبادی (وفات: ۸۷۷ء)

کے علمی تسامحات کے ساتھ میکس مائرہوف کی فروگذاشتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، وہ حنین کے دسوں مقالات کا اختصار سے جائزہ لیتے ہوئے پہلے مقالہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''پہلے مقالہ میں آنکھ کی تشریح کے اذکار میں وہ تمام غلطیاں موجود ہیں، جو جالینوس کی تشریح میں موجود تھیں اور جو کم وبیش چودہ سو برس تک دہرائی جاتی رہیں، مثلاً عدسہ، مقلۂ چشم کے وسط میں بتایا گیا ہے اور بصارت کا اہم ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔ آنکھ کے دوسرے طبقات اور رطوبات کے بارے میں حنین کہتا ہے کہ یہ عدسہ کی حفاظت اور تغذیہ کے لیے تخلیق کیے گئے ہیں۔ شبکیہ کو مصنف عصبِ بصری کا آخری منتشر حصہ تصور کرتا ہے، مگر اس طبقہ کی بصارت کے سلسلہ میں اصل نوعیت کا ذکر وضاحت سے نہیں کرتا ہے''۔ (۵)

اس باب میں اطبائے قدیم کی معلومات پر یورپ کے مورخین کی چہ میگوئیوں کا جواب دیتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''یورپ کے مورخین کی یہ رائے قطعی غلط ہے کہ عرب اطباء شبکیہ کی صحیح نوعیت سے بالکل ناواقف تھے۔ حنین نے اگر اس مسلمہ پر وضاحت سے روشنی نہیں ڈالی ہے تو دسویں صدی میں ابن ہیثم یہ اعلان کر چکا ہے کہ شبکیہ دراصل بصارت کے حصول کا مقام ہے، کیوں کہ اس پر پیدا شدہ نقوش اعصابِ بصارت کے ذریعہ دماغ تک پہنچتے ہیں۔'' (۶)

آنکھ کے جن ۶/ عضلات کا جائزہ حنین نے لیا ہے، ان میں سے ایک عضلہ Recractor Bulbi کے بارے میں حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''ایک عضلہ جسے Recractor Bulbi کہتے ہیں، انسانی آنکھ میں ذکر کیا گیا ہے، حالانکہ یہ عضلہ دودھ پلانے والے جانوروں کی آنکھ میں ہوتا ہے۔ یہ تشریحی غلطی زیادہ قابلِ اعتراض اس وجہ سے نہیں ہے، کیوں کہ شروع کے دور میں انسانی لاش چیرنے کی سخت ممانعت تھی، اس کے علاوہ جالینوس اور حنین کا زمانہ تو بہت پہلے کا ہے، حتیٰ کہ سولہویں صدی کے وسط میں ویسلیس جیسا عظیم ماہر تشریح بھی انہیں غلطیوں کا مرتکب ملتا ہے۔'' (۷)

ڈاکٹر میکس مائر ہوف نے اپنے 'مقدمہ' میں اطبائے قدیم کے حوالہ سے بعض غیر محقق باتیں لکھی تھیں، اس کی تنقیح کرتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر مائر ہوف نے اپنے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عرب اطباء عدسہ، شبکیہ اور بصری انعکاسات کی صحیح نوعیت سے واقف نہ تھے، بلکہ ۱۶۰۴ء میں کیپلر نے اس کی صحیح نوعیت واضح کی۔ ڈاکٹر موصوف کا یہ خیال حقائق کے خلاف ہے۔ دنیا کے ماہرین طبعیات اور علم المناظر کے استاد ابن ہیثم، کمال الدین فارسی اور الکندی کے نام فراموش نہیں کرسکتے۔ ابن ہیثم نے بصری انعکاسات کے سلسلہ میں جس طرح فاضلانہ بحث کی ہے، اطبائے قدیم میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ علم المناظر کے انہیں مسائل پر کمال الدین نے اپنی مشہور تصنیف 'تنقیح المناظر' میں کافی وضاحت سے بحث کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جلیدیہ بصارت کا ذریعہ ہے نہ کہ بصارت حاصل ہونے کا مقام، حالاں کہ متقدمین پر یہ الزام ہے کہ وہ جلیدیہ کو کلیتاً بصارت کا مقام ٹھہراتے ہیں۔''(۸)

ڈاکٹر میکس مائر ہوف کی ایک اور غلط فہمی کا ازالہ کرتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''مائر ہوف کی رائے ہے کہ نزول الماء کی ماہیت صحیح طور پر ۱۷۰۶ء تک اندھیرے میں تھی، یہ بات صحیح نہیں ہے۔ اطبائے قدیم بھی اس حقیقت سے کہ جلیدیہ میں تکدر Opacity کی بنا پر نزول الماء لاحق ہوا کرتا ہے، واقف تھے۔ حنین نے اس سلسلہ میں تکدر کا لفظ تو نہیں استعمال کیا ہے، لیکن انداز بیان اور مخصوص الفاظ صاف پتہ دیتے ہیں کہ ان کا مطلب عدسہ کے غیر شفاف ہونے سے ہے۔''(۹)

نزول الماء کے حوالہ سے حکیم محمد طیب کی تحقیق بتاتی ہے:

''نزول الماء کے ذکر میں ایک بات قابل غور ہے اور وہ یہ کہ بظاہر زرق الماء (جسے زیادہ صحیح ماء الاخضر کہا جاسکتا ہے، کیوں کہ Glaucoma کے لفظی معنی اخضر کے ہیں) کا ذکر نہیں ملتا، لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ہم اس بات سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ قدماء اور خود حنین زرق الماء سے واقف تھے۔''(۱۰)

حکیم محمد طیب کی اس تحقیق پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی

(وفات:۱۹۷۰ء) لکھتے ہیں:

''لائق مترجم نے اپنے مقدمہ میں گلاکوما کے متعلق جو تحقیق کی ہے، وہ قابل صد آفریں ہے۔اس سے پہلے یہ خیال تھا کہ متقدمین اطباء گلاکوما سے ناواقف تھے اور بعض کتابوں میں جو اس کا ثبوت ملتا تھا، وہ کسی قدر دھندلا تھا، لیکن مترجم نے اپنے مقدمے میں جو ثبوت پیش کیا ہے، وہ پہلا اور قابل اطمینان ثبوت ہے۔''(۱۱)

حکیم محمد طیب نے کتاب العشر مقالات فی العین میں متقدمین اطباء کی جن بعض تشریحی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی اپنے جواں سال شاگرد کی اس تحقیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''لائق مترجم نے اس کے مقدمے میں حنین بن اسحاق کی یا یوں کہیے کہ متقدمین اطباء کی کچھ تشریحی غلطیوں پر توجہ دلائی ہے۔ان غلطیوں سے ان کے فضل وکمال میں کسی قسم کی منقصت پیدا نہیں ہوتی، کیوں کہ جو صحیح چیزیں انہوں نے بیان کی ہیں، ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہ غلطیاں ان کے مقابلے میں برائے نام سمجھی جاتی ہیں۔''(۱۲)

حنین بن اسحاق کی یہ کتاب ڈاکٹر میکس مارہوف کے لفظوں میں 'اقدم کتاب فی العین' کی حیثیت رکھتی ہے اور حنین کے استاذ یوحنا بن ماسویہ (وفات:۸۵۷ء) کی 'کتاب العین' سے لاکھ درجہ بہتر ہے۔

یہاں اس امر کی صراحت کردی جائے کہ کتاب العشر مقالات فی العین کے ترجمہ میں حکیم محمد طیب نے ڈاکٹر میکس مارہوف کے انگریزی ترجمہ سے اکتسابِ فیض کیا تھا اور مزید صحت کے لیے مولانا فضل اللہ (پروفیسر عربی) حیدرآباد سے بھی رجوع کیا تھا۔علامہ حکیم محمد کبیرالدین نے اس کتاب میں حکیم محمد طیب کے 'مقدمہ' پر نظرِ ثانی کی تھی اور یہ پیش گوئی کی تھی کہ 'اردو دنیا اب ہدیہ سپاس وتشکر، ان (حکیم محمد طیب) کی خدمت میں پیش کرے گی'۔

علم العین اور اطبائے قدیم:

حکیم محمد طیب کی یہ تالیف دراصل ایک طویل مقالہ ہے، جسے انہوں نے ۱۹۵۷ء میں آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، منعقدہ برہان پور میں پڑھا تھا۔اس کی اشاعت علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی پریس سے عمل میں آئی تھی۔ میرے مطالعہ میں یہ مقالہ نہیں رہا ہے۔ اس لیے اس کے بارے میں کچھ لکھنے سے قاصر ہوں، حکیم محمد طیب کی خیر وخبر رکھنے والوں کے مطابق اس کتاب پر حکومتِ اتر پردیش سے انعام بھی ملا تھا۔

قانونِ صحت:

حکیم محمد طیب کی یہ تالیف ۴۰۹ صفحات پر مشتمل ہے اور حکیم سید مختار احمد کامل، ناظم شعبۂ تصنیف وتالیف اجمل خاں طبّیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ سے ۱۹۶۱ء میں طبع ہوئی ہے۔ حکیم محمد طیب نے اس کتاب کا مسودہ ۲۰ ر اکتوبر ۱۹۵۹ء میں شب کے ۱۱ ربجے فائنل کردیا تھا، لیکن اشاعت کی نوبت دو سال بعد آئی۔ یہ کتاب آل انڈیا یونانی طب سیلبس کمیٹی کے حفظانِ صحت کے مجوزہ نصابِ تعلیم کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے۔ اس کے 'تعارف' میں شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی لکھتے ہیں:

"علم حفظان صحت قدیم زمانہ کا ایک کھویا ہوا سرمایہ ہے، جس کے اصول صرف زینتِ قرطاس بن کر رہ گئے، کبھی کبھی یاد آجاتا ہے تو اس کی تلاوت کرلی جاتی ہے۔ اس بھولے ہوئے سبق کو پھر یاد کرنے اور کھوئے ہوئے سرمایہ کو پھر زندہ کرنے کی انتہائی ضرورت ہے۔ پھر قدیم وجدید کی تفریق نے اور بھی قیامت ڈھادی ہے، جس کی وجہ سے قدرتی اصول حفظان صحت پر عمل کرنے سے لوگ قاصر رہتے ہیں اور زیادہ تر مصنوعی اور دوائی تدابیر کی جانب رجحان رکھتے ہیں، آج کل طلبہ کے کورس کے لیے بھی کوئی کتاب ایسی دستیاب نہیں ہوسکی، جس میں قدیم اصول کے ماتحت تمام مفید چیزیں بھی اپنی زبان اور اپنی اصطلاحات میں جذب کرلی گئی ہوں۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہمارے طبّیہ کالج کے ہونہار فرزند اور لکچرر عزیزی حکیم محمد طیب صاحب نے ایسی کتاب تصنیف کی ہے، جس میں قدیم وجدید حفظان صحت کو اپنی زبان اور اپنی مصطلحات میں پیش کیا گیا ہے اور قدیم وجدید کی تفریق کو مٹا کر سچے مسائل کی پیروی کی گئی ہے۔ اس کتاب کے عنوانات ایسے رکھے گئے ہیں کہ قدیم وجدید طلبہ دونوں کے لیے غیر مانوس ثابت نہ ہوں"۔ (۱۳)

اس کتاب کی زبان کے بارے میں شفاء الملک لکھتے ہیں:

''اگر چہ اس کتاب میں کسی کسی جگہ زبان کی روانی اور جملوں کی ترکیب کھٹکتی ہے، جو شاید آیندہ تصانیف میں نہیں پائی جائے گی۔''(۱۴)

حکیم محمد طیب اپنے 'تقدمہ' میں اس کتاب کے تالیفی محرکات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میری یہی کوشش رہی ہے کہ میں آسان سے آسان طریقۂ بیان اختیار کروں اور طبیہ کالجوں کے طلبہ کی ضرورت کو مدِنظر رکھتے ہوئے عنوانات اختیار کروں۔ چناں چہ میں نے ضرورت سے زیادہ تفصیل سے گریز کیا ہے، جدید وقدیم بیانات کو ایک ترتیب سے بیان کیا ہے، الگ الگ خانوں میں تقسیم نہیں کیا ہے۔''(۱۵)

اپنی اس نصابی کتاب کی زبان وبیان کے بارے میں لکھتے ہیں:

''میں کسی زبان کا فاضل نہیں، لہٰذا زبان اور بیان میں خامیوں کا امکان کافی ہے۔ اس کے لیے میں قارئین سے معذرت خواہ ہوں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ ایک فنی کتاب ہے اور اس سے معلومات بہم پہنچانا مقصود ہے۔''(۱۶)

چوبیس ابواب پر مشتمل یہ کتاب مروجہ طبی نصابِ تعلیم کو مدِنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے، طلبہ کے ذہن ومزاج کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے، مباحث کی بے جا طوالت اور غیر ضروری دادِ تحقیق سے عملاً احتراز کیا گیا ہے۔

اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات:

حکیم محمد طیب کی یہ تالیف موضوع اور مشتملات کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے، ۱۹۷۱ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ سے طبع اور شعبۂ تصنیف وتالیف اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے شائع اس ۱۱۶ صفحاتی کتاب نے اردو طبی ادب میں فنی شعور اور طرزِ بیان کی ایک ایسی راہ نکالی کہ اس جیسی کوئی مثال نہ تو پہلے تھی اور نہ آج ہے۔ انہوں نے اس کا انتساب اپنی بیٹی شاذیہ کے نام بہت نیچرل اور جذباتی انداز میں کیا ہے اور یہاں میں اس

کو نقل کرنے سے خود کو روک نہیں پا رہا ہوں:

اپنی بچی شاذیہ کے نام:

جنھیں گوناگوں شرارتوں سے میں روک نہ سکا، جن کے انتھک سوالات کے جوابات سے میں قاصر رہا، جن کے نقش ونگار سے میں مسودہ کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ پھر بھی یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہونچ ہی گیا۔

"طیب"

مباحث کے اعتبار سے یہ کتاب 'انتساب' اور 'تقدمہ' کے علاوہ دس ابواب پر مشتمل ہے، جس کو مؤلف نے 'دفتر' کا نام دیا ہے۔ حکیم محمد طیب نے یہ کلینکی مشاہدات بقراط (وفات: ۳۷۰ ق م)، روفس افسسی (حیات: ۱۰۰ء)، جالینوس (وفات: ۲۰۱ء)، زکریا رازی (وفات: ۹۲۵ء)، اسمٰعیل جرجانی (وفات: ۱۱۴۰ء)، ابن زہر (وفات: ۱۱۶۲ء)، قاضی ابو علی الحسن التنوخی (وفات: ۳۸۴ھ) اور بہاء الدولہ کی کتابوں سے قلم بند کیے ہیں۔

طبی ادبِ عالیہ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ کلینکی مشاہدات کو باقاعدہ منضبط کرنے کی ابتداء ابوالطب بقراط نے کی تھی۔ بقراط کے اس اجتہادی طرزِ عمل کا جائزہ لیتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

> "اس طبیب نے حیرت انگیز حد تک مریض کے حالات، ماحول اور موسم کے اثرات، علامات اور نشانیوں میں روز بروز ہونے والی تبدیلیوں کی، خواہ وہ بہتری کی ہوں یا بدتری کی طرف، ادنیٰ سے ادنیٰ تفصیلات سے فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ یہ کلینکی مشاہدات اس بات پر دال ہیں کہ بقراط پوری طرح اس حقیقت سے پانچویں صدی ق م میں آگاہ ہو چکا تھا کہ طب کا بحیثیت ایک مفید فن کے قیام اور ارتقاء اس بات منحصر ہے کہ مریضوں کے حالات کا تفصیلی طور پر دقتی نظر سے مشاہدہ کیا جائے اور انہیں ضبط تحریر میں لاکر آنے والی نسلوں کے غور وفکر اور ہدایت کے لیے چھوڑ دیا جائے۔" (۱۷)

مطب ومعالجہ کے حوالے سے کلینکی مشاہدات کو قلم بند کرنے کی ضرورت اور افادیت کا احساس دلاتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''کسی مرض کی علامات اور نشانیاں، جس طرح معالجات کی درسی کتاب میں درج ہوتی ہیں، اکثر و بیشتر ہو بہو عملی زندگی میں نہیں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورتوں میں تشخیص و معالجہ طبیب کی وسعتِ نظر، ذہانت اور تجربہ پر منحصر ہوتا ہے۔ اب اگر ایسے غیر معمولی مریضوں کے قصص اور وہ معالجہ جو کسی طبیب نے انہیں انجام دیا ہو، اسی کے قلم سے ضبطِ تحریر میں آجائے تو دوسرے اطباء کے لیے شمع راہ بن سکتا ہے۔ ایسے کلینکی ریکارڈوں کی اہمیت طبِ جدید میں بہت زیادہ ہے، چنانچہ ان قدیم اطباء کی تصانیف کو، جنہوں نے ایسے ریکارڈ محفوظ کردیے تھے، آج بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسا وہی طبیب کر سکتا تھا، جس نے طبی زندگی میں عملی پہلو پر کافی زور دیا ہو۔''(۱۸)

حکیم محمد طیب مزید لکھتے ہیں:

''یونانی و اسلامی طب کی تاریخ میں جس قدر بھی کلینکی مشاہدات دستیاب ہیں، وہ میرے خیال میں ٹھیٹ معالجاتی درسی اسباق پر بھاری بیٹھتے ہیں، اس لیے جس دور میں مرض کی ماہیت پر معلومات محدود تھیں، اس دور میں اگر مریضوں کے حالات از اوّل تا آخر جس طرح مشاہدہ کیے گئے، اسی طرح درج کیے گئے ہوں تو آج کے جدید دور میں جدید معلومات کی روشنی میں ان کا سمجھنا آسان اور دلچسپ ہوتا ہے۔''(۱۹)

مزید لکھتے ہیں:

''محدود ذرائع کے باوجود اطبائے قدیم نے جو گراں قدر اضافات علم طب میں کیے اور جو کچھ ایک فنکار کی حیثیت سے مشاہدات کیے اس سے واقفیت اور ان کو اُجاگر کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ یہی فراشیات جس کا سہرا طب مغرب اپنے سر پر باندھے لیتی ہے، دراصل اطباء قدیم کی مرہونِ منت ہے۔ اس سلسلے میں دوسری زبانوں میں تو کچھ ملتا بھی ہے، مگر اردو زبان میں ایسی کوششوں کا فقدان نظر آتا ہے، قطع نظر اس کے کہ ایسی کلینکی یادداشتوں اور معالجاتی حکایتوں سے ایک معالج کو استفادہ کا موقع ملتا ہے، آج کے دور میں عام احساس کم مائیگی سے بھی جس کا شکار اطباءِ عہد جدید ہیں، کچھ حد تک چھٹکارا ملتا ہے۔''(۲۰)

حکیم محمد طیب نے اپنی اس وقیع تالیف میں اطباء کے سریریاتی مشاہدات اور امراضیاتی

کیفیات کی روشنی میں بین القوسین بڑے حاذقانہ تبصرے بھی کیے ہیں، جن کے تناظر میں ان کے معالجانہ مقام کی توقیت بہت آسان ہو جاتی ہے۔

کتاب کے دفترِ اوّل (پہلے باب) میں بقراط کی 'ابیذیمیا' کے پہلے اور تیسرے مباحث کے ۴۲ قصص المرضیٰ میں سے سات منتخب قصوں کو نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے اور ہر قصہ (رودادِ مریض) کے نقل کے بعد بین القوسین اپنی تشخیصی رائے بھی درج کی ہے۔

دفترِ دوئم (دوسرے باب) میں روفس افسی کے 'مقالہ فیما ینبغی للطبیب ان یسأل عنہ العلیل' کے حوالہ سے مریض اور اس کے تیمارداروں سے استفسارات اور مرض کی تشخیص میں ان کی اہمیت کو اُجاگر کیا ہے۔

دفترِ سوئم (تیسرے باب) میں جالینوس کی تصنیف 'تقدمۃ المعرفۃ' کے حوالہ سے چند واقعات درج ہیں۔

دفترِ چہارم (چوتھے باب) میں زکریا رازی کی تالیف 'الحاوی الکبیر فی الطب' کی مختلف جلدوں میں منتشر رودادِ مرض و مریض کو اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے، چنانچہ پہلی جلد سے ۱۸/واقعات، دوسری جلد سے ۷، تیسری جلد سے ۷، چوتھی جلد سے ۹، پانچویں جلد سے ۲، چھٹی جلد سے ۲، ساتویں جلد سے ۷، آٹھویں جلد سے ۴، نویں جلد سے ۲، دسویں جلد سے ۴، گیارہویں جلد سے ۸، تیرہویں جلد سے ۴، چودہویں جلد سے ۲، سولہویں جلد سے 'قصص المرضیٰ' کے تحت ۳۳، سترہویں جلد سے ۴، انیسویں جلد سے ۹/اور تیئیسویں جلد کے حصۂ اول سے ۴ رودادیں نقل کی ہیں۔

دفترِ پنجم (چوتھے باب) میں علی بن عباس مجوسی (وفات: ۹۹۴ء)، ابوسہل مسیحی (وفات: ۱۰۱۰ء) اور ابن سینا (وفات: ۱۰۳۷ء) کی تصنیفات میں 'قصص المرضیٰ' کے عدمِ ذکر یا ایک آدھ روایتی واقعات کے بیان کی نشاندہی کی گئی ہے۔

علی بن عباس مجوسی کی کتاب 'کامل الصناعۃ' کے بارے میں حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

> "اس میں شک نہیں کہ مجوسی قدماء کی محض نقل نہیں کرتا ہے، بلکہ اجتہاد کی بھی صلاحیت رکھتا ہے اور اس پر عمل پیرا بھی نظر آتا ہے، مگر کلینکی میدان میں وہ بقراط اور رازی کے

طبّی مشاہدات کو نظر انداز کرتا ہے اور اس سلسلے میں وہ رازی کی تقلید کو شاید جائز نہیں سمجھتا ہے۔ جب مجوسی کامل الصناعۃ میں وصایائے بقراط کے ضمن میں ذاتی تجربات پر زور دیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ لازم ہے کہ طبیب شفاخانہ اور مریضوں کے رہائشی مقامات پر برابر حاضری دیتا ہے اور اس کی دائمی مشق انہیں بیماروں کے علاج میں اور انہیں کے امور میں رہے اور یہ التزام اور خبر گیری اس کو تجربہ کار اطباء اور اساتذہ کے ساتھ کرنی چاہیے اور مریضوں کے احوال معلوم کرتا رہے اور ان کی نگرانی اور عوارض پر دھیان دیتا رہے اور جو علامات ظاہر ہوں ان کا بغور مطالعہ کرے.......... جب طبیب اس طرح کرے گا تو اس کا معالجہ احسن ہوگا اور آدمی اس کی طرف رجوع ہوں گے اور اس کے مطب میں ہجوم بیماراں ہوگا۔'' (۲۱)

ابن سینا نے 'عشق' کی تشخیص کا ایک واقعہ لکھا ہے، اسی سے ملتا جلتا ایک واقعہ جالینوس کے یہاں بھی ملتا ہے، ورنہ وہ بذاتِ خود رازی کو درخورِ اعتناء بھی تصور نہیں کرتا، بلکہ طنزیہ کہتا ہے کہ ''رازی کو فلسفہ سے کیا کام؟ اسے تو صرف بول و براز سے واسطہ ہونا چاہیے''۔ اس بابت حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''طبیب وہی ہے جسے بول و براز سے کام ہو، نہ کہ فلسفہ سے، اس لیے کہ طب ایک سائنس ہے جو عمل، مشاہدہ اور تجربہ کی محتاج ہے، اس میں شک نہیں کہ اس عمل کی بنیاد کچھ نظریات اور کلیات پر قائم ہوتی ہے، مگر ان کی حیثیت بنیاد سے آگے بڑھنا مناسب نہیں، چنانچہ رازی جیسا باعمل اور تجربہ پر کاربند طبیب بھی یہ کہتا ہوا پایا جاتا ہے کہ ''قیاس اور مطالعۂ کتب کو چھوڑ کر اگر کوئی صرف تجارب پر بھروسہ کرے تو وہ اپنی رسوائی اور تذلیل کا سامان فراہم کرتا ہے''۔ اب شیخ کا الزام رازی کی نسبت کہاں تک صحیح ہے؟ ہاں اگر محض قیاس اور تخیل سے مریض کے دکھ کا مداوا ہوسکتا ہے تو پھر شیخ کو بھی کلینکی میدان میں وہی شہرت حاصل ہوئی ہوتی، جو رازی کو ہوئی۔'' (۲۲)

حکیم محمد طیب مزید لکھتے ہیں:

''یہ بات مسلم ہے کہ کم از کم مشرق میں رازی کی اتباع قطعاً نہیں کی گئی اور غیر جانب دارانہ کلینکی مشاہدات، جن کی بنیاد رازی نے بقراط کے اتباع میں ڈالی تھی۔ رازی کے بعد

آنے والے عرب وایرانی اطباء نے نظر انداز کر دیا۔ عرب اور ایران کے طبیب اور علماءِ فلسفہ میں سموئے ہوئے نظریات کی طرف طبعاً مائل تھے۔ قانون نہ صرف ان کی اس پیاس کو بجھانے والا ثابت ہوا، بلکہ سارا علمِ طب یکجا پا کر کسی کو فراشیات کا دھیان ہی نہ رہا، جو فنِ طب کی جان ہے۔'' (۲۳)

دفترِ ششم (چھٹے باب) میں محمد بن مروان بن ابی العلاء بن زہر (وفات: ۱۱۶۲ء) کی تصنیف 'کتاب التیسیر فی المداواۃ والتدبیر' کے حوالے سے ۱۳ کلینکی مشاہدات قلم بند کیے ہیں۔ ابن زہر قیاس کے بجائے تجربہ کو طبیب کا رہبر بنانے کی شدت سے وکالت کرتا ہے۔ اس کی کلینکی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''کسی مریض میں جو کچھ قدرتاً ظہور پذیر ہو رہا ہے، اسے انہیں حالات میں مشاہدہ کرنے کا دستور اور ان حالات کا بصورت روزنامچہ یادداشت کے طور پر اندراج کرنا چاہیے، تا کہ کلینکی ریکارڈ کے طور پر محفوظ رہے، اگر مشرق والوں نے اسے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا تو مغرب کے اس نامور طبیب نے اس کو ضروری سمجھا اور اپنی مشہور کتاب 'کتاب التیسیر فی المداوات والتدبیر' میں مریضوں کے اصل ریکارڈ درج کر دیے۔'' (۲۴)

ابن زہر معالجہ میں بندھی ٹکی ڈگر کے راہی نہیں تھے، انہوں نے اختراعی ذہن پایا تھا، حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں ابن زہر پہلا طبیب ہے، جس نے غشاء القلب کے ورم کے بعد رطوبات کے ترشح کا ذکر کیا ہے اور اس کی ماہیت پر بحث کی ہے۔ نہ صرف یہ کہ وہ استسقاءِ قلب سے واقف ہے، بلکہ اس کے بیان کے مطابق یہ پتہ لگتا ہے کہ اس نے غالباً اس رطوبت کو آنکھوں سے دیکھا بھی ہے۔'' (۲۵)

ابن زہر لکھتے ہیں:

''قلب میں ایک رطوبتِ مائی عارض ہو جاتی ہے، جو بول جیسی ہوتی ہے اور یہ غشاء القلب میں محصور ہوتی ہے اور جب ایسا ہوتا ہے تو مریض دبلا ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی موت ہو جاتی ہے، جیسا کہ سارے مدبولین مرجایا کرتے ہیں۔

اب رہ گیا اس کا علاج تو میں نے کبھی ایسے مریض کا علاج نہیں کیا ہے اور جالینوس نے بھی ایسے کسی معالجہ کا ذکر نہیں کیا ہے، اگر اس کا علاج کرنا ہو تو تلطیف، تحلیل اور تجفیف سے کیا جائے۔''(۲۶)

ابن زہر کے اس بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''اندازِ بیان کچھ نامانوس اصطلاحات پر مشتمل ہے، مگر مائیت غشاء القلب تحت الحاد صورت میں پہونچ کر جلتا رہتا ہے اور اس میں مائیت کا ترشح ہو جاتا ہے، ایسی صورت میں قلب پر دباؤ کی وجہ سے نہ صرف عمومی کسل ہوتا ہے، اس لیے کہ افعال قلب میں خلل ہوتا ہے، بلکہ انبساطِ قلب بھی نامحسوس ہو جاتا ہے اور قلب کے اوپر جلد میں ضربان نہیں محسوس ہوتا ہے، اب اگر یہ رطوبت خشک ہوگئی تو انبساط بڑھ جائے گا اور جلد پر حرکاتِ قلب بھی نمایاں ہو جائیں گی۔ ابن زہر نے جس مریض کا مشاہدہ کیا اس کو غالباً رطوبات کا انجذاب ہو چکا تھا اور التصاقات واقع ہو گئے، اسی لیے جلد پر شدید حرکاتِ قلب کا مشاہدہ کیا جا سکا اور مریض کو عمومی ذبول تھا اور ابن زہر کے خیال کے مطابق گرم ہوا میں نکل جانے سے اس کی موت ہوگئی۔ بارہویں صدی کے اس عرب طبیب کا یہ مشاہدہ قابل صد تحسین ہے۔''(۲۷)

دفترِ ہفتم (ساتویں باب) میں مشہور ایرانی طبیب سید اسمٰعیل جرجانی کی کتاب 'ذخیرہ خوارزم شاہی' کے تناظر میں کلینکی مشاہدات کی تشنگی کی بات کی گئی ہے۔ واضح رہے کہ خوارزم شاہ کے حکم سے سید اسمٰعیل جرجانی نے 'شفا خانہ بہاء الدولہ کو بآئین شائستہ ترتیب دیا تھا' اس شفا خانہ سے عملی طور پر وابستگی کے باوجود جرجانی نے اس میں اپنے صرف دو کلینکی مشاہدات قلم بند کیے ہیں۔ حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''ایران کے اس بڑے طبیب کے قلم سے اس کے معالجاتی واقعات اور مریضوں کے قصص پڑھنے کی تشنگی باقی رہتی ہے۔''(۲۷)

دفترِ ہشتم (آٹھویں باب) میں صفوی عہد کے ممتاز طبیب بہاء الدولہ کی تالیف 'خلاصۃ التجارب' کے کلینکی مشاہدات کا جائزہ لیا ہے اور اس کے حوالے سے ۱۶ 'قصص مرضیٰ' نقل کیے ہیں۔ حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''رازی کے بعد خلافتِ عباسیہ میں کوئی طبیب ایسا نظر نہیں آتا ہے، جس نے اپنے ذاتی مشاہدات اور کلینکی قصص کو جزوِ تاریخ بنایا ہو۔ منگول اور تیموری غارت گری کے بعد عہدِ صفویہ میں بہاء الدولہ پھر ایسا طبیب پیدا ہوا، جس نے بقراط، رازی و ابن زہر کے نقش قدم پر چلنا اپنا فنی نصب العین قرار دیا، چنانچہ خلاصۃ التجارب میں کلینکی تجربات اور مشاہدات بکثرت پائے جاتے ہیں اور ایران کی یہ آخری تصنیف ہے جو معالجاتی نوعیت کے ذاتی تجربات پر مشتمل ہے۔''(۲۸)

بہاء الدولہ کے فنی مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''غالباً بہاء الدولہ پہلا طبیب ہے، جس نے آتشک کی علامات، نشانیوں اور پیچیدگیوں کا نہایت صحیح طور پر مشاہدہ کیا ہے، وہ اس مرض کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ سب سے پہلے ایک بثرہ ظاہر ہوتا ہے اور ایسا کبھی آتشک والے سے مجامعت کرنے کے بعد ہوتا ہے یا اس کی پیدائش حمام ولباس کے ذریعہ ہوتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دانے میں شروع سے آخر تک درد نہیں ہوتا ہے۔ بہاء الدولہ آتشک کے دوسرے درجہ میں جسم پر اُبھرنے والے عام دانوں، گلے کی خرابی اور مزمن صورتوں میں عصبی بیماریوں سے واقف تھا۔ اس کے علاوہ تمام جسم میں درد، عمومی علامات اور سوء ہضم سے بھی، آتشک کی علامات میں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔''(۲۹)

بہاء الدولہ حذاقتِ فن میں اعتبار کے مرتبہ پر فائز تھے، دیانت ان کے مزاج کا خاصہ تھی، اسی لیے انہوں نے جو کچھ دیکھا اور سیکھا، کمال دیانت کے ساتھ اپنی اس کتاب میں نقل کر دیا، لیکن ان کے کلینکی مشاہدات کا تذکرہ عام طور سے نہیں کیا جاتا، حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''بہاء الدولہ نے خلاصۃ التجارب میں بے شمار واقعات اور مشاہدات درج کیے ہیں، جن کے مطالعہ سے اس ایرانی طبیب کی مشغول طبی زندگی کی جھلک ملتی ہے، ساتھ ہی اس کی پیشہ ورانہ ایمان داری پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ اس نے جو کامیاب علاج یا مشاہدہ ہندی اطباء (جو ہرات اور ری میں کثیر تعداد میں آباد تھے) سے حاصل کیا، یا اُسے مشاہدہ کرنے کا اتفاق ہوا، بے کم و کاست انہیں کے ساتھ منسوب کر کے ذکر کر دیا ہے، حتیٰ کہ صفرابند، جو غیر طبیب تھے، ان کے ذکر سے بھی گریز نہیں کیا۔ حیرت

اور افسوس کی بات ہے کہ اس طبیب نے طب کے عملی پہلو، تجربہ، مشاہدہ اور کلینکی یادداشتوں کے ریکارڈ پر اتنا زور دیا، وہ کم معروف ہے اور یورپ میں اس کا کوئی چرچہ نظر نہیں آتا ہے اور ہندوستان میں بھی جو کتابیں تالیف کی گئی ہیں ان میں اس طبیب کا حوالہ نہیں ملتا ہے، مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ ہندوستان میں 'خلاصۃ التجارب' طبع ہوئی تو سرورق پر حکیم علوی خاں سے منسوب کردی گئی اور اتنی غلط چھاپی گئی کہ دوسطور بھی آسانی سے نہیں سمجھی جاسکتی ہیں۔ ہمارے ملک کے اکثر اطباء اگر کبھی اس کتاب کو پڑھتے ہوں گے تو 'مجربات علوی خاں' سمجھ کر۔'' (۳۰)

دفترِ نہم (نویں باب) میں قاضی ابوعلی الحسن التنوخی کی تالیف 'کتاب الفرج بعد الشدۃ' کے حوالہ سے ۶ کلینکی مشاہدات نقل کیے ہیں، ان پر تبصرہ کرتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''طبیب کی ذکاوت اور فراست بھی کسی زمانہ میں اس کی معالجاتی زندگی میں اہم رول ادا کرتی تھی، آج یہ فراست طبی پیشہ میں مفقود ہے، جو کچھ صریحاً آنکھ سے نظر آرہا ہوتا ہے، وہ بھی نظر انداز ہوجاتا ہے۔ چہ جائیکہ وہ جو مبہم ہے، چنانچہ آج ایسی غیر معمولی معالجاتی حکایات ہمارے لیے مشعل راہ بن سکتی ہیں۔'' (۳۱)

حکیم محمد طیب اپنی اس علمی کاوش 'اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات' کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

''ایک خاص عنوان کے تحت میں نے خود مستفید ہونے اور دوسروں تک استفادہ کو پہنچانے کی سعی کی ہے، بشر ہوں ٹھوکریں بھی کھائی ہوں گی، یہ سعی جمیلہ نہ سہی، پھر بھی ہمت افزائی کا تو امیدوار ہوں۔'' (۳۲)

اے کریٹیکل ایویلویئشن آف دی ورکس آف یوسف بن محمد یوسفی:

مغل حکمراں بابر اور ہمایوں کے درباری طبیب اور دانشور یوسف بن محمد یوسفی کی علمی خدمات کے تنقیدی و تجزیاتی جائزہ پر مبنی حکیم محمد طیب کے اس تحقیقی مقالہ پر انہیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری تفویض ہوئی تھی۔ اس مقالہ کو انہوں نے پروفیسر نذیر احمد، شعبۂ فارسی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کی زیر نگرانی ۱۹۷۰ء میں لکھا تھا۔ ۲۳۹ صفحات اور کتابیات کے تین الحاقی اوراق پر مشتمل یہ غیر مطبوعہ مقالہ، پیش لفظ (Preface) اور تعارف (Introduction) کے علاوہ تین ابواب

پر مشتمل ہے۔ حکیم فخر عالم نے اس مقالہ کے Preface اور Introduction کے ساتھ ہی اس کے Index کی فوٹو کاپی فراہم کی تھی، جس کی روشنی میں یہ سطور قلم بند کی جارہی ہیں۔

یہ مقالہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ حکیم محمد طیب کے علمی آثار سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہاں اس کے مشتملات کی فہرست نقل کی جارہی ہے:

FIRST CHAPTER

Literary and Cultural relationship with Persia

i. Before the advent of Muslim rule in India

ii. Pre-Mughal Period

iii. Mughal Period

SECOND CHAPTER

Life Sketch of Yusuf bin Muhammad

i. Native Land

ii. Birth

iii. Parentage

iv. Other blood relations

v. Life in Khurasen

vi. Arrival in India

vii. At Babur's court

viii. At the Court of Humayun

ix. Cities visited

x. Death

xi. Accomplishments

xii. Character.

THIRD CHAPTER

A critical evaluation of the works of Yusufi

MEDICAL WORKS

i. Risala-i-Makul wa Mashrub

ii. Fawai'd-ul-Akhyar

iii. Jami'ul-Fawai'd

iv. Qasida dar Hifz-i-Sehat

v. Risala-i-Sitta-i-Zaruriya

vi. Dalai'l-ul-Nabz

vii. Dalai'l-ul-Bole

viii. Riaz-ul-Advia

BOOKS ON EPISTOLOGRAPHY

Badai-ul-Insha

POETICAL WORKS

Diwan-i-Yusufi

i. Qasai'd

ii. Ghazals

iii. Qitas

iv. Rubai

ADDITIONAL POEMS

i. Qasida-i-Asmai Ajnas-i-Advia

ii. Qasida dar Lughat-i-Hindi

iii. Masnawi dar Mazammat-i-Bukhl-o-Bakhil

iv. Munajat dar Talab-i-Ishq-i-Ilahi

BOOKS ON MYSTICISM

Anwar-i-Hikmat

Yusufi as a Tabib

Yusufi as an Epistolographer

Yusufi as a Poet

Conclusion

BIBLIOGRAPHY

حکیم محمد طیب نے اپنے اس تحقیقی مقالہ میں یوسف بن محمد المتخلص بہ یوسفی کی تالیفات، رسالۂ ماکول ومشروب، فوائد الاخیار، جامع الفوائد، قصیدہ در حفظِ صحت، رسالہ ستہ ضروریہ، دلائل النبض، دلائل البول اور ریاض الادویہ کا تنقیدی اور تجزیاتی جائزہ لیا ہے۔

یہاں بر سبیل تذکرہ عرض کر دیا جائے کہ عہدِ مغلیہ کی طبّی خدمات کے تحقیقی وتنقیدی جائزے پر مبنی ایک معتبر کام حکیم الطاف احمد اعظمی نے 'تاریخ طب واطباء دور مغلیہ' کے نام سے کیا ہے، جس میں یوسف بن محمد المتخلص بہ یوسفی کی متذکرہ بالا کتابوں کی فہرست میں اصل الاصول، علاج الامراض اور امراضِ چشم کا اضافہ کیا ہے اور ہندوستان کے مختلف کتاب خانوں میں ان کی موجودگی کی نشاندہی بھی کی ہے، مثلاً اصل الاصول کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کا ۳۶ صفحات پر مشتمل، خط نستعلیق میں ۱۸۳۹ء کا لکھا ہوا ایک خطی نسخہ مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ میں موجود ہے، اسی طرح علاج الامراض کے متعدد خطی نسخوں کی نشاندہی برٹش میوزیم، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ، رام پور رضا لائبریری رام پور اور سالار جنگ میوزیم حیدر آباد میں اور امراضِ چشم کے خطی نسخہ کی موجودگی بوڈین لائبریری میں بتائی ہے۔

فلاسفی آف گریکو عرب میڈیسن:

حکیم محمد طیب کا یہ ۱۲؍صفحاتی کتابچہ موضوع کے اعتبار سے ایک اہم مقالہ ہے، جو اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے زیر اہتمام، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ سے ۱۹۸۳ء میں طبع ہوا ہے۔ حکیم محمد طیب نے اس میں یونانی وعربی نظام علاج کے فلسفے پر بہت پُر مغز اور سیر حاصل بحث کی ہے اور اس نظامِ علاج کی خوبیوں اور امتیازات کو دلائل کی روشنی میں واضح کیا ہے، لکھتے ہیں:

"The Greeks took it in the stride of Philosophy. When I speak of philosophy I do not mean the pursuit of wisdom or the knowledge of things and their causes, rather, I refer to the metaphysical approach. Contrary to the material approach towards the human body and its ailments through the observations of the apparent and the study of hidden changes, speculations kept the so called philosopher cum physician cum mythologist away from bed of the patient."(34)

مزید لکھتے ہیں:

"It was not earlier than the 5th Century B.C. that Hippocrates crystalized all medical knowledge of his times into a system. He observed the objective and the subjective as two aspects of one reality which is life and brought the man back from the abstract. Thus medicine became more empirical and less hypothetical." (35)

معملی جانچوں اور بایوکیمیکل ٹسٹوں کی عدم موجودگی میں بھی اطباءِ قدیم نے امراض کے تشخیصی میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، ان کی جس قدر ستائش کی جائے، کم ہے۔ حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

"In the absence of laboratory investigations and biochemical tests, the physician had to bring forth his sixth sense in order to reach a reasonable diagnosis"(36)

مقالہ کے اختتام میں لکھتے ہیں:

"The theories which served the Greeks and Romans and later the Arabs and Persians for almost fifteen hundred years could not be put aside as outdated because even today the masses of this sub continent have faith in traditional medical system and in order to solve the health problems of this most populous country, the utilization of this system and its practitioners with full state patronization could be a way out."(37)

حکیم محمد طیب کی تحریروں میں زیرِ نظر کتابچہ غالباً ان کی آخری منضبط تحریر ہے۔ اس اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی تصنیفی و تالیفی مدتِ کار ۱۹۵۵ء سے ۱۹۸۳ء پر بسیط ہے، جس میں ابتدائی ۱۶ ر سال زیادہ فعالیت کے رہے ہیں، ۱۹۸۳ء سے ۲۰۱۳ء کے درمیان ان کی ایسی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری، جس میں 'طبّیت' دکھائی دے۔ ہندوستان میں یونانی طب کے حوالہ سے اس طرح کے اضمحلال کا نتیجہ یہ رہا کہ دوسرے اور تیسرے ذہن و دماغ اور فکر و خیال کے لوگوں کے ذریعہ طبّی ادب تخلیق کیا جانے لگا اور المیہ یہ کہ یہی ادب پڑھا، پڑھایا جانے لگا، جس سے تخلیق کرنے والا شاداں ہوا کہ نہیں؟، پڑھنے والا یقیناً غیر مطمئن نظر آیا، لیکن دونوں خاموش، دونوں مصلحت کے شکار۔

حکیم محمد طیب کی تحریروں میں جو زیریں لہریں ملتی ہیں، ان سے جہاں تک میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ کسی حد تک 'بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے طب' کی کیفیت میں مبتلا تھے اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، میں نے بہت سے وسیع المطالعہ اور شاداب ذہنوں کو اس 'کرب' میں مبتلا پایا ہے، جو اپنے گرد و پیش کی علمی کم مائیگی، فکری افلاس اور ناقدری کی کوکھ سے جنما ہے اور جب تک یہ صورتِ حال رہے گی، اچھا ذہن 'کرب' میں مبتلا رہے گا۔

حکیم محمد طیب کی عملی زندگی کا سب سے روشن پہلو ان کا مطب و معالجہ تھا، جو بظاہر ان کی

مزاجی کیفیت سے میل نہیں کھاتا، لیکن سچائی یہی ہے کہ انہوں نے خالص علمی کام کے بجائے 'مطب و معالجہ' کو زیادہ وقت دیا، وہ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کے سب سے معتبر، زود فہم، رمز شناس، وسیع النظر اور حذاقتی فراست سے آراستہ شاگرد تھے، شفاء الملک مرحوم اُن پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ اپنی طالب علمانہ زندگی کے تیسرے سال میں ہی وہ ان کے مطب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس کی ایک بانگی خود حکیم محمد طیب کے لفظوں میں:

> ''چوتھے سال میں ایک دن مطب میں، میں بھی حاضر تھا کہ حکیم صاحب قبلہ زنانہ کمرے سے واپس ہوئے اور بولے' لکھئے' اور چند اجزاء جلدی جلدی بول دیے اور دوسرے مریضوں کی طرف رجوع ہو گئے، میں نے نسخہ لکھ کر وزن لگا دیا اور دواؤں کے افعال کے پیش نظر تشخیص کا خانہ بھی بھر دیا اور حکیم صاحب کے سامنے رکھ دیا، نسخہ کا معائنہ ہوا، مسکرائے اور بولے 'اس لڑکے میں ذکاوت و فراست دیکھ رہا ہوں، تشخیص بالکل صحیح، حالاں کہ میں نے نہیں بتایا تھا اور اوزان بھی صحیح'۔۔۔ بات آئی گئی ہوگئی، ۱۹۵۳ء میں ہاؤس فزیشین ہوا تو اپنے ساتھ مطب میں حکیم صاحب نے بٹھانا شروع کیا اور چند مریض چھوڑ کے، جو خاص ان کے لیے آتے تھے، انہوں نے عملاً سارے مریض میری طرف رجوع کرانا شروع کیے اور مجھے رموز مطب سے وقتاً فوقتاً آگاہ کرتے رہے، چنانچہ ۱۹۵۳ء سے تادمِ ریٹائرمنٹ حکیم صاحب کے ساتھ میں مطب میں حاضر رہا اور چونکہ وہ زیادہ تر میٹنگوں اور بیرون علی گڑھ سفر ہی میں رہتے تھے، اس لیے مجھے قریب سے حکیم صاحب کے اندازِ مطب کا مطالعہ کرنے کا موقع ہاتھ لگا۔''(۳۸)

حکیم محمد طیب کے سامنے نمونہ کے طور پر شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کے شب و روز تھے، تصنیف و تالیف کی عرق ریزیاں بھی اور مطب و معالجہ کی مشغولیات بھی۔ انہوں نے طبی دنیا کو ۱۹۷۱ء تک تحریری طور پر اپنی موجودگی کا احساس دلایا، لیکن بعد میں مطب و معالجہ کو ہی اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا، کہ اس میں 'عافیت' زیادہ تھی اور میدان خالی تھا، ہم مشربوں نے غالباً انہیں Walk Over دے دیا تھا، ورنہ مطب و معالجہ تو ان کی ذہنی ساخت اور مزاجی کیفیات سے میل نہیں کھاتا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ طبی ادب ایک صاحبِ فکر و نظر کی تحریروں سے

اپنے سرمایہ کو اس قدر گراں مایہ نہ بنا سکا، جس کی توقع اس سے تھی۔

حوالہ جات

۱- تعارف، چین میں قدیم طب: ص ۳-۲

۲- مقدمہ، کتاب العشر مقالات فی العین: ص ۲۷

۳- ایضاً: ص ۲۷

۴- ایضاً: ص ۲۷

۵- ایضاً: ص ۱۷

۶- ایضاً: ص ۱۸-۱۷

۷- ایضاً: ص ۱۸

۸- ایضاً: ص ۱۸

۹- ایضاً: ص ۱۹

۱۰- ایضاً: ص ۱۹

۱۱- ایضاً: ص ۳

۱۲- ایضاً: ص ۲

۱۳- تعارف، قانون صحت: ص ج

۱۴- ایضاً: ص ج

۱۵- تقدمہ، قانون صحت: ص د

۱۶- ایضاً: ص ذ-د

۱۷- اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات: ص ۳

۱۸- ایضاً: ص ۵

۱۹- ایضاً: ص ۵

۲۰- ایضاً: ص ۵

۲۱- ایضاً: ص ۷۹-۷۸

۲۲- ایضاً: ص ۸۰

۲۳- ایضاً: ص ۸۲

۲۴- ایضاً:ص۸۴

۲۵- ایضاً:ص۸۵

۲۶- ایضاً:ص۸۵

۲۷- ایضاً:ص۸۶-۸۵

۲۷- ایضاً:ص۹۸

۲۸- ایضاً:ص۱۰۰

۲۹- ایضاً:ص۱۰۲

۳۰- ایضاً:ص۱۰۹

۳۱- ایضاً:ص۱۱۶

۳۲- ایضاً:ص۱۱۶

۳۳- A Critical Evaluation of The Works of Yusuf Bin Muhammad Yusufi

۳۴- ایضاً:ص۱

۳۵- ایضاً:ص۱

۳۶- ایضاً:ص۱

۳۷- ایضاً:ص۱

۳۸- تقدمہ، مطب لطیف، ص۵-۴، مرتبہ حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی

کتابیات

۱- لوچن چون، طیب، حکیم محمد (۱۹۵۵ء) چین میں قدیم طب (اردو ترجمہ)، شعبۂ نشر و اشاعت دواخانہ طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲- اسحاق، حنین بن رطیب، حکیم محمد (۱۹۵۷ء) کتاب العشر مقالات فی العین، (اردو ترجمہ)، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ

۳- طیب، حکیم محمد (۱۹۵۷ء) علم العین اور اطبائے قدیم، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

۴- طیب، حکیم محمد (۱۹۶۱ء) قانونِ صحت، مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

۵- طیب، حکیم محمد (۱۹۷۱ء) اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

۶- طیب، حکیم محمد (غیر مطبوعہ) اے کریٹیکل ایویلیوئیشن آف دی ورک آف یوسف بن محمد یوسفی

۷- طیب، حکیم محمد (۱۹۸۳ء) فلاسفی آف گریکو عرب میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

۸- ہمدانی، حکیم سید محمد کمال الدین حسین (۱۹۷۶ء) مطب لطیف، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

حکیم محمد طیب بحیثیت مورخ

حکیم وسیم احمد اعظمی

ڈپٹی ڈائرکٹر (یونانی) سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ

حکیم محمد طیب کے احوال اور آثار کے مطالعہ کے دوران اُن کی شخصیت کے اُن گوشوں پر بھی نظر پڑی، جو ہنوز غیر منور تھے اور جن پر طبّی مورخین نے غالباً کبھی گفتگو بھی نہیں کی تھی۔ حکیم محمد طیب کے مزاج میں تقلیدِ محض نہیں تھی، ان کا پیکر نقد و نظر اور تلاش و تفحص کے خمیر سے گوندھا گیا تھا، اسی لیے ان کی تالیفات اور تراجم میں ضمنی طور پر جب طبّی تاریخ کے مباحث آتے ہیں تو ان کی فنی بصیرت کا پتہ چلتا ہے۔

حکیم محمد طیب کا جو علمی ماحول تشکیل ہوا تھا، اس میں متعدد السنہ میں مہارت کی حد تک واقفیت کا بھی دخل تھا۔ قدیم طبّی ادبِ عالیہ تک ان کی براہ راست رسائی نے ان کی شخصیت کے کینوس کو بہت وسیع کر دیا تھا۔ ان کی جو کتابیں میرے مطالعہ میں رہی ہیں، ان میں چین میں قدیم طب (۱۹۵۵ء)، کتاب العشر مقالات فی العین، اردو ترجمہ (۱۹۵۷ء)، قانونِ صحت (۱۹۶۱ء)، A Critical Evaluation of the Works of Yusuf Bin Muhammad Yusufi (۱۹۷۰ء)، اطبائے قدیم کے کلینیکی مشاہدات (۱۹۷۱ء) اور Philosophy of Greco-Arabian Medicine (۱۹۸۳ء) شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض دیگر معاصر مصنفین کی کتابوں پر ان کے تقدمے اور چند مقالات بھی مطالعے میں رہے

ہیں۔ان کی ایک اہم تالیف علم العین اور اطباء قدیم مطالعہ میں نہیں رہی ہے، حکیم محمد طیب کے علمی آثار پر نظر رکھنے والوں نے اس کی تحسین کی ہے۔

حکیم محمد طیب کے متذکرہ بالا علمی آثار سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی نظر تاریخ طب پر بہت گہری تھی۔انہوں نے اپنی تحریروں میں تاریخ طب کے حوالہ سے راہ پانے والی بعض غلطیوں اور غلط فہمیوں کا دلائل اور شواہد کی روشنی میں ازالہ کیا ہے۔انہوں نے عینیات (Ophthalmology) کے علمی سرمایہ کا تنقیدی اور تجزیاتی مطالعہ کیا تھا اور اس موضوع پر اپنے عہد تک کی علمی و عملی سرگرمیوں کا بھی جائزہ لیا تھا۔تاریخِ طب کے مطالعہ کے لیے جس شعور، وجدان اور فکری آفاقیت کی ضرورت ہوتی ہے، حکیم محمد طیب اس سے بہرہ ور تھے۔ ترجمہ کی راہ سے آنے والی اپنی پہلی کاوش 'چین میں قدیم طب' کے 'تعارف' میں طب کی ابتداء کے بارے میں بہت سادہ اور عام فہم زبان میں لکھتے ہیں:

> "طب اتنی ہی پرانی ہے جتنا کہ انسان۔آج سے ہزاروں سال پہلے انسان نے اپنا علاج دعاؤں، گنڈوں اور جادو کے ذریعہ کرنا سیکھا تھا۔زمانہ کی رفتار پر تدریجاً جڑی بوٹیوں نے پرولش کیا۔اتفاقات، تجربات اور حادثات کی مدد سے انسان نے اپنے امراض کے علاج کے لیے ایک مستقل علم مرتب کیا، ہر آنے والے دور میں یہ علم پہلے سے کچھ زیادہ مکمل ہوتا گیا، یہاں تک کہ قریب قریب پوری دنیا میں یہ جڑی بوٹیوں کا علاج پھیل گیا۔"(۱)

یونان، روم، مصر، عرب، ایران، اسلامی اندلس اور غیر منقسم ہندوستان اس کی نشو نما اور ارتقاء کے مراکز قرار پائے، یہاں کے باشندوں کے مزاج کو بھی جڑی بوٹیوں کے ذریعہ علاج راس آیا تھا۔ہندوستان پر انگریزوں کے غاصبانہ تسلط کے بعد جڑی بوٹیوں کے ذریعہ علاج کو غیر سائنسی قرار دینے کی منضبط سازش رچی گئی اور ایسی فضاء بنادی گئی کہ آزادی کے بعد برادرانِ وطن کا ایک طبقہ انگریزوں کے سُر میں سُر ملا کر اس کو غیر سائنسی کہنے لگا۔اس دور کی سوچ کا جائزہ لیتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

> "ہمارے ملک کی سربرآوردہ ہستیوں کا خیال ہے کہ دیسی طریقہ علاج غیر محقق ہے۔

اس کو عوام کی صحت کا ضامن نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ایلو پیتھی طریقۂ علاج سائنٹیفک ہے۔ ذرا غور فرمایئے! اگر یہ لوگ دیسی طریقۂ علاج کا ٹھنڈے دل سے مطالعہ کر لیتے تو ان کو معلوم ہوتا کہ بنیادی طور پر کون سی طب سائنٹیفک ہے۔"(۲)

اس وقت جو منظر نامہ مرتب ہونا چاہیے تھا، اس کے بارے میں ایک طبیب اور دردمند ہندوستانی ہونے کے ناطے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

"اب وہ وقت تھا کہ ہم اپنا پُرانا طریقۂ علاج منظرِ عام پر لاتے۔ ہم اپنے ہم وطنوں کی طبّی ضروریات کو دیسی بے ضرر ادویہ سے پورا کرتے۔ ہماری قوم اپنی صحت میں مطمئن ہوتی۔ جب کوئی قوم نمایاں ہونے اور ترقی کرنے کی آرزومند ہوتی ہے تو پہلے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھتی ہے۔ اپنے پُرانے تمدن اور تواریخ کو دہراتی ہے اور انہیں بنیادوں پر زمانے کے مطابق اپنی ایک الگ حیثیت قائم کرتی ہے۔"(۳)

چین میں قدیم طب کے بارے میں وہاں کے اربابِ حل وعقد نے جو لائحۂ عمل مرتب کیا تھا، اس کا جائزہ لیتے ہوئے اپنا سوزِ دروں بیاں کرتے ہیں:

"آج اشترا کی چین ترقی کی راہوں پر گامزن ہے اور وہ ویسا ہی کر رہا ہے۔"(۴)

حکیم محمد طیب کا بڑا ہی اہم کام حنین بن اسحاق کی کتاب 'العشر مقالات فی العین' کا اردو ترجمہ ہے۔ علم العین کے تناظر میں حکیم محمد طیب کے مطالعہ میں بہت گہرائی اور گیرائی ہے۔ انہوں نے 'علم العین اور اطباء قدیم' پر ایک مقالہ بھی لکھا تھا، جو فی الوقت ہمیں حاصل نہیں ہوسکا۔ مقالہ کے عنوان سے واضح ہوتا ہے کہ مقالہ نگار نے اس میں علم العین کے حوالہ سے اطباءِ قدیم کی خدمات کا جائزہ لیا ہوگا۔

حکیم محمد طیب 'کتاب العشر مقالات فی العین' کے اپنے مقدمہ میں 'متاعِ گم گشتہ' کا احساس دلاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آیئے! دور، بہت دور ماضی کی گپھاؤں میں کچھ دیر کو چلیں، جب یونان اور مصر کے بت خانوں سے نکل کر علم طب کی برکتیں عرب، فارس، اندلس اور روم پر چھا گئیں

تھیں۔ جب عرب، دنیا کو تہذیب اور تمدن کا سبق دے رہے تھے، یہ وہی زمانہ تھا جب آسمان طب پر عرب اطباء چاند اور سورج کی طرح چمک رہے تھے، ان بزرگوں کی باریک بیں اور دوررس نگاہوں نے آج سے ہزاروں سال پیچھے جو کچھ دیکھا، آج کی خوردبین نے اس کی تصدیق کردی اور کچھ نہ کرسکی۔''(۵)

حکیم محمد طیب نے جب بھی تاریخِ طب سے گفتگو کی ہے، وہاں انہوں نے خالصتاً تکنیکی باتیں کی ہیں، اطباء کی اختراعات اور ان کے امتیازی کارناموں کو شواہد کی روشنی میں منقح انداز میں پیش کیا ہے، صرف سنوی اعداد و شمار کی چق پھیریوں سے اپنی تحریروں کو 'کھتونی' نہیں بنایا ہے۔ انہوں نے کبھی بھی اور کسی مرحلہ میں بھی 'ہمہ دانی' کا دعویٰ نہیں کیا ہے، کتاب العشر مقالات فی العین کے اردو ترجمہ میں لکھتے ہیں:

''قبل اس کے کہ زیر بحث کتاب کے بارے میں کچھ عرض کروں، مناسب سمجھتا ہوں کہ چند جامع قدیم تصانیف جو آنکھ کے متعلق وقتاً فوقتاً ترتیب دی گئیں اور جن کے بارے میں جتنا بھی معلوم ہوسکا ہے، عرض کروں۔''(۶)

اس کے بعد انہوں نے اپنی دانست کے مطابق کتابوں کی نشاندہی کی ہے، یہ بات دیگر ہے کہ کم و بیش ۵۵ سال کے اس عرصہ میں طبّی مخطوطات کی یافت زیادہ ہوئی ہے۔ انفارمیشن ٹکنولوجی میں ایک انقلاب سا آگیا ہے، گویا دنیا کفِ دست پر آگئی ہے، بیشتر مشہور لائبریریاں ڈیجیٹلائز ہوگئی ہیں، وقیع کتب خانوں کی تمام معلومات ان کی سائٹ پر فراہم ہیں۔ طبّی مخطوطات کے سلسلے میں آج جو منظرنامہ مرتب ہو رہا ہے، اس کے حوالہ سے حکیم محمد طیب کی بیان کی ہوئی 'کتابیات' میں بہت اضافہ کیا جاسکتا ہے۔

یورپ کے دورِ جاہلی اور عالمِ اسلام کی ضوفشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''جب یورپ جہالت کے اندھیرے سے گھبرا گیا تو روشنی لینے قرطبہ کی درس گاہوں کی طرف بھاگا۔ سلرنو کے عالموں سے خیرات مانگی، شیخ بوعلی سینا، زکریا رازی اور

ابوالقاسم جیسے جواہر پاروں کی دمک صدیوں تک اپنے اسی روپ میں یورپ کی طبّی درس گاہوں میں مشعلِ راہ بنی رہی۔''(۷)

حکیم محمد طیب مزید لکھتے ہیں:

''علمِ طب کا یہ نادر خزانہ طب کے تمام شعبوں پر حاوی تھا، ان میں سے ایک علم العیون بھی تھا۔ سترہویں اور اٹھارہویں صدی عیسوی میں ان تمام علوم کا ترجمہ یونانی اور عربی سے لاطینی اور انگریزی میں ہو چکا تھا۔ صدہا برس کی کاوشوں سے جمع کی ہوئی کتابیں، بیش بہا قلمی نسخے اندلس اور فارس کے کتب خانوں کی زینت تھے، کہیں آگ لگائی گئی اور کتابوں کے انبار پل میں خاک ہو گئے اور کہیں چنگیزی فوج کے درندے دریا پر کتابوں کا پل بنا کر گزر گئے اور مہینوں کتابوں کی سیاہی دریا کے پانی کو سیاہ کرتی رہی۔''(۸)

جب کوئی قوم اپنے سرمائے کی خیر خبر نہ لے، بلکہ اس کو اپنی ثروت کا علم ہی نہ ہو تو اس پر دوسری اقوام قابض ہو جاتی ہیں، اب یہ ان اقوام کی ذہنی تربیت اور سوچ پر منحصر ہے کہ وہ اس پر کس طرح کا حق جتاتی ہیں؟ بدقسمتی سے جن اقوام نے قبضہ جمایا، ان میں سے اکثر غاصبانہ ذہنیت رکھتی تھیں، لیکن ان میں سب ہی ایسے نہیں تھے۔ اس بارے میں حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''طب کی اس میراث سے استفادہ جائز اور برحق تھا، مگر غاصبانہ انداز اور حقائق سے انکار یقیناً ایک اخلاقی جرم ہے، اقوامِ عالم میں کچھ قومیں حق پرست بھی ہیں اور ان کے افراد حقائق کے متلاشی۔''(۹)

اس تمہید کے بعد حکیم محمد طیب نے اخلاقی مجرموں اور حق پرستوں کی دستاویزاتی بنیاد پر نشاندہی کی ہے، یہ اندازِ نگارش ان کی تحریروں کو اور بھی اعتبار بخشتا ہے۔

حکیم محمد طیب حفظانِ صحت کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں لکھتے ہیں:

''انسان کی قدیم سے قدیم تاریخ میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی فارم میں اس علم کا وجود پایا جاتا ہے۔ علمِ طب جب پہلی بار تعویذ گنڈوں اور دیوتاؤں کی خوشنودی کی بندشوں سے آزاد ہونے کے لیے کسمسائی تو غالباً یہ صحت کے یونانی دیوتا اسقلیبیس اور

دیوی ہائجیا کا زمانہ تھا۔ اب یہ ہونے لگا تھا کہ مسافر اور مندروں کے مجاور مندروں یا راستوں کی چوکیوں پر دھات یا پتھر کی تختیوں پر وہ نسخے یا وہ مفرد دوا، جس سے انہیں خود یا ان کے رشتہ دار یا دوست کو کسی مرض سے نفع ہوا تھا، کندہ کرا کے چھوڑ جایا کرتے تھے، تا کہ دوسرے بیمار ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یونان کی اس کنواری دیوی کا نام Hygiea تھا اور اسی کے نام پر علم حفظِ صحت Hygiene کہا جانے لگا۔'' (۱۰)

حفظانِ صحت کے علمی سرمائے پر حکیم محمد طیب کی بھرپور نظر تھی، لکھتے ہیں:

''میرا عقیدہ ہے کہ قدماء نے حفظِ صحت پر جس قدر زور دیا تھا، اس قدر توجہ یورپ کے اطباء نے اس علم پر صرف نہیں کی۔ شخصی حفظِ صحت پر جس قدر تفصیل اور سلیقہ سے بحث اطباءِ قدیم کے یہاں ملتی ہے، اطباءِ جدید کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تمدن کی ترقی اور آبادی کی کثرت وغیرہ چند تبدیلیوں کی بنا پر اجتماعی حفظِ صحت پر زیادہ کام کیا گیا ہے۔'' (۱۱)

حکیم محمد طیب کا ایک بڑا اختصاص یہ ہے کہ وہ آئینِ نو سے ڈرتے اور طرزِ کہن پر اڑتے نہیں تھے، اسی لیے انہیں اجتماعی حفظِ صحت پر طبِ جدید کی کاوشوں، بلکہ اضافات کا اعتراف ہے اور ایک تاریخ نگار کے لیے یہ لازمی بھی ہے۔

حکیم محمد طیب نے بہاء الدولہ کی تالیف 'خلاصۃ التجارب' کے بارے میں جو بات لکھی ہے، وہ بالکل سامنے کی بات ہے، لیکن اس پر پہلی نظر انہی کی پڑی، جو ان کے بیدار ذہن اور حقیقت شناس ہونے کی نشاندہی کرتی ہے، لکھتے ہیں:

''خلاصۃ التجارب ایک بار ۱۸۸۲ء میں لکھنؤ سے شایع ہوئی (مطبع نول کشور) اور پھر دوسری بار ۱۸۹۳ء میں کانپور سے اسی مطبع سے شایع ہوئی، مگر ہر بار ایک عجیب غلطی سرزد ہوئی ہے کہ جس کی وجہ سمجھنے سے، میں کم از کم قاصر ہوں، کتاب کے سرورق پر 'مجربات حکیم علوی خاں موسوم بہ خلاصۃ التجارب' درج ہے، جب کہ دیباچہ میں خود بہاء الدولہ کہتا ہے:

''چنیں معروض دارد خادم الفقراء والملۃ بہاء الدولہ کہ چوں کلام حضرت سید الانام علیہ التحیۃ والسلام کہ من کتم علما نافعا الجمہ اللہ تعالیٰ یوم القیامۃ بلجام من النار۔ امر بود

باظہار علمی نافع وایں بیچارہ رابعضی از تجارب طبی کہ مشتمل است بر فوائد بدنی حاصل بود لازم نبود آنرا اطاعۃ لامرہ الاعلیٰ وفوزا بتلک السعادۃ فی الآخرۃ والاولیٰ ثبت نمود فلہٰذا الشتغال سالک ایں رسالہ موسومہ بہ خلاصۃ التجارب در آوان سبع وتسعمائۃ در مسکن طرشت مروی زار اتفاق افتاد۔''

حاجی خلیفہ نے بھی خلاصۃ التجارب کا مصنف بہاء الدولہ کو قرار دیا ہے اور ۹۰۷ھ ہی سالِ تصنیف بتایا ہے۔ بانکی پور (خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ) کی فہرستِ مخطوطات میں اس کے چار نسخے درج ہیں اور آغاز وہی ہے، جو مطبع نول کشور میں ہے اور جسے 'مجربات علوی خاں' کہا گیا ہے۔''(۱۲)

اس وقت میرے مطالعہ میں حکیم الطاف احمد اعظمی کی کتاب 'تاریخ طب واطباء دورِ مغلیہ' ہے، اس میں انہوں نے خلاصۃ التجارب کے مطبوعہ نسخہ نول کشور کے حوالہ سے جو عبارت نقل کی ہے اس میں اور حکیم محمد طیب کے متذکرہ بالا اقتباس میں جزوی متنی اختلاف ہے، لیکن اس اختلاف سے خلاصۃ التجارب کی فنی اہمیت پر ذرا بھی حرف نہیں آتا۔

حکیم محمد طیب مزید لکھتے ہیں:

''مزید براں بہاء الدولہ نے خلاصۃ التجارب ۹۰۷ ہجری میں تالیف کی اور علوی خاں دہلی کے بادشاہ محمد شاہ کے دور کا طبیب ہے اور اس کا انتقال ۱۱۶۲ ہجری میں ہوا ہے، گویا کہ تالیف کتاب کے ۲۵۰ سال بعد۔ یہ بات تو بہر حال تسلیم ہے کہ صریح غلطی ہوئی، مگر اس سے زیادہ حیرت انگیز یہ امر ہے کہ آج تک کتب خانوں کی فہرست میں مطبوعہ کتاب 'خلاصۃ التجارب' علوی خاں کے ساتھ وابستہ ہے، بلکہ علوی خاں کا خطاب 'بہاء الدولہ' سمجھ لیا گیا ہے۔''(۱۳)

حکیم محمد طیب کی اس تحقیق کے بعد کی اردو تحریروں میں اس غلطی کو سدھارنے کی کوششیں ہوئی ہیں اور حکیم علوی خاں کے علمی آثار کی فہرست سے نہ صرف 'خلاصہ التجارب' کو حذف کر دیا گیا ہے، بلکہ تحقیق کو اور بھی وسعت دی گئی ہے۔ اس کتاب کا جائزہ لیتے ہوئے اسی نام کی اور کتاب اور اس کے سنِ تالیف کے بارے میں حکیم الطاف احمد اعظمی لکھتے ہیں:

”بہاء الدولہ سراج الدین حسن بن میر قوام الدین قاسم شیرازی (متوفی ۹۲۶ ہجری) نے بھی ایک کتاب خلاصۃ التجارب کے نام سے لکھی ہے۔ یہ ۹۰۷ ہجری کی تالیف ہے اور ۵۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔“ (۱۴)

حکیم الطاف احمد اعظمی نے جس دوسری کتاب کی نشاندہی کی ہے، اس میں اور حکیم محمد طیب کی محولہ کتاب میں تین چیزیں مشترک ہیں۔ اول مصنف کا نام بہاء الدولہ، دوم کتاب کا نام خلاصۃ التجارب، سوم سنِ تالیف ۹۰۷ ہجری۔ حکیم الطاف احمد اعظمی نے زیرِ بحث مصنف کا نام کسی قدر صراحت سے حکیم محمد حسین نور بخشی بہاء الدولہ لکھا ہے۔ یہاں ایک نکتہ کی طرف قاری کی توجہ مرکوز کرانا چاہوں گا کہ حکیم محمد طیب نے خلاصۃ التجارب کی تالیف اور حکیم علوی خاں کی وفات کے ۲۵۰ سال کے زمانی فصل کو بطور استشہاد پیش کیا ہے، اگر وہ خلاصۃ التجارب کے سن تالیف ۹۰۷ ہجری اور حکیم علوی خاں کے سنِ ولادت ۱۰۸۰ء کے زمانی فصل یا پھر حکیم محمد حسین نور بخشی بہاء الدولہ کے سنِ وفات ۱۵۵۷ء بمقام 'رے' اور حکیم علوی خاں کے سنِ وفات ۱۷۴۷ء بمقام 'دہلی' کے زمانی فصل سے استشہاد کرتے تو بات زیادہ سائنٹیفک ہوتی کہ آج کا طریقۂ استشہاد یہی ہے۔

واضح رہے کہ حکیم علوی خاں کا اصل نام سید محمد ہاشم بن محمد ہادی قلندر بن سید مظفر الدین تھا۔ علوی خاں، معتمد الملک اور موتمن الملک ان کے خطابات تھے، بہاء الدولہ جیسا نام یا خطاب کبھی نہیں رہا۔ دراصل طبی دنیا میں اُن کے نام کو سکۂ رائج الوقت جیسی حیثیت حاصل تھی، اسی لیے تو تاجرانِ کتب نے نہ صرف حکیم محمد حسین نور بخشی، بہاء الدولہ کی خلاصۃ التجارب ان سے منسوب کردی، بلکہ عہد جہانگیر کے ممتاز طبیب امان اللہ خاں (وفات: ۱۶۳۷ء) کی کتاب 'عشرۂ کاملہ' کو بھی منسوب کرنے میں ذرا بھی تردد نہیں کیا۔

بر سبیل تذکرہ عرض ہے کہ اس طرح کی غلطیاں یا تسامحات دوسرے مؤلفین کے ساتھ بھی ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے، مثلاً حکیم محمد اعظم خاں کی کتاب 'اکسیر اعظم' کے ملخص اردو ترجمہ 'الاکسیر' کو علامہ حکیم محمد کبیر الدین کا علمی کارنامہ قرار دیا

جانے لگا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس کے مترجم محمد صدیق طبیب ہیں۔ انہوں نے یہ ترجمہ علامہ حکیم محمد کبیر الدین کی ایماء پر کیا اور حکیم محمد کبیر الدین نے اس پر مقدمہ لکھا اور محمد صدیق طبیب کے کام کی ستائش بھی کی۔ یہ سب کچھ اسی کتاب میں تحریر ہے، لیکن غلطی کہاں سے اور کیوں کر راہ پا گئی؟ غور و فکر کا موضوع ہے۔ آج کی حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے ایک بڑے ذاتی اشاعتی ادارے نے ٹائٹل پیج پر بھی علامہ حکیم محمد کبیر الدین کا نام چھاپ دیا ہے، اس بات سے قطعی بے نیاز ہو کر کہ اندر کے صفحات میں مترجم کی حیثیت سے محمد صدیق طبیب کا نام درج ہے اور جس کو علامہ حکیم محمد کبیر الدین کی ستائش کا اعزاز حاصل ہے۔

حکیم محمد طیب کا طبّی تاریخی شعور ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ A Critical Evaluation of the Works of Yusuf Bin Muhammad Yusufi میں خوب دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے اس کے پیش لفظ Preface میں اپنی شخصیت کے پرت بھی کھولے ہیں، لکھتے ہیں:

> " It is quite an un-common coincidence that by profession I am a physician and by taste a Master of Art."(15)

حکیم محمد طیب اور فنونِ لطیفہ کا مذاق رکھنے والے محمد طیب کے درمیان ہونے والے تصادم اور معرکوں کو ہم ان کے ذہن و زندگی میں بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ حکیم محمد طیب کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ کے دوران میرا ذہن بار بار جوش ملیح آبادی کی طرف گیا، لیکن میں اپنی اس سوچ کو کوئی واضح عنوان نہیں دے سکا۔

اس تحقیقی مقالہ کا تعارفی حصہ تاریخ طب کے حوالہ سے بہت وقیع ہے۔ اس میں انہوں نے طب کے ابتدائی عہد سے اٹھارہویں صدی عیسوی تک کی طبّی سرگرمیوں کا تحقیقی اور تنقیحی جائزہ لیا ہے اور اپنے غیر معمولی طبّی تاریخی شعور کا مظاہرہ کیا ہے۔ خلافتِ عباسیہ

کے مامونی عہد کی علمی خدمات پر گفتگو کرتے ہوئے اس کو طب کا عہدِ زریں قرار دیا ہے اور بعد کے زمانہ پر اس کے اثرات کی نشان دہی کی ہے، اسی کے ساتھ حنین بن اسحاق، ربن طبری، زکریا رازی، علی بن عباس مجوسی، ابوسہل مسیحی، ابن سینا، شرف الدین سید اسمٰعیل جرجانی، نجیب الدین سمرقندی اور مظفر بن محمد الشفائی کی خدمات کی توقیت کرتے ہوئے یوسف بن محمد یوسفی کے احوال وآثار کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور ہندوستان میں طبِ یونانی کے امکانات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ تعارف (Introduction) کے اختتامی پیراگراف میں لکھتے ہیں:

> " Persian medicine and science when dying in its native land, began to flourish in the neighbouring kingdom of India. Learned scholars who migrated to India during the Moghal regime, particularly the physicians, compiled valuable works, inspired by the famous masters of Arabian medicine like Rhazes, Avicenna, Ali Abbas, Abu Sehl and Ismail Jurjani on one hand and by Indian scholars and their works on the other. Most of such works are lying unnoticed so far." (16)

حکیم محمد طیب نے اپنے مقالہ Philosophy of Greco-Arabian Medicine میں بھی طبی تاریخی وجدان کا ثبوت دیا ہے اور طبِ یونانی کے نظریے اور فلسفے کو سنوی تسلسل سے، دلائل، براہین اور دانشوری کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حکیم محمد طیب کے بارے میں میری یہ تحریر ابھی نامکمل ہے، کیوں کہ میرے مطالعہ میں ان کا ایک اہم مقالہ 'علم العین اور اطباء قدیم' نہیں رہا ہے، جس کے جائزے کے بغیر یہ تحریر ادھوری سمجھی جانی چاہیے۔

حوالہ جات

۱- چین میں قدیم طب: ص ۱

۲- ایضاً: ص ۲

۳- ایضاً: ص ۵

۴- ایضاً: ص ۶

۵- ایضاً: ص ۶

۶- مقدمہ، کتاب العشر مقالات فی العین، اردو ترجمہ: ص ۶

۷- ایضاً: ص ۶

۸- ایضاً: ص ۶

۹- ایضاً: ص ۷-۶

۱۰- تقدمہ، قانونِ صحت: ص، چ۔ح

۱۱- ایضاً: ص، ح

۱۲- اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات: ص ۱۰۱

۱۳- ایضاً: ص ۱۰۱

۱۴- حاشیہ، تاریخِ طب و اطباء دور مغلیہ: ص ۲۸۲

15. A Critical Evaluation of the Works of Yusuf Bin Muhammad Yusufi p.1

16. p.10

کتابیات

۱- لوچن چون، طیب، حکیم محمد (۱۹۵۵ء) چین میں قدیم طب (اردو ترجمہ)، شعبہ نشر و اشاعت دواخانہ طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲- اسحاق، حنین بن، طیب، حکیم محمد (۱۹۵۷ء) کتاب العشر مقالات فی العین (اردو ترجمہ)، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ

۳- طیب، حکیم محمد (۱۹۶۱ء) قانونِ صحت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

۴- طیب، حکیم محمد (۱۹۷۱ء) اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ

۵- اعظمی، حکیم الطاف احمد (۱۹۹۲ء) تاریخ طب و اطباء دورِ مغلیہ، فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

۶- طیب، حکیم محمد (۱۹۷۰ء) اے کریٹیکل ایویلیوئیشن آف دی ورک آف یوسف بن محمد یوسفی (غیر مطبوعہ)

ایک قابلِ تقلید شخصیت

پروفیسر حکیم نعیم احمد خاں
صدر شعبۂ علم الادویہ وسابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میں ۱۹۸۰ء سے ۱۹۸۲ء کے درمیانی عرصہ میں اجمل خاں طبیہ کالج کے شعبۂ علم الادویہ میں ایم ڈی کا طالب علم تھا، اسی زمانہ میں پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب سے متعارف ہوا، مگر یہ رشتہ تعارف کی حدوں سے آگے نہیں بڑھ پایا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی وہ میرے نگراں نہیں تھے، جب کہ یہاں دستور یہ ہے کہ ایم ڈی کے ہر طالب علم کا ایک نگراں ہوتا ہے اور وہی طالب علم کا سب کچھ ہوتا ہے، علی گڑھ کی شریعت میں ریسرچ اسکالر سے تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملہ میں سپروائزر کی پسند اور ناپسند کو داخل کرلے ورنہ وہ شرک کا مرتکب سمجھا جائے گا اور اس مفروضہ ضابطۂ توحید کی خلاف ورزی کی پاداش میں معتوب قرار پائے گا، اس وصف کے علاوہ اس کی قابلیت اور لیاقت جیسے دیگر اوصاف ضمنی اور رسمی سمجھے جاتے ہیں اور سپروائزر سے وفاداری کا اظہار ہی بنیادی مطلوب ہوتا ہے، اس لیے ہر اسکالر کو طوعاً و کرہاً وفاداری کا مظاہرہ کرنا ہی پڑتا ہے۔

طیب صاحب سے اس قسم کا کوئی رسمی علاقہ نہ ہونے کے باوجود میں ہمیشہ ان سے ایک تعلق خاطر محسوس کرتا رہا اور ان کا مداح رہا، اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ وہ بہت اچھے استاذ تھے، انہیں درس وتدریس کا ملکہ تھا یا وہ اعلیٰ پایہ کے طبیب اور محقق تھے، یہ کمالات تو ان میں تھے ہی،

مگر ان میں ان سب سے بڑا وصف یہ تھا کہ وہ مکروریا سے پاک، صاف گو، صاف دل، غیر متعصب غیر جانبدار انسان تھے، ان کے ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہیں تھا، ان کے انہی اوصاف کی وجہ سے میں انہیں ایک اعلیٰ درجہ کا انسان سمجھتا ہوں، صاحبِ علم تو اکثر مل جاتے ہیں، ایک اچھا انسان بہت مشکل سے ملتا ہے، جو کہ حکیم طیب صاحب تھے، ان کی ان خوبیوں کو میں اس لیے لائق قدر سمجھتا ہوں کہ اس زمانہ میں یہ جنس بے حد نایاب ہے۔ علی گڑھ کی عام بھیڑ سے وہ کس طرح مختلف تھے، اسے بتانے کے لیے شاید یہی ایک واقعہ کافی ہے کہ شعبۂ علم الادویہ میں لکچرر شپ کی سلیکشن کمیٹی تھی، میں بھی بحیثیت امیدوار شامل تھا، خوش قسمتی سے میرا ہی تقرر ہوا، حکیم طیب صاحب اس سلیکشن کمیٹی کے ایک رکن تھے، انہوں نے اس پوسٹ کے لیے میرے کنڈیڈیچر کی نہ صرف تائید کی، بلکہ میری وکالت میں بھی پیش پیش رہے، بظاہر ان سے میرا کوئی ایسا رشتہ نہیں تھا، اس کے باوجود انہوں نے صرف میری صلاحیت کی وجہ سے میرے انتخاب کی وکالت اور حمایت کی۔ اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذات برادری اور علاقائیت جیسی عصبیتوں سے بالاتر اعلیٰ قدروں کی حامل شخصیت تھے۔

میں نومبر ۱۹۸۳ء میں شعبۂ علم الادویہ کے تدریسی عملہ میں بحیثیت لکچرر شامل ہوا، اس وقت کالج میں اساتذہ کی جو نسل تھی، ان میں سے اکثر کی شناخت شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کے شاگردی تھی اور یہ نسبت ان سب کے لیے باعث افتخار تھی، شفاء الملک سے نسبت رکھنے والے ان سینئر اساتذہ میں حکیم طیب صاحب سب سے ممتاز اور بلند قامت تھے، انہیں یہ بلند مرتبہ خود شفاء الملک نے عطا کیا تھا، اور اپنے علمی وفنی جانشین کے بطور حکیم طیب صاحب کو اپنی حیات ہی میں علی گڑھ یونیورسٹی برادری کے سامنے پیش کر دیا تھا، علی گڑھ برادری میں ان کی پہچان ایک دانشور طبیب، مدبر اور اعلیٰ منتظم کی تھی، ان تمام اوصاف میں طیب صاحب ان کے صحیح جانشین ثابت ہوئے اور شفاء الملک کی توقعات پر کھرے اترے۔ شفاء الملک نے معالجانہ فراست، اعلیٰ انتظامی صلاحیت، تدریسی لیاقت اور رعب دار شخصیت کے جو نقوش چھوڑے تھے، طیب صاحب نے ان سلسلوں کو دراز کیا، علمی اور فنی کمالات تو ان میں تھے ہی،

بلکہ اتنے تھے کہ خود شفاء الملک کے تلامذہ میں ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا۔

انتظامی امور کے سلسلہ میں حکیم طیب صاحب کی صلاحیتوں کا اعتراف یونیورسٹی سطح پر تھا، اس معاملہ میں ایک طرح سے ان کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ انہیں انگریزی زبان پر بلا کا عبور حاصل تھا، وہ جس عمدہ پیرایہ میں نوٹنگ اور ڈرافٹنگ کرتے تھے، اس طرح شاید انگریزی کے ماہرین بھی نہیں کر سکتے تھے، انگریزی زبان دانی کا یہ وصف ان کی Administrative Skill کو نکھارنے میں بہت کام آیا، ان کے علاوہ انتظام و انصرام کی اس پایہ کی صلاحیت طبیہ کالج کے کسی اور استاذ میں نظر نہیں آئی، حالانکہ مناصب اور عہدے بہت سے لوگوں کو ملے، لیکن حسنِ انتظام کی نیک نامی صرف طیب صاحب کے حصہ میں آئی۔

حکیم طیب صاحب بڑے منفرد مزاج کے تھے، وہ شفاء الملک کے خاص شاگرد اور ان کے علمی وفنی جانشین تھے، ان کی اس حیثیت کا اعتراف شفاء الملک کے دوسرے تلامذہ کو بھی تھا، مگر طیب صاحب نے کبھی اس نسبت کو اپنی شناخت کا لازمہ نہیں بننے دیا، ان کی خوددار طبیعت کا ہمیشہ یہ اصرار رہا کہ اسے ذاتی بنیادوں کے حوالہ سے جانا جائے، چنانچہ انہوں نے اپنے ذاتی اوصاف وکمالات کا دنیا سے لوہا منوایا اور انہیں کو اپنی پہچان کا ذریعہ بنایا۔

استغناء ایسی دولت ہے جو کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے، طیب صاحب کو یہ نصیبہ بڑی وافر مقدار میں ملا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے اندر بے حد بے نیازی تھی، پروفیسر شپ جیسا اعلیٰ تدریسی منصب، جس کے حصول کے لیے کیا کچھ نہیں کیا جاتا، مگر طیب صاحب اس کے نہ تو متمنی ہوئے، نہ ہی اس کے لیے تگ ودو کی، بلکہ یہ بلند عہدہ بن مانگے انہیں پیش کیا گیا، اس کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے، حکیم عبدالحسیب کے انتقال کے بعد پروفیسر کی پوسٹ خالی ہوئی تو کالج کے کئی اساتذہ اس کے امیدوار تھے، انتخاب کے لیے سلیکشن کمیٹی ہوئی، پروفیسر خسرو صاحب بحیثیت شیخ الجامعہ اسے چیر کر رہے تھے، حکیم طیب صاحب کالج پرنسپل کی حیثیت سے کمیٹی کے رکن تھے، جب انٹرویو کا مرحلہ پورا ہو چکا تو خسرو صاحب نے کہا، بھئی طیب صاحب!

گرچہ آپ امیدوار نہیں ہیں، مگر میرے خیال میں اس عہدہ کے لیے سب سے زیادہ موزوں آپ ہی ہیں۔ کمیٹی کے دوسرے اراکین نے خسرو صاحب کی اس رائے کی پرُزور تائید کی اور حکیم طیب صاحب پروفیسر منتخب کر لیے گئے۔

مطب و معالجہ سے طیب صاحب کو طالب علمی کے زمانہ ہی سے دلچسپی تھی، جو تا عمر قائم رہی، انہوں نے اوائل عمر ہی میں اس میدان میں اتنی لیاقت بہم پہنچالی تھی کہ خود شفاء الملک ان کی اس صلاحیت کی تحسین کرتے اور اکثر پیچیدہ امراض کے سلسلہ میں ان کو مشوروں میں شامل فرماتے، ایک استاذ کا اپنے شاگرد پر اس قدر اعتماد، بڑی بات تھی۔ شفاء الملک کی عدم موجودگی میں طیب صاحب ہی ان کے مریضوں کو دیکھا کرتے، انہیں یہ اجازت شفاء الملک نے عطا کی تھی، گویا انہوں نے اپنی حیات ہی میں طیب صاحب کو اپنے جانشین کے طور پر نامزد کر دیا تھا۔ طیب صاحب کو مطب و معالجہ سے دلچسپی تو تھی ہی، اس سلسلہ میں قسمت نے بھی ان کی یاوری کی اور شعبۂ معالجات سے ان کے تدریسی کیریر کا آغاز ہوا، یہاں انہیں ذوق کی تسکین کے علاوہ اپنی ہنرمندی کے جوہر دکھانے کا خوب موقع ملا، بحیثیت معالج دور دراز تک ان کی حذاقت کا شہرہ ہوا، جب وہ شعبۂ علم الادویہ سے بحیثیت پروفیسر وابستہ ہوئے تو یہ ایک نان کلینیکل ڈیپارٹمنٹ تھا، مگر یہاں بھی ان کے پاس مریضوں کی آمد جاری رہی اور انہوں نے بدستور مسیحانفسی جاری رکھی، مگر کبھی بھی اسے فرائض منصبی کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا، یہاں مطب و معالجہ سے وابستگی کے ساتھ انہوں نے ہمیشہ پابندی سے کلاس ٹیچنگ کی ذمہ داریاں ادا کیں۔ انہوں نے جو بھی کام کیا، اسے پوری دل جمعی سے انجام دیا، مطب و معالجہ میں وہ شہرت حاصل کی، جو کسی اور کا نصیبہ نہ بن سکی، یہی معاملہ ان کی تدریس کا تھا، اس سلسلہ میں انہیں جو امتیاز حاصل ہے، وہ اس شعبہ کے کسی اور استاذ کے حصہ میں نہیں آسکا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس فریضہ کو پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کیا، دوسرے اساتذہ کے برعکس کبھی انہوں نے کلاس ٹیچنگ کو اضافی کام نہیں سمجھا، بلکہ درس و تدریس سے جو وقت بچتا، اس میں وہ اضافی کاموں کو انجام دیتے، گرچہ شعبۂ علم الادویہ میں آنے کے بعد بھی ان کا رشتہ

مریضوں سے استوار رہا، مگر یہ ان کی ایک اضافی مصروفیت تھی۔

شعبۂ علم الادویہ سے وابستگی کے ابتدائی عہد میں طیب صاحب شعبہ کے فرائض کے علاوہ عبوری طور پر پرنسپل کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے ہوئے تھے، اس عہدہ پر پروفیسر قیام الدین صاحب کے باضابطہ تقرر کے بعد طیب صاحب نے شعبہ پر اپنی توجہ مرتکز کی اور اسے نہ صرف بلند معیار عطا کیا، بلکہ ایسے خطوط پر گامزن کیا کہ یونانی طب کی تعلیمی و تحقیقی دنیا کے لیے یہ شعبہ ایک قابل تقلید نمونہ بن گیا۔ انہوں نے شعبہ میں تحقیق کی ایک نئی روش کی بنیاد ڈالی، وہ دواؤں کو مطب و معالجہ کا سب سے اہم جزء سمجھتے تھے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ادویہ کے افعال و خواص کو تجربہ کی کسوٹی پر پرکھ کر روایتی معالجہ کو تیقن کی راہوں پر گامزن کیا جائے، فی زمانہ طبی تحقیق کا اصل منشا بھی یہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے Allied Subjects اور ان کے اساتذہ کو معاون کے طور پر استعمال کر کے اپنے تحقیقی عزائم کو عملی شکل عطا کی۔ شعبۂ علم الادویہ کا قیام ۱۹۷۲ء میں ہوا تھا، مگر یہاں ادویہ کے جدید طرز پر مطالعہ کا آغاز حکیم طیب صاحب کے ذریعہ ہوا۔ ان سے پہلے یہاں جو تحقیقی کام ہو رہے تھے، وہ زیادہ تر ان لوگوں کی نگرانی میں انجام پا رہے تھے، جن کا تعلق Allied Subject سے تھا، اس سلسلہ میں یونانی اساتذہ کا حصہ بہت معمولی تھا، ان کی نگرانی میں جو تحقیقات ہو رہی تھیں وہ لٹریری نوعیت کی یا ریویو کے زمرہ سے تعلق رکھتی تھیں، حکیم طیب صاحب نے ایک نئی روش کی طرح ڈالی، ان کا یہ طریقۂ کار یک گونہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں کے نظریۂ تحقیق سے مستفاد کہا جا سکتا ہے، گویا انہوں نے اجملی طرزِ تحقیق کو جو نامساعد حالات کی وجہ سے تعطل کا شکار ہو گیا تھا، اس کا احیاء کیا۔ چونکہ میں طیب صاحب سے Inspire تھا، اس لیے جب میں شعبہ کے تحقیقی معاملات میں مؤثر ہوا تو میں نے انہی کی روش کو مشعل راہ بنایا اور دواؤں کے افعال و خواص کے مطالعہ و مشاہدہ کے سلسلہ کو انہی کے طریق پر آگے بڑھایا، Hepatoprotective , Adoptogen , Antioxidant , Nephroprotective اور Analgesic جیسے موضوعات پر میری نگرانی میں ایم ڈی کے جو تحقیقی کام انجام پائے، نہ صرف ان کے نتائج حوصلہ افزا رہے، بلکہ ان کے

ذریعہ یونانی طب کے روایتی بیانوں کو نئی تعبیریں ملیں۔

حکیم طیب صاحب کے قلمی آثار گرچہ بہت زیادہ نہیں ہیں، مگر جس قدر بھی ہیں، وہ انہیں تصنیف و تالیف اور ترجمہ نگاری کی دنیا میں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہیں، کتاب العشر مقالات فی العین، علم العین اور اطباء قدیم، قانونِ صحت، اطباء قدیم کے کلینکی مشاہدات وغیرہ اتر پردیش اردو اکیڈمی کے ذریعہ انعام یافتہ ہیں۔ طیب صاحب کے علمی کاموں کا ایک اہم حصہ غیر مطبوعہ اور غیر مدون صورت میں ہے، ان کے وہ تحقیقی مقالے جو مختلف علمی جریدوں میں شائع ہوئے ہیں یا جنہیں قومی اور عالمی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں انہوں نے پیش کیے ہیں، اسی طرح ان کے وہ صدارتی اور کلیدی خطبات، جسے انہوں نے علمی اور طبی مجلسوں میں عطا کیے ہیں، یہ نہایت بیش قدر ہیں، ان کی ترتیب و اشاعت سے صحیح طور پر طبی دنیا کے سامنے ان کا علمی قد آئے گا، طیب صاحب کے غیر مطبوعہ علمی آثار میں ایک اہم کام ان کا پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ ہے، اس میں انہوں نے مغلیہ دور کے ایک نامور طبیب یوسف بن محمد یوسفی کو موضوع بنایا ہے، ہندوستان میں طبی تاریخ کا سب سے اہم زمانہ، عہدِ مغلیہ ہے، مگر معاصر طبی مورخین نے فارسی مآخذ سے استفادہ کی دشواریوں کی وجہ سے مغلیہ دور کی تاریخ سے صرف نظر کیا ہے، کوثر چاند پوری کی ''اطباء عہد مغلیہ'' اور حکیم الطاف احمد اعظمی کی ''تاریخ طب و اطباء دور مغلیہ'' اور ''ہسٹری آف یونانی میڈیسن ان انڈیا'' کے علاوہ اس عہد کی تاریخ پر منضبط صورت میں کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ حکیم طیب صاحب نے مغل پیریڈ کی تاریخ کی اس تشنگی کو محسوس کرتے ہوئے اس زمانہ کے ایک طبیب کی شخصیت اور اس کے طبی و علمی کاموں کو موضوع تحقیق بنا کر تاریخ طب کی ایک اہم ضرورت پوری کی۔ مغلیہ عہد کی تاریخ پر اب تک جو کام ہوئے ہیں، ان میں طیب صاحب کا تحقیقی مقالہ اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں پہلی بار مغلیہ دور کے کسی طبیب کو مستقل عنوانِ تحقیق بنایا گیا ہے، طیب صاحب کی شخصیت کے بہت سے تفردات ہیں، تاریخِ طب کے باب میں بھی انہوں نے ایک منفرد انداز اپنایا ہے۔

حکیم طیب صاحب اپنے عہد کے ایک مثالی استاذ تھے، وہ مضمون پر عبور کے ساتھ تدریس کے آرٹ سے بھی واقف تھے، اچھا پڑھانے کے لیے طلبہ کے ذہنوں کو پڑھنا بے حد ضروری ہے، طیب صاحب نے اس ضرورت کو سمجھتے ہوئے دورانِ درس ہمیشہ طلبہ کے ذہنوں کو سامنے رکھا، وہ طبّی مسائل کی فلسفیانہ دلائل اور سائنسی توجیہات کے ذریعہ اس طرح عُقدہ کشائی کرتے کہ گنجلک مباحث سہل ہوجاتے اور طبّی فلسفہ داستان سرائی کے بجائے تعقل پسندی کا حامل بن جاتا، مجھے اپنے طالب علمی کے زمانہ میں یہاں کے کسی اور استاذ میں یہ خوبی نظر نہیں آئی، طریقہ درس کے باب میں وہ ہمیشہ میرے آئیڈیل رہے اور میں نے ان کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کی، میرے ٹیچنگ کیریر کی کامیابی انہی کے اسلوب کی تقلید کا ثمرہ ہے۔

حکیم طیب صاحب کے ساتھ مطب و معالجہ کا ایک عہد ختم ہوگیا، دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح، ان کے مطب و معالجہ کا بھی ایک منفرد انداز تھا، عام طور پر اساتذہ اور اسلاف کی تقلید کو یونانی مطبوں کی ایک بڑی امتیازی علامت سمجھا جاتا ہے، اس عمومی روش کے برعکس طیب صاحب کے مطب میں ایک اختراع پسند ذہن نظر آتا ہے، یہی مجتہدانہ اسلوب ان کے مطب کی سب سے ممتاز خصوصیت تھی، اس کا اندازہ ان سیکڑوں معالجاتی واقعات سے ہوتا ہے جو زبان زد خاص و عام ہیں، انہیں سننے کے علاوہ میں خود ان کا مشاہد ہوں، وہ واقعی حذاقت کے مرتبہ پر فائز تھے اور طبیب حاذق کہلانے کے مستحق تھے۔ امراض کی تشخیص اور نسخوں کی تالیف و ترتیب سے ان کے ذہن کی درّاکی اور فنی حذاقت کا پتہ چلتا ہے، میرے سامنے اس قسم کے متعدد واقعات ہیں، ایک بار کثرتِ طمث کی ایک ایسی مریضہ کے ساتھ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا، جو ایک عرصہ سے اس عارضہ میں مبتلا تھی، اس پر کوئی علاج کارگر نہیں ہو رہا تھا، طیب صاحب نے اس کے مرض کی روداد سنی اور مدرِ بول وحیض ادویہ پر مشتمل ایک نسخہ تجویز کردیا، اس میں کوئی بھی حابسِ دم دواء شامل نہیں تھی، جب میں نے اس سلسلہ میں اپنی تشویش کا اظہار کیا تو فرمانے لگے یہاں حبسِ دم کی نہیں تنقیہ کی ضرورت ہے، اور واقعی اس

اصول علاج سے مریضہ شفایاب ہوگئی۔ ایک مرتبہ ان کے پاس مزمن پیچش کا ایک مریض لے کر گیا، انہوں نے مریض سے استفسار کے بعد اسے روغن بیدانجیر استعمال کرنے کی ہدایت کی جو ملینِ امعاء ہونے کی وجہ سے خود دست آور ہے، میں نے اس کی حکمت دریافت کی تو فرمایا کہ اس کی آنتوں میں سدے ہیں، جب تک یہ موجود رہیں گے کوئی علاج سودمند نہیں ہوگا، ان کی تشخیص درست ثابت ہوئی اور سدوں کے اخراج کے بعد مریض کو افاقہ ہوگیا۔

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب نے نسخوں کی تالیف کا بہت صالح ذوق پایا تھا، ان کی اس صلاحیت سے ان کے زیر علاج مریضوں کے علاوہ کئی ادارے مستفید ہوئے ہیں، ان میں دوا خانہ طبیہ کالج خصوصیت سے قابل ذکر ہے، اس کی بیسیوں مصنوعات، طیب صاحب کی تالیف وترتیب کی مرہونِ منت ہیں، اس دواخانہ کے علاوہ معروف تحقیقی ادارہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی نے ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے، کونسل کی کلینکل ریسرچ میں استعمال ہونے والے ابتدائی عہد کے بیشتر نسخے انہی کے تجویز کردہ ہیں۔

حکیم طیب صاحب نے مطب ومعالجہ کی تربیت شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی سے پائی تھی، لیکن انہوں نے اس میدان میں جن بلندیوں کو چھوا ہے وہ کسی بھی لحاظ سے شفاء الملک سے کم نہیں ہے، اگر زمانی تناظر میں دونوں کا موازنہ کیا جائے تو حکیم طیب صاحب یک گونہ فوقیت کے حامل نظر آتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے جس عہد میں یونانی طبیب کی حیثیت سے شہرت اور مرجعیت حاصل کی، ہر سو ایلوپیتھی کا دور دورہ تھا، خود علی گڑھ شہر میں ایلوپیتھی کے سیکڑوں ایسے ڈاکٹر تھے جو اپنے شعبوں میں نہایت ممتاز تھے، ان حالات میں حکیم طیب صاحب کا اپنی حذاقت کا لوہا منوالینا بے حد حیرت ناک واقعہ ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان سے رجوع کرنے والے اکثر مریض، میڈیکل کالج اور دوسرے ایلوپیتھی ڈاکٹروں سے مایوس ہوکر آتے تھے، جبکہ شفاء الملک کا زمانہ بڑا مختلف تھا، ان کے سامنے کوئی مقابل اور مزاحم نہیں تھا، ان کے عہد میں یونانی علاج ہی آخری متبادل تھا، اس طرح شفاء الملک اپنے وقت میں ضرورت سے زیادہ مجبوری تھے، حکیم طیب صاحب نے مطب ومعالجہ کے میدان

میں جو سرخ روئی پائی ہے، وہ خود شفاء الملک کے لیے باعث افتخار ہے، اس لیے کہ وہ ان کے تربیت یافتہ تھے، وہ خود بھی تو یہی چاہتے تھے کہ ان کا یہ عزیز شاگرد طب میں کمال حاصل کر کے ان کا نام روشن کرے، اسی لیے تو انہوں نے اپنی حیات ہی میں حکیم طیب صاحب کو اپنی مسند عطا کر دی تھی۔

آزادی سے پہلے مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے آل انڈیا آیورویدک اینڈ یونانی طبّی کانفرنس کے ذریعہ یونانی طب کی ترویج واشاعت، طبّی تعلیم کی تنظیم وتوسیع سے لے کر طبّی کاز کے لیے جدوجہد اور اطباء کی شیرازہ بندی کے سلسلہ میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ طبّی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ آزادی کے بعد یہ تحریک مفلوج ہوگئی تھی، یونانی طب کے مسائل اس کے احیاء کے متقاضی تھے، اس ضرورت کے لیے حکیم عبدالحمید آگے آئے اور اس کی تنظیمِ نو کا کام انجام دیا، ۱۹۵۲ء سے لے کر اپنی وفات تک وہ اس کے صدر رہے، ان کی وفات کے بعد اس طبّی کارواں کی قیادت کا مسئلہ سامنے آیا تو سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ اب کون مسیح الملک اور حکیم عبدالحمید کی اس وراثت کا امین ہوگا؟ کانفرنس کے عہدۂ صدارت کے لیے اطباء کی اکثریت کی نگاہ میں سب سے موزوں نام پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کا تھا، جب کہ ایک محدود طبقہ اس پر کسی ایسے شخص کو دیکھنا چاہتا تھا، جو ہمدرد کے لیے اس پلیٹ فارم سے کام کر سکے، یہ نزاعی حالات نہ کانفرنس کے حق میں بہتر تھے اور نہ ہی حکیم طیب صاحب ان حالات میں عہدۂ صدارت قبول کرنے کے لیے راضی ہوتے، یہ دونوں باتیں ہماری بدقسمتی کے مترادف تھیں، اطباء میں اتفاق رائے پیدا کرنے اور طیب صاحب کو کانفرنس کی صدارت کے لیے آمادہ کرنے کے لیے میں نے طب کے کچھ دوسرے بہی خواہوں کے ساتھ مل کر کسی طرح اس مسئلہ کو حل کیا اور حیدرآباد میں منعقد کانفرنس کے اجلاس میں متفقہ فیصلہ کے ذریعہ حکیم طیب صاحب کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے، یہ محض ایک انتخاب نہیں تھا، بلکہ ایک طرح کا اعلان تھا کہ حکیم اجمل خاں اور حکیم عبدالحمید کے بعد طبّی قیادت کا اگر کوئی اہل ہے تو وہ حکیم طیب صاحب ہیں۔ انتخاب کے بعد جب طیب صاحب کو گلدستہ پیش کر کے کانفرنس کی طرف سے

تہنیتی رسم ادا کی گئی تو انہوں نے مجھے بلایا اور گلدستہ میری طرف بڑھا کر کہا، میاں نعیم اسے پکڑو! اس کے اصل مستحق تم ہو، میں اس کے جواب میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہہ پایا کہ 'یہ تو آپ کی محبت ہے'۔

حکیم طیب صاحب کی ایک بڑی خوبی جو انہیں معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، وہ قدیم وجدید دونوں طبوں کی معرفت تھی، ان کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے ان دونوں کے درمیان ایک توازن قائم رکھا یہی وجہ ہے کہ وہ نہ تو کبھی طبی روایتوں پر مصر ہوئے اور نہ جدیدیت سے مرعوب، یونانی طب کے ظاہری خدوخال جو اس نئے زمانہ میں کہنہ معلوم ہونے لگے تھے، طیب صاحب کی نظر میں اصلاح کے متقاضی تھے، ان کا خیال تھا کہ جدید ذرائعِ تحقیق کے پاس اس ضرورت کا مناسب سامان ہے، اس کی مدد سے طب کی روایتی صورت کو رنگ و روغن عطا کیا جاسکتا ہے، وہ جدید طب سے مشروط استفادہ کے علاوہ بقدر ضرورت معاصر دیسی طبوں سے بھی اخذ وقبول کے حامی تھے، وہ اس سوچ کے مخالف تھے کہ طب کو روایتوں کے خول میں بند کر کے، اسے محض داستان سرائی کی ایک چیز بنا دیا جائے، طیب صاحب کی ذہنی تربیت لکھنؤ اسکول کے فکری ماحول میں ہوئی تھی، لیکن وہ تنگ نظری سے بہت دور تھے۔ طب کی اصلاح کے سلسلہ میں اپنے ان نظریات کو انہوں نے آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے برہان پور اجلاس میں بہت تفصیل سے پیش کیا تھا، اس کا واقعہ یہ ہے کہ کانفرنس کے صدر حکیم عبدالحمید صاحب کی تجویز پر ایک مقابلہ جاتی سائنٹیفک سشن رکھا گیا تھا، انہوں نے فیصلہ کے لیے حکیم طیب صاحب کی صدارت میں ایک جیوری تشکیل دی تھی، حکیم شکیل احمد شمسی، حکیم عبدالاحد، حکیم سید خلیفۃ اللہ اور حکیم عبدالرزاق کو اس کا رکن مقرر کیا تھا، اس مقابلہ کے اہم شرکاء میں حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، حکیم سید غلام مہدی راز اور پروفیسر انیس احمد انصاری وغیرہ تھے، میں بھی شریکِ مقابلہ تھا۔ ''معجون اذاراقی کی معیار بندی اور اس کے دافعِ التہاب اور دافعِ درد اثرات کا تجرباتی مطالعہ'' کے عنوان سے میں نے مقالہ پیش کیا تھا، میرے ہی مقالہ کو جیوری نے انعام کا مستحق قرار دیا تھا، حکیم طیب صاحب نے بحیثیت صدر، جیوری کے فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے،

صدارتی تقریر میں میرے مقالہ کو بے حد سراہا اور کہا کہ دراصل یہی نہج ہونا چاہیے ہماری تحقیق کا، میرے علاوہ دوسرے سبھی شرکاء کے مقالے لٹریری قسم کے تھے۔

حکیم طیب صاحب کی شخصیت نے ہمارے پورے عہد کو متاثر کیا ہے، ان کے اثرات قبول کرنے والوں میں، میں خود کو سرفہرست پاتا ہوں، مطب و معالجہ، جواب میری شناخت کا ایک لازمہ بن گیا ہے، اس سے میری وابستگی طیب صاحب ہی کا فیضان ہے، اس باب میں وہی میرے مرشد ہیں۔

میرے خیال میں طیب صاحب کی شخصیت سرتاپا ایک نمونہ تھی، جس کا ہر اسلوب قابلِ تقلید تھا، 'آئیڈیل پرسنالٹی' کا لفظ اس کی سب سے موزوں تعبیر معلوم ہوتا ہے، یہ لفظ ان کی شخصیت پر اس طرح منطبق ہوتا ہے، جیسے یہ بطور خاص ان کے لیے ہی وضع کیا گیا ہو۔

حکیم محمد طیب صاحب:
ایک باکمال طبیب اور منفرد انسان

پروفیسر حکیم عبدالمنان
صدر شعبۂ معالجات، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اے ایم یو، علی گڑھ

استاذِ محترم حکیم محمد طیب صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر ۶/جون ۲۰۱۳ء کو تقریباً ۱۱/بجے دن میں ڈیپارٹمنٹ میں موصول ہوئی۔ اس حادثۂ جانکاہ کی خبر سن کر پورا شعبہ سکتہ میں آگیا، جو اساتذہ موجود تھے فوراً ہی ان کی قیام گاہ پہنچے۔ انتقال کی تفصیلات معلوم کر کے سبھی کو بے حد صدمہ ہوا، اس کے ساتھ ہی حکیم صاحب سے تقریباً ۳۵/سالہ دیرینہ ربط و تعلق کی باتیں اور یادیں ذہن میں بازگشت کرنے لگیں۔

میں نے ۱۹۷۴ء میں بی یو ایم ایس میں داخلہ لیا تو حکیم صاحب کالج کے پرنسپل تھے، ان کے رعب اور مخصوص مزاج کی وجہ سے طلبہ و ملازمین ان کے سامنے جانے سے گھبراتے تھے۔ انھوں نے بی یو ایم ایس میں ہماری کوئی کلاس نہیں لی، جب ہمارا داخلہ ایم ڈی علم الادویہ میں ہوا تو اس وقت وہ علم الادویہ میں بحیثیت پروفیسر مفردات پڑھایا کرتے تھے۔ عام طور پر مفردات کا مضمون مشکل اور خشک سمجھا جاتا ہے، لیکن حکیم صاحب کے پڑھانے کا انداز نہایت دلچسپ اور پر مغز ہوتا۔ طلبہ کافی دلچسپی اور ذوق و شوق سے ان کا لکچر سنتے، دورانِ تدریس وہ جدید تحقیقات اور اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات بھی بیان فرماتے، جس سے دلچسپی میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

دورانِ طالب علمی کچھ پیچیدہ قسم کے مریضوں کو لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا، ان کی روداد سن کر حکیم صاحب انہیں جو نسخہ لکھتے، میں اسے ایک قیمتی سرمایہ سمجھ کر اپنی بیاض (ڈائری) میں لکھ لیتا تھا، اس سلسلہ کے چند واقعات جو ذہن پر نقش ہیں، ہدیۂ قارئین ہیں:

ایک بار ایک مریض کو لے کر میں ان کے Chamber میں پہنچا۔ اس وقت وہ یونیورسٹی کے ایک مریض طالب علم کو دیکھ رہے تھے، اس کے احوال سن کر اس کو تنبیہ کے انداز میں سمجھا رہے تھے، اس طالب علم کو ذکاوت حس، جریان اور کثرت احتلام کی شکایت تھی، کسی اناڑی طبیب نے کافی مہنگی دوائیں جو محرک ومقوی باہ تھیں، اسے بنا کر دیں، جس کے استعمال کے بعد فائدہ کے بجائے مرض اور بڑھ گیا، جب وہ دوبارہ حکیم مذکور کے پاس گیا تو اس نے مزید رقم کا مطالبہ کیا اور کہا تم نے بے اصولی کی ہوگی اس لیے فائدہ نہیں ہوا، بالآخر طالب علم حکیم صاحب کے پاس آیا۔ انہوں نے کچھ مسکن ومغلظ ادویہ لکھیں اور فرمایا کی کوئی مقوی ومحرک دوا فی الحال ہرگز نہ استعمال کریں، اس کے علاوہ ہم نے اس کو نفسیاتی طور پر بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی اور لبوب بارد اور اسپغول جیسی ادویہ استعمال کرنے کو کہا، جس کے استعمال کے بعد وہ کافی حد تک ٹھیک اور مطمئن ہو گیا۔

یونیورسٹی فارم ہاؤس پر رہنے والا ایک غریب آدمی عرصہ سے بیمار تھا، اس کا میڈیکل کالج کا علاج چل رہا تھا، لیکن افاقہ نہیں ہو رہا تھا، اسے لے کر میں حکیم صاحب کی خدمت میں پہنچا، حکیم صاحب نے معائنہ کیا اور مجھ سے فرمایا کہ تم خود معائنہ کر کے بتاؤ، میں نے دیکھنے کے بعد عرض کیا کہ جگر کے مقام پر درد ہے اور یہ حصہ نسبتاً گرم محسوس ہو رہا ہے۔ انہوں نے فرمایا کتابوں میں ورم حار پڑھا ہوگا، اس کی واضح علامات اس مریض میں موجود ہیں اور مفردات پر مشتمل جوشاندہ کا ایک نسخہ لکھا، ایک ہفتہ استعمال کے بعد اس کا بخار اور درد وغیرہ کم ہو گیا، مزید ایک ہفتہ استعمال کے بعد وہ الحمد للہ بالکل شفایاب ہو گیا۔

ذاتی مکان کی تعمیر سے قبل حکیم صاحب تار بنگلہ میں مقیم تھے، یہاں نادر علی خاں صاحب

ان کے پڑوسی تھے، ان سے ملاقات کے لیے حکیم صاحب اکثر تشریف لے جایا کرتے تھے اور ان کا بڑا اکرام فرماتے تھے، انہیں سے اپنے مکان کا سنگ بنیاد بھی رکھوایا۔

حکیم طیب صاحب تار بنگلہ کی مسجد میں پابندی سے جمعہ کی نماز ادا کرتے تھے، خطبہ سے قبل پروفیسر علی احمد صاحب مرحوم تقریر کرتے تھے، حکیم صاحب ان کی تقریر بہت توجہ سے سنتے تھے، جب علی احمد صاحب بیمار ہوئے تو میں انہیں لے کر حکیم صاحب کے گھر گیا، بیماری کی ساری تفصیلات سننے اور رپورٹیں دیکھنے کے بعد انہوں نے فرمایا، آپ لوگوں نے بہت تاخیر کردی۔ مجھ سے تنہائی میں فرمایا! ابھی چند ہفتہ قبل جمعہ میں یہ تقریر کر رہے تھے، کیسے اس حالت کو پہنچ گئے؟ دراصل ان کو Pleural Effusion کی شکایت تھی اور ایک ماہر ڈاکٹر کے مشورہ سے دافعِ دق ادویہ استعمال کر رہے تھے، جس کی وجہ سے تلیفِ کبد اور استسقاء ہو گیا۔ حکیم صاحب نے نسخہ تجویز کیا اور مجھ سے تنہائی میں فرمایا انجام بہتر نظر نہیں آتا، چنانچہ چند ہفتہ بعد علی احمد صاحب کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کی خبر سے حکیم صاحب کو بہت صدمہ ہوا۔

حکیم صاحب کا تعلق ایک مذہبی اور شریف خاندان سے تھا، ان کے والد جناب طاہر صاحب حافظِ قرآن تھے، وہ بارہ بنکی کچہری میں ملازم تھے، نہایت ایمان دار و دیانت دار، ڈیوٹی کے پابند اور رشوت وغیرہ سے بہت دور تھے۔ عام لوگ ان کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن وہاں کا عملہ رشوت نہ لینے کی وجہ سے ان سے ناراض رہا کرتا تھا۔ چنانچہ فیض آباد کمشنری میں ان کی جھوٹی شکایت کردی گئی، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ حافظ صاحب تو انتہائی ایمان دار اور محنتی آدمی ہیں۔ جب کمشنر کو تفصیلات معلوم ہوئیں تو اس نے اصرار کر کے حافظ صاحب کو اپنے یہاں فیض آباد بلا لیا۔

ہماری یونیورسٹی کے ایک محترم استاذ، جو ہم سب کے محسن و مشفق ہیں، حکیم صاحب کو وقتاً فوقتاً دینی کتابیں بھجوایا کرتے اور کبھی کبھی خود بھی ملاقات کے لیے جایا کرتے تھے، ان کتابوں کو پڑھ کر حکیم صاحب میں کافی تبدیلی پیدا ہوئی، دنیا سے بے رغبتی بڑھ گئی، آخرت اور

موت کا استحضار رہنے لگا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد حکیم صاحب کی زندگی میں ایک طرح سے انقلاب آگیا تھا، سب سے پہلے انہوں نے حج کا فریضہ ادا کیا، نماز کے تو پہلے سے پابند تھے، ان کے بعض قریبی احباب سے معلوم ہوا کہ وہ تہجد بھی پڑھا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک بڑی رقم نادار طلبہ میں بہت خاموشی سے تقسیم کرائی ہے۔ حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ کی حیات پر ان کے فرزند مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی صاحب نے 'سیرت نعمانی' تصنیف کی، جسے انہوں نے طیب صاحب کو مطالعہ کے لیے پیش کیا۔ انتقال سے چند روز قبل جب عتیق الرحمٰن صاحب ان سے ملنے تشریف لے گئے تو فرمایا کہ آپ نے ایسی عمدہ کتاب پڑھنے کو دی کہ میں سوچتا رہا جب اس دور میں ایسی ہستیاں گزری ہیں، جنہوں نے ایسا عظیم کام انجام دیا تو امام غزالی، امام رازی وغیرہ اکابر کیسے بابرکت لوگ ہوں گے۔ اپنے اوپر افسوس ہوتا ہے کہ ہم لوگ کس زمرے میں ہوں گے۔ مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتاب "غصہ کو ضبط کیجئے" کے بارے میں فرمایا کہ میں اس کو پڑھ غصہ کو بہت ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر پھر بھی غصہ آجاتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کوشش کرتے رہیے آپ اسی کے مکلف ہیں۔

ہمارے شعبہ کا ایک ملازم، جس کا تقرر حکیم صاحب نے کیا تھا، وہ شکر گذاری کے جذبہ کی تحت وقتاً فوقتاً حکیم صاحب کے گھر جا کر پوچھ لیتا کہ کوئی خدمت ہو تو بتائیں، لیکن حکیم صاحب اپنا سارا کام خود کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ کھانا بھی خود ہی بنایا کرتے تھے۔ وہ ملازم ان کے بجلی کا بل کبھی کبھار جمع کر دیا کرتا تھا، اس کے صلہ میں حکیم صاحب نے اس کو اپنا اسکوٹر جو بالکل نیا تھا، بہت کم داموں میں دے دیا، پھر کچھ دنوں کے بعد اسے بلا کر وہ معمولی رقم بھی واپس کردی، جو اس نے اسکوٹر کے عوض انہیں پیش کی تھی۔ اس کے بچے کی شادی اور مکان کی تعمیر میں حکیم صاحب نے اس کا کافی تعاون کیا۔ ایک دن اسی ملازم کے ذریعہ مجھے اپنے گھر بلوایا اور دریافت فرمایا کہ آپ لوگ کوئی مدرسہ چلاتے ہیں؟ میں نے اس کے بارے میں بتایا تو بہت خوش ہوئے اور ایک بڑی رقم غریب طلبہ کے لیے عنایت کی۔ ایک بار میں حکیم صاحب کو

مدرسہ لے آیا، دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آپ لوگوں نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

دوبرّہ کے ایک علاقہ میں مسجد کی شدید ضرورت تھی، اس کے چندہ کے لیے محلّہ کے لوگ حکیم صاحب کے پاس پہنچے، ان سے تفصیلات سننے کے بعد حکیم صاحب نے دس ہزار کا ایک چیک ان حضرات کے حوالے کردیا، مگر اگلے دن انہوں نے فون کر کے ان لوگوں کو اپنے گھر بلایا اور دیا ہوا چیک واپس لے لیا اور تقریباً ۴۰ رمنٹ ان سے مسجد کے سلسلے میں استفسار کرتے رہے، ان لوگوں کو لگا کہ اب یہ دس ہزار روپے بھی گئے، تبھی اچانک حکیم صاحب نے ایسا جملہ کہا کہ سب چونک گئے اور ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی، حکیم صاحب نے فرمایا کہ کیوں نہ میں ہی مسجد کی پوری زمین خرید کر ہدیہ کردوں اور تقریباً ۲۰۰ رگز زمین خرید کر مسجد کو ہبہ کردیا۔

مسجد تعمیر ہونے کے بعد یہ حضرات حکیم صاحب کے پاس پہنچے اور عرض کیا، ہم چاہتے ہیں کہ مسجد کا نام آپ کے نام پر رکھا جائے، حکیم صاحب نے فرمایا، اگر آپ حضرات مسجد کو مجھ سے منسوب کرنا چاہتے ہیں تو اس کا نام میری والدہ محترمہ کے نام پر رکھ دیں، ان کے کہنے پر یہ مسجد ”مسجد زبیدہ طاہر“ کے نام سے موسوم ہے۔

محترم جناب عثمان صدیقی صاحب حکیم صاحب کے ہموطن اور ان کے رشتہ دار ہیں، ان کے اندر خدمت اور ایثار کا بے حد جذبہ ہے، لوگوں کے کام آنا، ان کے مسائل کو اوڑھ لینا ان کے خصوصی اوصاف ہیں، ان کے ذریعہ حکیم صاحب کے متعلق کافی اہم باتیں معلوم ہوئیں، انہوں نے بتایا کہ جب وہ حکیم صاحب کے والد محترم جناب حافظ طاہر صاحب کے انتقال سے قبل ان کی عیادت کے لیے گئے تو انہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اچھا ہوا تم آگئے، میں تم کو ہی یاد کر رہا تھا اور پھر کہا کہ میرا بڑا بیٹا علی گڑھ میں ہے، نہایت ذہین اور باصلاحیت ہے، البتہ اس کے مزاج میں غصہ بہت ہے، تم اس کا خیال رکھنا۔ جناب عثمان صاحب نے ان کے والد کی اس بات کو عمر بھر نبھایا، وہ حکیم صاحب کے پاس اکثر جایا کرتے تھے، کبھی کبھی اپنے گھر سے ان کے پسند کی کوئی چیز پکوا کر لے جایا کرتے، بیماری میں ان کی

خدمت اور علاج و دوا کا انتظام کرتے۔

طبیہ کالج کی پرنسپل شپ کے دوران حکیم صاحب پر کافی حوصلہ شکن حالات پیش آئے، طلبہ نے اسٹرائک کر دی تھی، وہ حکیم صاحب سے استعفیٰ کا مطالبہ کر رہے تھے۔ عثمان صاحب نے اس موقع پر حکیم صاحب کا کھل کر ساتھ دیا، ہمت کے ساتھ طلبہ سے مل کر ان کو سمجھایا اور مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا۔ حکیم صاحب ان سے کافی بے تکلف تھے اور ذاتی معاملات میں ان سے مشورہ کیا کرتے، عثمان صاحب نے بتایا کہ انتقال سے قبل حکیم صاحب نے ان کو بلوایا اور ان کے توسط سے بھائی بہنوں کو ایک بڑی رقم بطور ہدیہ بھجوائی۔ حکیم صاحب کے انتقال سے کچھ دن پہلے عثمان صاحب اپنی فیملی کے ساتھ ان کے گھر گئے، حکیم صاحب نے ان سے فرمایا کہ انہوں نے بڑا عجیب خواب دیکھا ہے کہ ان کی موت ہو گئی ہے اور انہوں نے خود ہی غسل میت دیا اور خود ہی کفن پہن لیا اور خود سے قبر میں جا کر لیٹ گئے۔ اس کے بعد آنکھ کھل گئی۔ عثمان صاحب نے اپنے بھائی مولانا فرقان صاحب سے اس کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ بہت مبارک خواب ہے، اس سے حکیم صاحب کی خودداری کا پتہ چلتا ہے۔

حکیم طیب صاحب کا ۱۹۵۰ء میں اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ ہوا، انہوں نے امتیازی نمبروں کے ساتھ BUTS کی ڈگری حاصل کی، اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں بطور ہاؤس فزیشین ان کا تقرر ہوا، اس وقت شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی صاحب پرنسپل تھے اور مطب کرتے تھے، حکیم طیب صاحب پابندی سے ان کے ساتھ مطب میں بیٹھتے، مریضوں کا معائنہ کرتے اور نسخہ قلمبند کرتے۔ حکیم عبداللطیف صاحب زمانہ طالب علمی ہی سے حکیم طیب صاحب کی ذہانت کے قائل تھے، مطب میں بعض پیچیدہ امراض کے سلسلہ میں شاگرد ہونے کے باوجود ان سے مشورہ کیا کرتے تھے، اس قسم کے کئی واقعات حکیم صاحب نے خود لکھے ہیں:

۱- قاضی عبدالغفار صاحب، جو حکیم اجمل خاں کے ہم عصروں میں تھے، تلیف کبد میں مبتلا تھے، حکیم عبداللطیف فلسفی صاحب کے زیرِ علاج تھے، اچانک ان کو ہچکیاں شروع ہو گئیں، کئی دوائیں بدلی گئیں مگر افاقہ نہیں ہوا، طیب صاحب سے ذکر کیا کہ کیا

تجویز کیا جائے؟ حکیم طیب صاحب نے عرض کیا کہ کچے دودھ کا جھاگ، جس کی گرمی ابھی کم نہ ہوئی ہو دیا جائے۔ فلسفی صاحب نے قاضی صاحب کے یہاں اطلاع بھجوائی، اسی دن رات تک ہچکیوں میں افاقہ ہو گیا۔

۲- فلسفی صاحب صدر جمہوریہ ذاکر حسین صاحب مرحوم کے بھی معالج تھے، ذاکر صاحب کے پیر کے گٹے میں درد رہا کرتا تھا، علاج کے باوجود بھی ٹھیک نہیں ہو رہا تھا۔ فلسفی صاحب نے طیب صاحب سے ذکر کیا تو انہوں نے روغنِ بلساں اور روغنِ زیتون کی مالش کرنے کا مشورہ دیا، صدر جمہوریہ کی خدمت میں یہ روغن پیش کئے گئے، ان کے استعمال سے کافی افاقہ ہوا۔

حکیم عبد اللطیف فلسفی صاحب کے زیادہ تر نسخے ان کے اپنے ایجاد کردہ تھے، وہ چاہتے تھے کہ یہ ضبطِ تحریر میں آجائیں، چنانچہ انہوں نے ان نسخوں کو حکیم طیب صاحب سے نوٹ کرنے کو کہا، طیب صاحب نے انہیں نوٹ کرنا شروع کر دیا۔ مگر طویل علالت کے دوران وہ ڈائری کسی نے غائب کر دی، جس کا حکیم صاحب کو کافی صدمہ رہا۔ ان میں سے چند نسخے جو محفوظ رہ سکے، ان کو نقل کیا جا رہا ہے:

۱- ناسور میں تازہ نمکولی کا دودھ بھر دیں، بے حد مفید ہے۔

۲- فواق (ہچکی) خواہ کسی سبب سے ہو، تازہ کریلے کا پانی دن میں کئی بار دیں نفع ہوگا۔

۳- خونی پیچش اور ذرب میں رال سفید ۳ ر گرام ہمراہ دہی، دن میں تین بار دیں۔

۴- اگر عورت میں سمن مفرط کے ساتھ احتباس طمث ہو تو نانخواہ، تخم سداب، زیرہ سیاہ، مرزنجوش، بورہ ارمنی اور لک مغسول کا سفوف کر کے ۳ ر گرام عرق پودینہ کے ساتھ دیں۔

۵- صلابت طحال میں اشق، کتیرا، اصمغ عربی اور زراوند، سرکہ انگوری میں پیس کر ضماد کریں اور اشق، پوست بیخ کنیر، برگ جھاؤ، فلفل سفید، لہسن، پیاز دشتی پانی میں پیس کر چنے کے برابر گولیاں بنائیں اور ۴ ر گولی شہد کے پانی میں حل کر کے سوتے وقت دیں۔

۶- ضعفِ معدہ اور دردِ معدہ کے لیے گندھک اور جوہر نوشادر، ہر ایک ۱۰ ر گرام پہلے آب مولی

میں کھرل کریں پھر سرکہ مقطر میں خوب کھرل کریں اور خشک ہونے پر ست اجوائن، ست پودینہ، ہر ایک ا رگرام ملا کر رکھ لیں اور ۱۲۵ رملی گرام دن میں دو بار دیں۔

۷-استسقاء زقی کے لیے تھوہڑ کے دودھ میں آٹا گوندھ کر رکھ لیں اور چنا برابر قرص بنا کر دو عدد تین روز تک ایک دن ناغہ کر کے دیں۔

۸-ذیابیطس کے لیے روغن زردیٔ بیضۂ مرغ ۱۰ رقطرہ ایک پیالی دودھ میں ڈال کر پئیں۔

۹-آنکھ کی سرخی کے لیے کندر ۳ رگرام، عرق گلاب ۵۰ رملی لیٹر میں اچھی طرح حل کر کے رکھ لیں اور دن میں تین بار قطور کریں۔

۱۰-بچوں کے دیدان صغار کے لیے نارجیل کہنہ کھلانا اور ایلوا کو سرکہ میں پیس کر فتیلہ بنا کر مقعد میں رکھنا مفید ہے۔ مذکورہ نسخے 'مطب لطیف' مرتبہ حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی سے ماخوذ ہیں۔

ذیل میں حکیم محمد طیب صاحب کے کچھ مجرب نسخے، جنہیں میں نے مختلف مریضوں کو حکیم صاحب کو دکھانے کے بعد اپنی ڈائری میں نوٹ کیا تھا، تحریر کر رہا ہوں:

۱-نسخہ برائے حرقت البول:

شورہ قلمی ا رگرام، ست بارز د ۵۰۰ رملی گرام، سفوف اول بخور رند، عقب آں تخم سروالی ۶ رگرام، حب کاکنج ۴ رگرام، خار خسک خرد ۶ رگرام، تخم خربزہ ۶ رگرام، تخم خیارین ۶ رگرام، آلو بالو ۴ رگرام در آب جوشانیدہ ہمراہ شربت فالسہ ۲ رتولہ حل کردہ بنوشند، صبح شام۔

۲-نسخہ برائے وجع المفاصل:

اسگند، مالکنگنی، زنجبیل خشک، خولنجان، چرائتہ شیریں، سورنجان، ناخونہ، خار خسک، زیرہ سفید، ہر ایک ۲۰ رگرام سفوف کر کے ۶ رگرام صبح و شام استعمال کرائیں۔

۳-دیگر نسخہ، برائے وجع المفاصل:

کچلہ مدبر، قسط شیریں، جدوار خطائی، اسگند، زنجبیل، ہر ایک ۱۰ رگرام، جوا کھار ۶ رگرام،

خارخسک ۱۰ر گرام، سفوف ساختہ ۶ر گرام بعد ناشتہ۔

۴۔نسخہ برائے صرع:

عودصلیب، جدوار، اسطوخودوس، ہرایک ۱۰ر گرام، حب بلساں، عودخام، برہمی بوٹی، سنکھا ہولی، حب الغار، جند بیدستر، وج ترکی، خولنجان، ہرایک ۶ر گرام، زعفران ۴ر گرام، قرنفل گلدار ایک گرام سفوف کر کے بقدر نخود گولیاں بنالیں۔۲رعدد صبح وشام پانی کے ساتھ استعمال کریں۔

۵۔نسخہ برائے تقویت باہ:

تخم کونچ سفید ۵۰ر گرام، کنجد سفید ۲۰ر گرام، خصیۂ بز، بیر بہوٹی، ہرایک ۵۰ر گرام، ماہی روبیاں ۳ر گرام، جند بیدستر، ریگ ماہی، ہرایک ۱۰ر گرام، مغز سر کنجشک ۳۰ر گرام، خراطین مصفی ۲ر گرام، جاوتری ۶ر گرام، حب بلساں، سلاجیت، ہرایک ۱۰ر گرام، زعفران ۲ر گرام، عنبر ار گرام، جائفل ۲ر گرام، ثعلب پنجہ، تودری سفید، خارخسک خرد، ہرایک ۱۰ر گرام کا شہد میں معجون تیار کریں۔مقدار خوراک ۶ر گرام صبح شام۔

حکیم صاحب مرحوم سے دیرینہ ربط وتعلق کی بنا پر ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، خودغرضی اور مادہ پرستی کے اس دور میں ان کی شخصیت انتہائی بے غرض، بے لوث، مخلص اور بے باک تھی۔ انتظام وانصرام کی صلاحیتوں کے باوصف وہ ایک بے مثال مدرس اور بحرِ تحقیق کے عظیم شناور تھے، بیک وقت ان کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے طب کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے شعبۂ فارسی سے ۱۹۷۰ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔

فنی مہارت اور علاج ومعالجہ میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا، طب قدیم وجدید پر ان کی مضبوط گرفت تھی۔خلقِ کثیر نے ان کی حذاقت سے استفادہ کیا ہے، ان کی رحلت طبی حلقوں کے لیے ایک سانحۂ عظیم ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ طب کے اس بے لوث خادم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔آمین!

حکیم محمد طیب کے معالجہ کا ایک معجزاتی واقعہ

حکیم صغیر احمد صدیقی

اسسٹنٹ ڈائرکٹر، لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

اطباءِ قدیم کے سوانحی حالات میں بہت سے ایسے معالجاتی واقعات تحریر ہیں، جنہیں پڑھ کر عقل حیران رہ جاتی ہے اور ان کی صحت پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے، کتبِ تاریخ میں اس طرح کے سیکڑوں محیر العقول واقعے بآسانی مل جائیں گے۔ بعض اوقات یہ معالجاتی واقعات اتنے حیرت انگیز ہوتے ہیں کہ کسی افسانوی داستان کا حصہ معلوم ہوتے ہیں، انہیں پڑھ کر قاری کوئی تاثر لینے کے بجائے، مورخ کی تخیلاتی جدت طرازی سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں اور اس کے بعد جب بھی طبّی تاریخ کے مطالعہ کا اتفاق ہوا تو اس قسم کے واقعوں کو پڑھنے کے بعد ان کی بابت میری جو رائے بنی، وہ عوامی رائے سے بالکل مختلف نہیں تھی، انہیں پڑھ کر میں بھی تقریباً انہیں احساسات سے دو چار ہوا، جو ایک عام آدمی کے ہو سکتے ہیں، دراصل یہ معالجاتی واقعات ہیں ہی اتنے حیرت ناک کہ ان پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور عقل انہیں ماننے سے انکار کر دیتی ہے، لیکن خود اپنی نگاہوں کے سامنے اس طرح کے واقعے ظہور پذیر ہوں تو ان پر یقین نہ کرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ ایک عرصہ تک میں تاریخ کے جن بیانوں کو داستان طرازی سمجھتا رہا، ان کے بارے میں مجھے اپنی سابقہ رائے بدلنی پڑی اور ان کی واقعیت پر یقین کرنا پڑا۔ میرے ان ذہنی رویوں کی تبدیلی کی وجہ

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی ذات گرامی ہے، جو ہمارے عہد کے ضرور تھے، مگر علمی، فنّی اور پُر وقار شخصیت کے لحاظ سے دراصل وہ اطباء سلف کا نمونہ تھے، انہوں نے یونانی معالجہ کی جو تاریخ رقم کی ہے، وہ کسی طرح ماضی کے اطباء سے کم حیرت ناک نہیں ہے۔ تقریباً ۳۳ر برس پہلے جب میں طب کا ایک نوجوان طالب علم تھا، اس وقت میری حکیم طیب صاحب سے صرف اتنی شناسائی تھی کہ میں نے اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ کے ایک سینئر استاذ کے طور پر ان کا نام سن رکھا تھا، طب سے ربط و تعلق بڑھنے کے ساتھ ان کے نام کی صدائے بازگشت کچھ تیز محسوس ہوئی، جو امتداد وقت کے ساتھ مزید بڑھتی گئی، لیکن فنّی شعور کی بالیدگی اور طب سے پیشہ ورانہ رشتہ استوار ہونے کے بعد، میں کہہ سکتا ہوں کہ میں نے ان کے نام کا ڈنکا بجتے سنا ہے، اگر واقعی زبانِ خلق نقارۂ خدا ہوتی ہے تو حکیم محمد طیب صاحب کے علاجی واقعات کی اس زمانہ میں جس قدر گونج سنائی دیتی ہے، اس کی بنیاد پر بلاشبہ وہ جالینوسِ وقت اور بقراطِ زماں کہے جانے کے مستحق ہیں۔

جنوری ۱۹۷۹ء میں طبی تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۲ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو میں رشتۂ ازدواج سے منسلک ہوا، میری شریک حیات ڈاکٹر سلمیٰ خاتون، سعادت علی صدیقی صاحب کی صاحبزادی تھیں، جو اس وقت دواخانہ طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے منیجر تھے، ان سے حکیم محمد طیب صاحب کے دوستانہ مراسم تھے، اس لیے گھر پر اکثر ان کا ذکر رہتا، ان تذکروں کے ذریعہ میری ان سے مزید واقفیت بڑھی، اب تک میں نے طیب صاحب کے تعلق سے، ان کی فنّی حذاقت کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، یہاں انہیں مزید تفصیل سے سننے اور جاننے کا موقع ملا، لیکن تاحال ان سے میرا کوئی براہ راست واسطہ نہیں ہو سکا تھا، مگر میں ان کے بارے میں بہت کچھ جان چکا تھا۔ ان سے بالمشافہ ملاقات کی سبیل قدرت نے کچھ اس طرح پیدا کی کہ میں پہلی بار ان سے بحیثیت مریض ملا، اس طرح وہ باتیں، جنہیں اب تک سنتا آ رہا تھا، بچشم خود دیکھنے کا موقع ملا، اس کی بنیاد پر میں کہہ سکتا ہوں کہ حکیم طیب صاحب کی معجزانہ حذاقت کو نہ صرف میں نے دیکھا ہے، بلکہ میں خود اس سے مستفید ہوا ہوں۔ ہوا یوں کہ

نومبر ۱۹۹۱ء میں، میں سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، پٹنہ میں بحیثیت ریسرچ ایسوسی ایٹ ملازم تھا، ایک روز میری دائیں ہتھیلی کی پشت پر یکا یک درد اٹھا، اس کی نوعیت ایسی تھی جیسے کسی نے چاقو گھونپ کر چھوڑ دیا ہو، رفتہ رفتہ درد کی شدت اور اس کا دائرہ بڑھنے لگا، کچھ دیر بعد یہ ناقابلِ برداشت ہوگیا اور میں اس کی شدت سے تڑپنے لگا، جب یہ درد اٹھا تھا، اس وقت میں انسٹی ٹیوٹ میں بیٹھا ڈیوٹی کر رہا تھا، اس ناگہانی واقعہ سے بھی حیران و پریشان تھے، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا، میرے آفس کے ایک ساتھی ڈاکٹر سکندر علی خاں، جو پٹنہ میڈیکل کالج کے فارغ تھے، انہوں نے درد کی تسکین کے لیے ایک انجکشن دیا، لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا، پھر پٹنہ کے کئی ماہرین سے رجوع کیا، پر کوئی کامیابی نہیں ملی، بالآخر ڈاکٹر نریندر نارائن کے پاس پہنچا، وہ نالندہ میڈیکل کالج میں آرتھوپیڈک ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ تھے، اس وقت پٹنہ میں ان کی حذاقت کا بڑا چرچا تھا۔ اس زمانہ میں وہ اپنے ذاتی کلینک پر ۶۰۰/روپے کنسلٹیشن فیس لیا کرتے تھے، انہوں نے میرے مرض کی روداد سنی اور کئی جانچیں کروائیں، لیکن میرا خیال ہے کہ وہ حتمی طور پر کسی تشخیصی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکے تھے، کئی دواؤں کا تجربہ کیا، لیکن سب بے سود رہا، بالآخر اس مرض کے بارے میں مایوسی کا اظہار کیا، تاہم انہوں نے کہا کہ آخری علاج کے طور پر ایک انجکشن کا تجربہ کیا جاسکتا ہے، جس کی قیمت اس وقت تقریباً پانچ ہزار روپے تھی، ان کا خیال تھا کہ اس سے درد میں کسی قدر تخفیف تو ہو جائے گی لیکن مکمل آرام نہیں، ساتھ ہی آگاہ کیا کہ جگر، گردوں اور نظامِ اعصاب وغیرہ پر اس کے شدید جانبی اثرات ہو سکتے ہیں، جو مہلک صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں، میں اُن کے اس تجربہ کے لیے تیار ہو جاتا، لیکن انہوں نے بتایا کہ اس انجکشن سے درد سے تو آرام مل سکتا ہے، اس کے باوجود میں تاحیات ہاتھ اور پیروں سے کچھ کرنے سے معذور ہی رہوں گا اور اب کبھی اس موذی مرض سے مکمل طور پر شفایاب نہیں ہوسکوں گا۔
ان کا یہ بیان میرے لیے بے حد مایوس کن اور حوصلہ شکن تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ جب زندگی اپاہج بن کے ہی گزارنی ہے تو پھر ایسی مہلک دواؤں کا تجربہ فضول ہے، میں نے اپنے آپ کو

قدرت کی مشیت پر چھوڑ دیا، میری اس مرضی کیفیت سے گھر اور سسرال کے سبھی لوگ پریشان تھے اور دواؤں سے زیادہ دعاؤں کا سہارا تھا، انہی حالات میں عزیزوں کا فیصلہ ہوا کہ کیوں نہ اس موقع پر حکیم طیب صاحب کو بھی دکھالیا جائے، اس کے بعد ان سے ملنے کا پروگرام بنا۔

یہ درد، دوروں کی صورت میں ایک روز کے وقفہ سے چار، پانچ بجے شام میں شروع ہوتا اور مغرب تک اپنی شدت کو پہنچ جاتا، ہتھیلی کی پشت سے شروع ہونے والا یہ درد اب پورے جسم تک پھیل چکا تھا، درد اتنا شدید ہوتا کہ کروٹ تک نہ بدلی جاتی، ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر سونے سے پہلے سہارے سے بیٹھنا ہوتا، پھر دوسرے پہلو پر لیٹ پاتا۔ چونکہ یہ درد دوروں کی صورت میں ایک روز کے ناغہ سے ہوتا، اس لیے طے ہوا کہ پٹنہ سے علی گڑھ پہنچنے کے لیے وقفہ کے دن کا انتخاب کیا جائے، تاکہ سفر میں درد کی پریشانی نہ ہو، حسب پروگرام ہم سب طیب صاحب کی خدمت میں علی گڑھ پہنچے، انہوں نے مرض کی تفصیل سننے کے بعد فرمایا کہ یہ اس قسم کے مریضوں سے میری معالجاتی زندگی کا تیسرا واسطہ ہے، ان کی اس بات سے حوصلہ ملا اور ڈھارس بندھی کہ ہوسکتا ہے کہ خدائے شافی ان کے زیر علاج اس مرض کے دوسرے دو مریضوں کی طرح مجھے بھی شفا دے۔ انہوں نے جو دوائیں تجویز کی تھیں وہ بظاہر سادہ اور عام تھیں، مگر ان کی تاثیر بے حد کرشماتی تھی۔ سفوف وجع المفاصل ۶ رماشہ کے ہمراہ اوجاعیہ اور منعش کی دو دو گولیاں صبح وشام کھانے کے لیے دیا۔ اس کے ساتھ برگ شاہترہ، چرائتہ، گل بنفشہ، گل بابونہ، چوب چینی نیم کوفتہ اور بوزیدان کا جوشاندہ ہمراہ شربت آلو ۲۰ رملی لیٹر صبح وشام ایک ہفتہ تک استعمال کرنے کو کہا۔ مزید بتایا کہ اس جوشاندہ سے معمولی اسہال ہوسکتا ہے، اور ہوا بھی یہی، جب ایک ہفتہ بعد میں ان کے پاس دوبارہ گیا تو انہوں نے دستوں کے لیے جوارش مصطگی ۶ رگرام بعد غذا کا اضافہ کیا، باقی دوائیں بدستور جاری رکھیں۔ سفوف، حبوب اور جوشاندہ کے ان نسخوں کے ساتھ گل بابونہ اور گل ٹیسو کو نمک لاہوری کے ساتھ اُبال کر پورے جسم پر اس کی بھاپ لینے کو کہا، اس کی ترکیب یہ بتائی کہ دواؤں کو اُبال کر کھرّی کھاٹ کے نیچے رکھ کر اس کھاٹ پر کمبل اوڑھ کر سو جاؤں تاکہ بھاپ کے اثرات سارے جسم میں سرایت کر جائیں، ان

کی تاکید تھی کہ بھاپ لینے کے دوگھنٹہ کے بعد، روغنِ موم، روغنِ قسط، روغنِ بابونہ، روغنِ مالکنگنی، ہرایک ۲۰ ملی لیٹر باہم ملاکر پورے جسم پر مالش کی جائے۔

ان دواؤں کے چار پانچ روز کے استعمال کے بعد درد کی شدت میں بتدریج کمی آنے لگی اورایک ماہ کے استعمال سے مکمل افاقہ ہوگیا۔

پہلی بار ۲/دسمبر ۱۹۹۱ء کو میں حکیم طیب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا، اس طرح اس واقعہ کو تقریباً بائیس برس ہونے کو ہیں اور میں صحت مند زندگی گزار رہا ہوں۔ یہ تھی پروفیسر حکیم محمد طیب کی مسیحائی کی ایک داستان، جو ان سے منسوب فنی مہارت کے ان سیکڑوں واقعات کی تصدیق کرتی ہے، جو عوام وخواص میں مشہور ہیں، ان کا یہ معجزاتی واقعہ ایک ایسے دور کا ہے، جس میں جدید طب کا غلغلہ ہے اور ایلوپیتھی کا سورج نصف النہار پر پہنچا ہوا ہے، اس عہد میں حکیم محمد طیب کے ذریعہ یونانی دواؤں کے حیرت انگیز عملی مظاہرے، یونانی طب کی موجودہ نسل کے لیے بے حد حوصلہ بخش ہیں۔ یہ واقعہ اس بات کا اعلانیہ بھی ہے کہ آج بھی یہ طریقۂ علاج جادوئی تاثیر کا حامل ہے، لیکن شرط ہے کہ حکیم طیب جیسا نباض اور مسیحانفس ہو۔

حکیم محمد طیب بحیثیت معالج

حکیم وسیم احمد اعظمی

ڈپٹی ڈائرکٹر (یونانی) سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، لکھنؤ

آزاد ہندوستان میں جن اطباء نے اپنی طبّی حذاقت کے گہرے نقوش دلوں پر چھوڑے ہیں، ان میں حکیم محمد طیب (۱۹۳۲ء-۲۰۱۳ء) کا نام بہت ممتاز ہے۔ ان کے مطب میں روایتوں کا التزام بھی تھا اور جدید اختراعات کا احترام بھی، تاہم طبّی کلیات اور مبادیات کی بنیاد پر کہیں سمجھوتا نہیں تھا۔ طب کی تھیوریز اور فلاسفیز ان پر واضح تھیں، دراصل ان کی معالجاتی زندگی کی تشکیل میں قدیم طبّی ادبِ عالیہ کے مطالعہ، بالخصوص اطباءِ قدیم کے کلینکی مشاہدات پر گہری نظر اور شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی (وفات: ۱۹۷۰ء) کی صحبت نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ اپنی طبّی تعلیم کے تیسرے سال سے ہی شفاء الملک کے ساتھ ان کے مطب میں بیٹھنے لگے تھے۔ درحقیقت وہ شفاء الملک کے سب سے معتبر، زود فہم، رمز شناس، وسیع النظر اور حذاقتی فراست سے آراستہ شاگرد تھے۔ شفاء الملک مرحوم ان پر بہت اعتماد کرتے تھے۔

حکیم محمد طیب کے مطب ومعالجہ کے بارے میں، میں نے اپنے ایک مضمون میں ضمنی طور پر لکھا تھا کہ یہ ان کی ذہنی ساخت اور مزاجی کیفیات سے میل نہیں کھاتا تھا، کیونکہ ان کی تنک مزاجی، بلکہ کرختگی ضرب المثل تھی، اچھے اچھے ان کے سامنے پڑنے سے کتراتے تھے۔ ایسے میں مختلف الطبائع مریضوں سے پہروں جوجھنا، ان کی طبیعت کے قطعی منافی تھا،

لیکن سچائی یہی ہے کہ انہوں نے ابتداء میں شفاء الملک مرحوم کے ساتھ اور بعد میں آزادانہ مطب کیا، بہت بھراپُرا اور کامیاب مطب، یہ سلسلہ جو ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا تھا، ۲۰۱۳ء تک قائم رہا، یعنی پورے ۶۰ر برس، ۸۱ر سالہ زندگانی کے ۶۰ر برس۔

حکیم محمد طیب طب کے دبستانِ لکھنؤ کے پروردہ تھے، ان کے نسخوں کی جہت اور اصول، لکھنؤ اسکول کی نمائندگی کرتے تھے، لیکن انہوں نے اس دبستان کے بعض اطباء کی طرح اپنے نسخوں میں شاعری نہیں کی، کہ برگ سے نسخہ شروع کیا تو برگ پر ہی ختم کیا اور گل سے ابتداء کی تو گل پر ہی اختتام ہوا۔ اس طرح کے واقعات کو بعض طبّی مورخین نے نہ معلوم کیوں لکھنؤ اسکول کے امتیازات میں شمار کیا ہے؟ حکیم محمد طیب کا مطمحِ نظر صرف صحت کا حصول اور اس کی بقاء تھا، بغیر کسی رنگ اور آہنگ کے۔

حکیم محمد طیب کی پرورش و پرداخت اگرچہ طب کے لکھنؤ اسکول کے زیر سایہ ہوئی تھی، لیکن ان میں اس اسکول کی روایتی اسیری نہیں تھی، بلکہ وہ جس دور میں شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کی شاگردی میں آئے تھے، اس کے بارے میں 'مطب لطیف' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ''انہوں (شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی) نے (نسخوں میں) اجتہادی چلن صحیح معنوں میں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیانی عرصہ میں اختیار کیا۔ اس دوران میں حکیم صاحب کے ساتھ مستقل مطب میں حاضر رہا کرتا تھا۔''(۱)

حکیم محمد طیب کی طبّی فراست کا اظہار شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی سے ان کی وابستگی کے ابتدائی سالوں سے ہی ہونے لگا تھا۔ شفاء الملک نے انہیں اپنے مجوزہ نسخوں میں حسبِ ضرورت ترمیم و تنسیخ کی بھی اجازت دی تھی۔ اس دور کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے حکیم محمد طیب 'مطبِ لطیف' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''اس موقع پر اس پر بحث ضروری نہیں معلوم ہو رہی ہے کہ حکیم صاحب (شفاء الملک) کے اُن مریضوں کے نسخوں میں حسبِ حال ترمیم و تنسیخ بھی میرے ذمہ تھی، جنہیں وہ گھروں پر دیکھا کرتے تھے، خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ حکیم صاحب سفر پر ہوتے تھے اور ایسا اکثر ہوتا تھا، چنانچہ حکیم صاحب باوجود

اس کے کہ میری حیثیت ایک شاگرد کی تھی، اکثر مریضوں کے سلسلہ میں میری رائے معلوم کرتے تھے اور کبھی یہ بھی کہتے تھے کہ فلاں مریض میں فلاں بات اٹک رہی ہے 'کچھ زور لگایئے۔'' (۲)

حکیم محمد طیب کی فنّی حذاقت کا پتہ قاضی عبدالغفار مرحوم کی تلیفِ کبد کے مرض کی روداد سے بھی چلتا ہے، حکیم محمد طیب لکھتے ہیں:

''قاضی عبدالغفار جو گویا حکیم اجمل خاں مرحوم کے ہم عصروں میں سے تھے، علی گڑھ میں عرصہ سے علیل تھے، تلیفِ کبد کے آخری مدارج پر پہنچ گئے کہ یکا یک ہچکیاں لگ گئیں۔ علاج ڈاکٹری ہو رہا تھا، مگر ہچکیوں میں کوئی افاقہ نہیں ہوا، حکیم صاحب سے رجوع کیا، موصوف نے کئی دوائیں بدلیں، مگر حال انیس بیس ہی رہا، مجھ سے ذکر کیا، میں نے عرض کیا کہ تازے کچے دودھ کا جھاگ کہ جس کی طبعی گرمی ابھی کم نہ ہوئی ہو، پلوا دیجئے۔ حکیم صاحب نے فوراً قاضی صاحب کی اہلیہ کو ہدایات بھجوائیں اور اسی دن، رات تک ہچکیوں میں کافی افاقہ ہو چکا تھا۔'' (۳)

مطب و معالجہ سے حکیم محمد طیب کی دلچسپی کے عوامل کی تلاش سے واضح ہوتا ہے کہ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلفی کے مطب سے عملی وابستگی اور اطباءِ قدیم کے کلینکی مشاہدات کی تالیف سے ان کو مطب و معالجہ سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ شفاء الملک کے انتقال کے بعد حاذق طبیب سے علی گڑھ گویا خالی سا ہو گیا تھا، اس خلاء کو بھرنے کی حکیم محمد طیب نے شعوری کوشش کی، کہ تصنیف و تالیف کے لیے جس مسلسل ذہنی اور فکری ارتکاز کی ضرورت تھی، بے پناہ صلاحیتوں کے باوجود حکیم محمد طیب نے خود کو اس طرف آمادہ نہیں پایا، ہم عصروں کی طرف سے 'واک اُور' ملنے سے انہوں نے بھی اپنی اس 'عدمِ آمادگی' کو 'راست' سمجھ کر دل بہلایا اور بس۔ بہر کیف انہوں نے 'اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات' میں جو بین القوسین اپنی آراء نقل کی ہیں، وہ ان کی طبّی حذاقت اور فنّی بصیرت کی غماز ہیں۔

حکیم محمد طیب نے مطب کے لگے بندھے چلن اور پابندِ سلاسل روش کی کبھی اتباع نہیں کی، شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلفی نے انہیں نسخے لکھنے کے لیے ایک ڈائری بھی عنایت کی تھی،

اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ایک بار انہوں نے مجھے ایک ڈائری نما نوٹ بک دی تھی کہ نسخے نقل کرلوں، اس میں سے اکثر نسخے ان کے اپنے تھے، میں نے نقل کرنا شروع کیا تھا اور کچھ کرلیا تھا کہ میری نظر اپنی نوٹ بک کے دوسری طرف کے صفحات پر پڑی تو دیکھا اُس طرف دھوبی کے کپڑے لکھے ہوئے تھے، چنانچہ میں نے وہ کام اسی جگہ روک دیا کہ دوسری کاپی پر از سرِ نو پھر نقل کروں گا، اسی درمیان موٹر سائیکل کے ایک حادثہ میں شدید طور پر زخمی ہو کر ہسپتال میں بقول ریاض خیر آبادی تین ماہ بستر شکن رہا۔ شامت اعمال ایک دن اسی نوٹ بک کا ذکر ایک ساتھی سے آیا۔ انہوں نے کہا کہ جب تک آپ دے دیں، میں نقل کرلوں، پھر آپ کرتے رہیے گا، میں نے ان کے حوالے کردی، کچھ عرصہ گزر گیا، میں کچھ بھول سا گیا، وہ باہر چلے گئے، میں نے جب تقاضا کیا تو جواب ملا کہ میں تو کب کی واپس کر چکا، حالانکہ مجھے اس کی واپسی یاد نہیں یا کوئی اس کے بعد اڑا لے گیا، واللہ اعلم۔''(۴)

حکیم محمد طیب نے مطبِ لطیف کے اپنے مقدمہ میں اس ڈائری کے حوالہ سے ۱۵ر نسخے نقل کیے ہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ حکیم محمد طیب نقل نویسی کے اس طرح کے روایتی جھمیلوں سے آزاد تھے، یہ اعمال ان کی سرشت سے قطعی میل نہیں کھاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اگرچہ اطباءِ قدیم کے کلینکی مشاہدات کو اپنا موضوعِ قلم بنایا تھا اور جن اطباء متقدمین نے اپنے مشاہدات قلم بند نہیں کیے تھے، ان پر زبردست نقد بھی کیے، لیکن مرجع مرضاء ہونے کے باوجود خود اپنے کلینکی مشاہدات ضبطِ تحریر میں لانے کی چنداں ضرورت نہیں محسوس کی، اسی لیے علی گڑھ کے حوالہ سے 'مطبِ افہام' تو ملتا ہے، لیکن 'مطب طیب' کا کہیں اَتا پتا نہیں۔

مزاجِ مرض اور مزاجِ مریض کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مفرد دواؤں سے علاج ہر طبیب کے بس کا نہیں، اس میں معالج کی فنی بصیرت اور حاذقانہ صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے اور یہی یونانی طب کا اصولی، اساسی نہج و جہتِ علاج ہے، طب کا دبستانِ لکھنؤ اسی طریق کا حامی اور اس پر عامل تھا۔ اس جہت سے علاج کرنے والے فی زمانہ عنقا ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ آج لکھنؤ میں بھی

ایسے اطباء کے شمار کے لیے ایک انگلی کے پوروے ہی کافی ہیں۔ گہوارۂ علم وحکمت علی گڑھ کی صورتِ حال بھی کم وبیش ایسی ہی ہے۔ ان حالات میں حکیم محمد طیب کی ذات بہت غنیمت تھی کہ انہوں نے حسبِ ضرورت مفرد دواؤں کے ذریعہ علاج کو اس دور میں زندہ رکھا، بلکہ اس سے معالجہ کے نئے اُفق تلاشے۔

میں حکیم محمد طیب کا قریبی مشاہد نہیں رہا ہوں، ان کے بارے میں جو بھی علم ہے، وہ ان کی تحریروں کا رہینِ منت ہے۔ حکیم محمد طیب کی شخصیت کے حوالہ سے ایک بات میرے ذہن میں بار بار آتی ہے، لیکن میری کیفیت کچھ ایسی ہے کہ 'اگر گویم زباں سوزد نہ گویم استخواں سوزد'۔ میرے نزدیک ذہن سازی، بلکہ شخصیت سازی بہت بڑا اور بہت ہی اہم کام ہے۔ ہر بڑے انسان کی توقیت اس کی شخصیت سازی کے تناظر میں ہوتی ہے۔ مطب ومعالجہ کے حوالہ سے حکیم محمد طیب یقیناً بڑے مقام پر فائز تھے، ان کے تلامذہ کی تعداد بھی ہزاروں میں ہوگی، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے عملی مطب اور معالجہ کے کتنے جانشین چھوڑے؟ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی نے اپنے پیچھے ایک جماعت چھوڑی تھی۔ علامہ شبلی نعمانی کا بڑا کارنامہ سیرۃ النبیؐ کی تالیف ہے اور ایک اور بڑا کارنامہ ہے سید سلیمان ندوی کی شخصیت کی تعمیر۔ جنہوں نے نہ صرف اپنے مربی علامہ شبلی نعمانیؒ کے ڈریم پروجیکٹ 'سیرۃ النبیؐ' کو مکمل کیا، بلکہ اس فکر کی ایک بڑی معتبر جماعت پیدا کردی۔ میری ذاتی سوچ یہ ہے کہ بڑا شخص وہی ہے، جس نے اپنی میراث اچھے ہاتھوں میں سونپی ہو۔ مجھے علم نہیں کہ حکیم محمد طیب کے ساتھ، بالخصوص شعبۂ علم الادویہ کی سربراہی کے دور میں ان کے مطب میں ان کے کتنے نوآموز شاگرد بیٹھتے تھے؟ اور ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کے عرصہ میں، جو کم وبیش ۲۰ برس پر بسیط ہے، ان کے ذاتی مطب میں کتنے معاون طبیب تھے؟ اور تھے بھی یا نہیں؟ پہلی نظر میں تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ ایک بھی نہیں، کیونکہ حکیم محمد طیب کے مزاج کی تکوین کچھ اس ڈھب کی تھی کہ کسی معاون طبیب یا طبیب پیشی کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی۔ برسبیلِ تذکرہ عرض کردوں کہ اسی شہر علم وحکمت میں اب بھی متعدد ایسے دانشور موجود ہیں، جنہوں نے عملی،

شعوری اور باقاعدہ طور اپنا جانشین پیدا کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی ہے، بلکہ ان کی 'مساعی' کے اعداد و شمار جمع کیے جائیں تو 'اضمحلال کی سعیِ بلیغ' کے سوا کچھ نہ ہاتھ آئے گا اور صورتِ حال یہ ہے کہ یہ اہلِ خرد اپنی عمر طبعی کو پہنچ رہے ہیں۔

حکیم محمد طیب نے شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کے مطب سے وابستگی کے دوران ان کے کچھ نسخے اپنی ایک ڈائری میں نقل کیے تھے، لیکن حکیم محمد کمال الدین حسین ہمدانی نے ان کو منصوبہ بند طور پر جمع کیا تھا، جو طبّی دنیا کو 'مطب لطیف' کے نام سے سوغات کے طور پر ملا اور ایک جہان نے اس سے استفادہ کیا۔ حکیم محمد طیب کے معمولاتِ مطب کے سلسلہ میں اس طرح کی کسی کوشش کا علم کم از کم مجھے نہیں ہے، اس بابت کچھ کیا جاسکا ہوگا تو وہ پروفیسر حکیم عبدالمنان علیگ کے ذریعہ ہوا ہوگا، پیش قیاسی کے طور پر کچھ توقع حکیم فخر عالم سے ہے، کہ وہ ان دنوں حکیم محمد طیب کے احوال و آثار پر بہت سنجیدگی سے لوازموں کی فراہمی میں مصروف ہیں، تلاش و تفحص ان کے مزاج کا خاصہ ہے اور جوئندہ یابندہ ایک بڑی سچائی ہے، بصورتِ دیگر دواخانہ طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے کسی ہوشیار ملازم یا اس عطار کے پاس، جو حکیم محمد طیب کے نسخے باندھتا رہا ہو۔ حکیم محمد طیب کی افتادِ طبع کچھ ایسی تھی کہ زیادہ لوازمہ عطار کے پاس ہی ہوگا۔ تلاش و جستجو کے مرحلہ میں حکیم فخر عالم کو اس نکتہ پر بھی غور کرنا چاہیے۔

حکیم محمد طیب کے انتقال کو ابھی چند ماہ ہی گزرے ہیں، ان کے بعض متعلقین اور ارادت مندوں کا خیال ہے کہ دواخانہ طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے متعدد نسخوں کی ترکیب حکیم محمد طیب کی مرہون منت ہے، آج ان نسخوں کی نشان دہی اور ان کے دیگر نسخوں کی تلاش اور اشاعت ایک اہم طبّی خدمت ہوگی، کہ موجودہ دور کے وہ ایک ایسے طبیب رہے ہیں، جنہوں نے طبّی مبادیات کو برت کر نسخے ترتیب دیے ہیں اور طبِ یونانی کے اصول اور نظریات کو بہر حال مقدم رکھا ہے۔

حوالہ جات

۱- تقدمہ، مطب لطیف: ص ۵-۴، مرتبہ حکیم سید کمال الدین حسین ہمدانی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۷۶ء

۲- مطب لطیف: ص ۵

۳- مقدمہ، مطب لطیف: ص ۱۱-۱۰

۴- ایضاً: ص ۱۱

۵- ایضاً: ص ۱۷-۱۶

پروفیسر حکیم محمد طیب - ایک مثالی استاذ

پروفیسر انیس احمد انصاری
سابق ڈین و پرنسپل فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو علی گڑھ اور
سابق ایڈوائزر (یونانی) وزارتِ صحت، حکومتِ ہند

کسی شخص کی اہمیت کا اندازہ دراصل اس وقت ہوتا ہے جب وہ نہ ہو، تب ایک بڑی کمی کی صورت میں اس کی ضرورت محسوس کی جائے، استاذ گرامی پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی شخصیت کا معاملہ کچھ اسی قسم کا ہے، جب تک وہ زندہ رہے، طب کے ہر مسئلہ کی ضرورت بنے رہے، اب ان کے چلے جانے کے بعد ان کی ضرورت کا احساس دو چند ہو گیا ہے، جب بھی طب کے احیاء اور ترقی کی بات ہوگی، ان کی کمی ضرور محسوس کی جائے گی، اس لیے کہ وہ اس سلسلہ کے میر کارواں تھے، اس لحاظ سے وہ برصغیر کی طبّی دنیا میں ممتاز مقام رکھتے تھے۔ فلسفہ کے مطابق خلا کا وجود محال ہے، لیکن استاذ محترم کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے کم از کم مستقبل قریب میں اس کے پُر ہونے کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ طبّی دنیا میں طیب صاحب کو یہ بلند مرتبہ اس لیے نہیں ملا تھا کہ وہ اجمل خاں طبیہ کالج میں پروفیسر، پرنسپل اور ڈین کے عہدوں پر فائز رہے، بلکہ انہیں یہ مقامِ بلند اس لیے حاصل تھا کہ وہ ایک باوقار صاحب علم تھے، یہی وجہ ہے کہ کبھی اعزاز و مناصب ان کے لیے باعثِ افتخار نہیں رہے، بلکہ ان کی پُر تمکنت شخصیت نے ان عہدوں کو وقار عطا کیا تھا، وہ یونانی طب کے سچے سپہ سالار تھے اور اس طب کو اس کے صحیح خدوخال

میں فروغ دینے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔

میں نے ۱۹۶۲ء میں اجمل خاں طبیہ کالج میں داخلہ لیا، اس وقت حکیم طیب صاحب یہاں استاذ تھے، پہلے سال ان سے استفادہ کا موقع نہیں مل پایا، اس لیے کہ وہ اس وقت حفظانِ صحت اور معالجات کی تدریس سے وابستہ تھے، جب میں نے ان سے سال دوم میں حفظانِ صحت اور سال چہارم میں معالجات کا درس لیا تو ان کے بارے میں اپنے سینئر ساتھیوں سے جو کچھ سن رکھا تھا، اس سے بھی بڑھ کر پایا، مضمون پر دسترس اور قدیم وجدید معلومات کے ساتھ مسائل کی توضیح، ان کے درس کی نمایاں خصوصیت تھی، اس علمی شان کے ساتھ جب ان کی وجیہ شخصیت طلبہ سے مخاطب ہوتی تو بے حد متاثر کن ہوتی اور طلبہ کے ذہن ودماغ پر ایک گہرا نقش چھوڑ جاتی، مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی میں نے ان کی کلاس بلا عذر چھوڑی ہو، یہی معاملہ اکثر طلبہ کا تھا، اس التزام کی وجہ یہ تھی ان کے درس کی لذت ہی ایسی تھی کہ کوئی طالب علم اس سے محروم رہنا نہیں چاہتا تھا، طیب صاحب کا طریقۂ درس بڑا مسحور کن تھا، درس کے ذریعہ جادو جگا دینے کا جو آرٹ ان کے اندر تھا، وہ کسی اور استاذ میں نہیں ملا۔

میرے زمانۂ طالب علمی میں وہ معالجات کی تدریس سے وابستہ تھے، کلاس لکچر کے علاوہ وہ مطب میں جس طرح عملی تربیت کرتے، اس کا انداز بڑا نرالا تھا، محض رسمی طور پر نسخہ نویسی بتا دینے کے بجائے وہ طلبہ کو مطب کے آداب اور رموز ونکات کی واقفیت بہم پہنچاتے اور اصولِ تشخیص کے ساتھ، نسخوں کی ترتیب اور ان کے ترکیبی اجزاء کی توجیہ بیان فرماتے، اس سے طلبہ بڑی آسانی سے یونانی فلسفۂ علاج، یونانی ادویہ کی تاثیر اور ان کا میکانیۂ عمل سمجھ جاتے، بالعموم ان کے نسخے مفرد دواؤں پر مشتمل ہوتے، پہلی بار وہ جو نسخہ تجویز کر دیتے، اس میں ردوبدل کی ضرورت بہت کم پڑتی تھی، اگر کبھی ضرورت داعی ہوتی تو اس کے اجزاء کے بہت معمولی حذف واضافہ یا کچھ مخصوص تدابیر کی ہدایت سے وہ کام نکال لیتے۔

کالج، یونیورسٹی اور علی گڑھ شہر سے باہر کی ایک بڑی دنیا میں بطور معالج انہیں جو شہرت حاصل تھی، وہ مطب ومعالجہ کی غیر معمولی لیاقت اور فنی حذاقت کی وجہ سے تھی۔

صلاحیت اور مہارت کے علاوہ انہیں مطب و معالجہ سے بے حد دلچسپی بھی تھی، یہی وجہ ہے کہ جب ان کی تدریسی خدمات، شعبۂ معالجات سے علم الادویہ میں منتقل ہوئیں تو یہاں بھی ان کے یہ مشاغل جاری رہے، لیکن ان کا یہ شغل کبھی ان کے منصبی فرائض کی ادائیگی میں مخل نہیں ہوا۔

حکیم طیب صاحب ایک مثالی استاذ تھے، ان کی زندگی کے بہت سے پہلو، ان کے تلامذہ کے لیے نمونۂ تقلید بنے، میں نے خود ان سے ترغیب پائی ہے، حکیم طیب صاحب نے درس و تدریس اور مطب و معالجہ کی مصروفیات کے ساتھ فارسی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی، یہ تحصیلِ علم کا محض ان کا جذبہ تھا، وگرنہ ظاہر ہے ان کے ملازمتی کیریئر کے کسی فائدہ سے اس کا تعلق نہیں تھا، بس اسے "اطلبوا العلم من المهد الیٰ اللحد" کی اسپرٹ کہا جا سکتا ہے، میں نے انہی سے متاثر ہو کر فارسی اور عربی ڈپلومہ کیا اور ۱۹۸۰ء میں اسٹڈی لیو لے کر شعبۂ علم الادویہ سے ایم ڈی کی، ان دونوں واقعات کی محرک حکیم طیب صاحب کی ذات گرامی تھی۔

حکیم طیب صاحب کا ٹیچنگ کیریئر صرف روٹین کی ملازمت نہیں تھا، بلکہ اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے فن کے لیے نہایت گراں قدر کانٹری بیوشن پیش کیا ہے اور تدریس کے ذریعہ ایک عہد کی ذہنی اور فکری تربیت کی ہے، یہی معاملہ ان کے مطب و معالجہ کا ہے، اس کے تجربات سے انہوں نے یونانی طب کے ادویاتی سرمایہ میں بیش قدر اضافہ کیا ہے، اس وقت دواخانہ طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جن مصنوعات کے لیے شہرت رکھتا ہے، اس کا بڑا حصہ طیب صاحب کا عنایت کردہ ہے۔ ان کے یہ مجرب نسخے نہ صرف دواخانہ اور یونیورسٹی کے لیے مالی منفعت کا اہم ذریعہ ہیں، بلکہ ان سے بیمار انسانیت کو جو فیض پہنچ رہا ہے وہ یقیناً ان کے لیے ایک صدقۂ جاریہ ہے، جو دنیاوی نیک نامی کی طرح ان کے اخروی درجات کی بلندی کا باعث ہوگا۔

پروفیسر حکیم محمد طیب

ڈاکٹر غفران احمد

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اے ایم یو، علی گڑھ

پروفیسر حکیم محمد طیب (۱۹۳۲-۲۰۱۳ء) نہ تو منھ میں چاندی کا چمچہ اور نہ ہی ہاتھ میں قلم لے کر پیدا ہوئے تھے، جو جادہ ومنزل کی تعیین میں ان کے لیے نقوش راہ ثابت ہوتے یا زندگی کا لائحۂ عمل تیار کرنے میں ان کی معاونت کرتے، لیکن قدرت نے انھیں ایک دراک ذہن جس میں Arrogance, Sharpness اور Confidence کی مساویانہ آمیزش تھی، کے اثاثہ سے ضرور سرفراز کیا تھا اور یہی عناصرِ ثلاثہ ان کی شخصیت کی تشکیل میں جزوِ اعظم کے طور پر شامل رہے۔ انھیں عناصر کے زور سے انھوں نے اپنے لیے ایک ایسی روش متعین کی، جو عام ڈگر سے ہٹی ہوئی لیکن درخشاں اور ممتاز تھی۔ وہ خود بھی اپنی شخصی خوبیوں سے واقف تھے، جس کا استعمال انھوں نے تدریسی اور انتظامی سرگرمیوں میں چابک دستی سے کیا اور ایک ممتاز استاذ، معالج اور منتظم کی حیثیت سے آسمانِ طب پر کم وبیش چار دہائی تک روشن ستارے کے مانند جلوہ گر رہے۔ دیانت داری کو انھوں نے اپنی ذات میں ایک صفت نہیں بلکہ ایک جزء کے طور پر شامل کر لیا تھا، جس سے ان کی شخصیت رعب وجلال اور کسی حد تک کرختگی و درشتی سے مرصع ہونے کے باوجود احترام واعتبار کھونے سے محفوظ رہی۔ نخوت ذات (Arrogance) کے اثراتِ بد سے بچنے کے لیے ایسا کرنا ان کے لیے ناگزیر بھی تھا ورنہ طلبہ، ماتحت عملہ اور رفقاء کار کا وہ

بے پایاں احترام انھیں حاصل نہ ہو پاتا، جو زندگی بھر حاصل رہا۔ ان کی شخصیت خود ساختہ وخود پرداختہ تھی اور ان کا جلال و جمال خارجی عوامل کی پرداخت و پرداز سے مبرا۔ ان کا کوئی آئیڈیل نہیں تھا، جس کی اتباع میں وہ منزل کے نشانات تلاش کرتے، لہٰذا انھوں نے اپنے اہداف اور راہیں خود متعین کیں۔ اپنے کاروانِ زندگی کے لیے انھوں نے جس ڈگر کا انتخاب کیا تھا، اس کا بلو پرنٹ خود ان کا تیار کیا ہوا تھا اور زندگی گزارنے کے جو اصول وضع کیے تھے وہ بھی خود ساختہ تھے، جن پر وہ پوری زندگی کاربند رہے۔ ان کی دنیا اپنی ذات اور اپنے فرائضِ منصبی تک محدود تھی، جس میں سماجی ترجیحات اور جذباتی انسلاکات تک کو مداخلت کی اجازت نہیں تھی۔ انھوں نے اپنے گرد ایک ایسا حصار کھینچ رکھا تھا کہ باقی دنیا سے مجاورت ان کے لیے ممکن نہیں تھی، یہی حصار ان کے اور باقی دنیا کے درمیان تا عمر خطِ فاصل بنا رہا۔ جب ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی تھی تب بھی انھوں نے اپنے گرد کسی کو پھٹکنے نہیں دیا کہ منت کشی ان کے مذہب میں جائز ہی نہیں تھی۔

حکیم طیب صاحب کم و بیش چالیس سال تک اجمل خاں طبیہ کالج سے وابستہ رہے، یہاں انہوں نے تدریس و تحقیق، مطب و معالجہ اور انتظام و انصرام کا اعلیٰ معیار قائم کیا۔ وہ فرائضِ منصبی کی ادائیگی میں ہمیشہ حد درجہ سرگرم (Proactive) رہے، جس سے ان کی شبیہ بطور ایک مثالی استاذ، معالج اور منتظم کے اُبھری۔ طلبہ کی ایک بڑی تعداد ان کی صلاحیتوں سے مرعوب و متاثر رہی اور خود کو 'طبّی قالب' میں ڈھالنے کی خواہش مند۔ راقم الحروف کو حکیم صاحب کے سامنے ایم ڈی کی تعلیم کے دوران زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا شرف حاصل رہا ہے اور یہ بھی اتفاق ہے کہ ہمارے Batch کو اپنی شاگردی میں لینے کے بعد انھوں نے دفترِ تسجیل کو ہی مقفل کر دیا، اب ان کے حلقۂ درس میں کوئی شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح ان کا تدریسی سفر مکمل ہوا اور اسی سال (۱۹۹۴ء) وہ ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ چونکہ ان کو Mid Session میں ہی سبکدوش ہونا تھا اس لیے انھوں نے ہمارا نصاب جلد ختم کرنے کی کوشش کی۔ ملازمت کے آخری دن وہ ہماری کلاس لے ہی رہے تھے کہ

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمان صاحب، جو اس وقت صدر شعبۂ علم الادویہ تھے، ان کے کمرے میں تشریف لائے اور کہا کہ ابھی آپ کی خدمات کی ضرورت ہے، اس لیے آپ شعبہ کو خیرباد کہنے کا فیصلہ نہ کریں۔ ظل الرحمان صاحب غالباً ان کی ملازمت میں ایک سال کی مزید توسیع کروانا چاہتے تھے، جس کے لیے طیب صاحب آمادہ نہیں ہوئے۔ کلاس ختم کرنے کے بعد انھوں نے صدر شعبہ کے نام ایک خط لکھا، جس میں ان کو باضابطہ اطلاع دی کہ مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد وہ ڈیپارٹمنٹ کو الوداع کہہ رہے ہیں، لہٰذا ان کی LPS وغیرہ متعلقہ دفاتر کو بھیج دی جائیں۔ میری کلاس کے چاروں طلبہ (جلیس احمد، محمد تقی، طارق احسن اور راقم الحروف) ان کو کار تک چھوڑنے گئے اور ایک افسردگی کے ساتھ ان کو رخصت کیا، نہ کوئی الوداعی تقریب ہوئی اور نہ ہی ڈیپارٹمنٹ کا کوئی فرد ان کی مشایعت کو آیا۔ جب وہ اپنی کار میں بیٹھے تو انھوں نے بھی شعبہ کے در و دیوار پر ایک آخری نظر ڈالنا مناسب نہیں سمجھا، ان کی کار اٹھلاتی ہوئی قدرے سرعت کے ساتھ کالج کے حدود سے باہر چلی گئی۔ ہم کار کے بنائے ہوئے نیم مدور نشانات کو دیکھتے رہ گئے، ہمیں لگا کہ گُل کترنے کا کام خرام یار ہی نہیں راہوار 'کار' بھی کر سکتا ہے۔ حالانکہ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ایک دو بار کسی تقریب کے موقع پر شعبہ میں تشریف لائے، لیکن اسی طمطراق سے، جیسے وہ دورانِ ملازمت آیا کرتے تھے۔ دوران گفتگو نہ تو پرانے ایام کو یاد کیا اور نہ ہی اپنے کارناموں کی کوئی فہرست پیش کی، بلکہ کالج اور ڈیپارٹمنٹ کے ذکر سے بے اعتنائی برتی (علی گڑھ کی روایت کے علی الرغم جہاں ہر وظیفہ یاب شخص یہی سمجھتا اور بیان کرتا پھرتا ہے کہ متعلقہ شعبہ کا سارا ارتقاء اسی کا رہین منت ہے)۔ Nostalgic ہونا نہ تو ان کے مزاج میں تھا اور نہ ہی ان کے مسلک کا حصہ۔ وہ زندگی اپنی شرائط پر جینے کے عادی تھے، سود و زیاں کے احساس سے بالاتر ہو کر اور یہی وصف ان کو ان کے ہم عصروں سے ممتاز کرتا ہے۔

حکیم طیب صاحب مفردات کی تدریس کیا کرتے تھے۔ ممکن ہے کبھی دیگر مضامین بھی پڑھائے ہوں، لیکن مفردات کی تدریس کا انھیں خاص شوق تھا۔ اپنے ذوق و شوق اور محنت و تجربہ

سے انھوں نے اس فن میں کمال حاصل کرلیا تھا۔ ان کا طریقۂ تدریس حد درجہ معروضی تھا، اس لیے طلبہ کو نفسِ مضمون کے ادراک میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی اور درس میں ان کی دلچسپی برقرار رہتی تھی۔ کسی دوا کا مطالعہ وہ بالاستیعاب کرتے تھے لیکن دورانِ درس صرف ان نکات پر گفتگو کرتے تھے جو اہم ہوں اور جن کا تعلق دوا کے حصول، شناخت، معیار، افعال، جانبی اثرات اور خاص طور سے اس کے معالجاتی استعمال سے ہو۔ دوا کے صرف چند افعال بیان کرتے تھے اور فعلِ خاص پر تفصیلی گفتگو کرتے تھے۔ ایک ہی دوا کے مختلف افعال کی وجوہ اور مواقع کا تذکرہ سائنٹیفک انداز میں پیش کرتے تھے۔ مختلف اعمال صیدلی کے نتیجہ میں کسی دوا میں پیدا ہونے والے خواص اور ان کی معالجاتی اہمیت کے ساتھ ساتھ ان کی نوعیتِ عمل کو انتہائی دلچسپ اور منطقی انداز میں بیان کرتے تھے۔ البتہ جب کوئی طالب علم سوال کرتا یا کوئی خاص نکتہ کسی دوا کے سلسلہ میں زیرِ بحث لاتا تو پھر اس دوا پر سیر حاصل بحث کرتے تھے۔ دوا کی تاریخ، شناخت سے متعلق قدیم وجدید نظریات، دوا کی معیار بندی، اس کے کیمیائی اجزاء، افعال وخواص، مواقع استعمالات میں اطباء کے اختلافات، سمیت اور تناقضات وغیرہ پر بھرپور اظہارِ خیال کرتے۔ دواؤں پر کی جانے والی جدید تحقیقات پر ان کی معلومات بھرپور تھیں، جس کے اہم نکات دورانِ درس بہت عمدگی سے بیان فرماتے تھے۔ اخیر میں اپنی ذاتی رائے اور اپنے تجربات بھی بیان کرتے تھے۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا، اس لیے معلومات کے ذخائر کا ہر وقت استحضار رہتا تھا۔ متعدد ادویہ کے سلسلہ میں ان کے ذاتی تجربات بہت کارآمد ہوتے تھے۔ ان کی بیاض اگر دستیاب ہو سکے تو ایسی متعدد ادویہ اور مجرب نسخوں کا پتہ چل سکتا ہے۔

ایک بار سم الفار کی سمیت بیان کرتے وقت اپنا ذاتی تجربہ بیان کرنے لگے، جب انھوں نے خود کو Guinea Pig کے طور پر استعمال کر ڈالا تھا۔ ''تم لوگ کیا سمجھتے ہو! یہ جو کالا چشمہ میں ہمہ وقت لگائے رہتا ہوں تو مجھے اسمارٹ بننے کا شوق ہے یا میں دوسروں پر رعب ڈالنا چاہتا ہوں، نہیں یہ میری مجبوری ہے اور یہ سب اسی سنکھیا کی دین ہے۔ میں نوجوانی کی عمر میں

بہت دبلا پتلا تھا، گال پچکے ہوئے، آنکھیں مدقوق، چہرہ ملاحت سے عاری، بالکل ان کی طرح (راقم الحروف کی طرف اشارہ کر کے، جس کا جُثہ ان دنوں معشوقوں کے کافِ کمر جیسا تھا، بعد میں کسی کی نظر لگ گئی)۔ ذاتی مطالعہ سے اندازہ ہوا کہ فربہی بدن کے لیے سنکھیا ایک مفید دوا ہے، میں نے اس کو استعمال کرنا شروع کیا اور اس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے۔ ایک بار سنکھیا کو کسی شناسا سے مدبر کروایا، اس ظالم نے کوتاہی برتی اور سنکھیا خام رہ گیا، جب میں نے اسے استعمال کیا تو سمّیت رونما ہوئی۔ میں کار چلا رہا تھا کہ اچانک احساس ہوا کہ پیر، بریک نہیں لگا پا رہے ہیں، مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں اسی سمِ قاتل (سنکھیا) کی اداؤں اور یار جانی (شناسا، جنھوں نے سنکھیا کو مدبر کیا تھا) کی جفاؤں کا قتیل ہو گیا ہوں۔ میں اسی حالت میں میڈیکل کالج گیا اور بتایا کہ مجھے Arsenic Poisoning ہو گئی ہے۔ علاج ہوا، باقی علامتیں رفع ہو گئیں لیکن آنکھوں کی رگیں Permanently Dilate ہو گئیں، اب یہ شعاؤں کے انعکاسات کی تاب نہیں لا پاتیں، اس لیے سیاہ عینک لگا کر ڈان بنا پھرتا ہوں'' کم و بیش یہی ان کے الفاظ تھے۔ میں نے خود سنکھیا پر تحقیقی کام کیا ہے اور اس کی سمّیت سے متعلق بعض طلبہ کے کاموں کی نگرانی بھی کی ہے، مگر حکیم صاحب کے تجربہ کا جو نقش ذہن پر قائم ہے وہ اپنے تجرباتی کاموں سے زیادہ گہرا اور مستحضر ہے۔

جب وہ کلاس لے رہے ہوتے تو اصل طیب کا دیدار ہوتا، اس وقت مزاجی درشتی کے آثار اور پروفیسرانہ و حاکمانہ پندار سے باہر آ جاتے تھے اور ایک شفیق استاذ کی طرح درس دیا کرتے تھے۔ چہرے پر شگفتگی ہویدا ہوتی اور کبھی کبھی زیرِ لب تبسم بھی فرماتے، ہنستے کبھی نہ تھے، بوقت ضرورت لطیف طنز بھی کر جاتے تھے۔ مروارید ناسفتہ پڑھا رہے تھے، اس کی ساری تفصیل بتا چکے تھے کہ عقبی نشست سے کسی غیر حاضر باش نے سوال کر دیا کہ سر! ناسفتہ کیا ہوتا ہے؟ 'لگتا ہے ابھی تک آپ ناسفتہ ہی ہیں، کسی کی مدد لے لیجیے'، طیب صاحب کا جواب حاضر تھا۔ سارے لڑکے ہنس پڑے، سائل کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ سوال و جواب سے کبھی کبیدہ نہ ہوتے،

بلکہ حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ذہین اور پابند لڑکوں کو پسند کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خاص رعایت بھی دیا کرتے تھے۔ ہمارے سینئر بیچ کی کلاس (یو جی) میں ایک بار صف اول سے چار طلبہ کو غیر حاضر پایا، یہ چاروں بہت ریگولر، ذہین اور سوال و جواب میں پیش پیش رہتے تھے، پوچھا کہ 'چہار درویش' کہاں ہیں، کسی شوخ نے کہا چائے پینے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کرسی پر بیٹھ گئے (کلاس میں وہ عموماً بیٹھتے نہیں تھے) اور حکم دیا کہ انھیں بلا کر لاؤ، چاروں طلبہ ڈرے سہمے کلاس میں پہنچے، حکیم صاحب نے جگر کے مشہور مصرعہ 'جو تم ہی نہ ہو گے تو کیا رنگِ محفل' سے ان کا استقبال کیا اور تدریس شروع کر دی۔ کلاس کے علاوہ حکیم طیب صاحب سے اس رویہ کی کوئی امید نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی احساس ہوتا تھا کہ جو شخص کلاس میں ریشم کی طرح نرم رہتا ہے، کلاس سے باہر ایسا آہنی پتلا کیوں بن جاتا ہے، جس کی ناک پر مکھی نہیں بیٹھ سکتی۔ اکثر شبہ ہوتا تھا کہ 'لامساس' کا لبادہ وہ بر بنائے مصلحت اوڑھے رہتے تھے، ان کے اندرون میں وہ کھرا پن نہیں تھا، جو ان کے ظاہر سے عیاں ہوتا تھا۔

حکیم محمد طیب ایک اچھے معلم تھے، یہ بات متفق علیہ ہے۔ طب کے ایک اچھے استاذ کے لیے جو اوصاف مطلوب ہیں، وہ سب ان میں پائے جاتے تھے۔ یہ بات ہمارے ذہن میں رہنی چاہیے کہ طب یونانی کی تدریس و تحقیق اور افہام و تفہیم کے لیے اردو، عربی، انگریزی، فارسی اور ہندی زبان سے آگہی کے علاوہ منطق و فلسفہ اور کم از کم ہائی اسکول کے معیار کی سائنس (خاص طور سے باٹنی، زولوجی، کمسٹری اور بایو کمسٹری) سے واقفیت اور ایک خاص درجہ کی ذہانت مطلوب ہوتی ہے۔ اوسط علمی استعداد کے حاملین یا کم ذہین لوگوں کے لیے یہ مضمون نہ صرف مشکل ہے، بلکہ خود ان کی شخصیت اور سماج کے لیے باعث مضرت بھی ہو سکتا ہے۔ فی زمانہ پوری طبی دنیا میں معدودے چند اساتذہ ہی ایسے ہوں گے، جو مذکورہ علوم و اوصاف سے بہرہ ور ہوں، اس کے برعکس حکیم طیب کو تمام متعلقہ علوم پر قدرت تھی۔ وہ اردو، فارسی اور انگریزی کے ماہر تھے۔ فارسی میں تو خیر انھوں نے پی ایچ ڈی کی تھی، انگریزی استعداد اتنی اچھی کہ آج بھی طبی حلقوں میں ان جیسی Terse زبان لکھنے والا غالباً کوئی

نہیں ہے۔ انگریزی ادبیات پر دورانِ درس وہ اکثر گفتگو کیا کرتے تھے، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ انھوں نے شیکسپیر، ورڈس ورتھ، کیٹس، بلیک، سامرسٹ اور ایلیٹ وغیرہ کو پڑھ رکھا ہے۔ ہندی خوب جانتے تھے اور محنت و ذوق سے عربی کی شُد بُد پیدا کرلی تھیں۔ دورانِ ملازمت انھوں نے نہ یہ کہ ضروری سائنسی مضامین کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی، بلکہ بارہویں کلاس تک کا امتحان بھی پاس کیا تھا، چنانچہ سائنسی علوم سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ منطق و فلسفہ سے وہ اس حد تک واقف تھے کہ طب کے بنیادی مسائل کے افہام و تفہیم میں انھیں کبھی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ وہ جدید اصولِ تحقیق اور تجزیاتی مطالعہ کی جزئیات کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور طبی تحقیق میں ان کے انطباق کی امکانی شکلوں پر ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے، اسی ہمہ دانی (Versatility) میں ان کے کامیاب اور مؤثر استاذ ہونے کا راز پوشیدہ ہے۔ وہ جدید و قدیم طبی علوم سے بخوبی واقف اور ان کے فلسفے اور رمزیات سے پوری طرح آشنا تھے، ہر موضوع پر یکساں قدرت کے ساتھ گفتگو کرسکتے تھے اور طب سے متعلق مختلف النوع مسائل کو چٹکیوں میں حل کردیتے تھے۔

صد دررا بہ گوشۂ چشمِ دوا کنیم

طیب صاحب کو لوگ ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر کے طور پر بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ اجمل خاں طبیہ کالج کے ہر اہم انتظامی منصب پر فائز رہے۔ چیرمین، ڈین، پرنسپل، ہاسپٹل انچارج وغیرہ کی ذمہ داریاں انھوں نے بخوبی نبھائیں۔ کالج کے باہر سی سی آئی ایم، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، سی سی آر یو ایم اور آیوش وغیرہ سے مختلف حیثیتوں سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۷ء میں جب حکومتِ ہند نے تیسری فارما کوپیا کمیٹی تشکیل دی تو حکیم طیب صاحب اس کے ممبر نامزد کیے گئے۔ اسی کمیٹی کی ایک ذیلی کمیٹی جسے فارمولری کمیٹی کا نام دیا گیا، اس کے بھی وہ ممبر ہوئے۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے وہ صدر منتخب ہوئے تھے، سی سی آر یو ایم کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر اور علی گڑھ یونٹ کے وہ زمانے تک انچارج رہے اور ہر جگہ اپنی مثبت چھاپ چھوڑی۔ دیانت داری، جرأت مندی، غیر جانب داری، معاملہ فہمی، منصوبہ بندی اور قوتِ فیصلہ،

اچھے ایڈمنسٹریشن کی کلیدی صفات ہیں، پھر روزمرہ کے امور سے نبرد آزما ہونے کے لیے قانونی باریکیوں کے فہم کے ساتھ ساتھ اچھی ڈرافٹنگ، آرٹیکولیشن اور نیگوسیشن کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے۔ فی زمانہ انتظامی امور کے ساتھ یہ لاحقہ بھی ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جو لوگ منتظم کے حبالۂ اختیار (Subordination) میں ہیں وہ اس کے شخصی جلال سے خائف رہتے ہوں اور جو خوارج ہیں وہ اس کے انتظامی دروبست اور آفس کے رکھ رکھاؤ سے مرعوب۔ حکیم طیب صاحب کی شخصیت ان تمام صفات کا مرقع تھی، جو انتظامی امور کے لیے مطلوب ہیں، وہ ان سارے گُروں سے بھی واقف تھے جو خامہ کج بابوؤں کو سعادت مندی اور کج کلاہ طلبہ کو آدابِ فرزندی سکھانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ بقول شخصے جب وہ کالج کے کاریڈور سے گزرتے تھے تو طلبہ سہم کر دبک جاتے تھے کہ کہیں سامنا نہ ہوجائے۔ دیانت داری اور علمی تبحر و تنوع نے ان کے اندر بلا کی جرأت مندی اور خود اعتمادی پیدا کردی تھی، جسے بعض لوگ ان کی انانیت اور تعلیانہ ذہنیت پر محمول کرتے تھے۔ علوی صاحب جو زمانے تک شعبۂ علم الادویہ کے دفتر سے وابستہ رہے، ایک بار مجھ سے فرمایا کہ حکیم طیب صاحب کی ایمانداری کا یہ عالم تھا کہ اگر ان کے پاس دس پیسے کا ٹکٹ ہوتا تھا تو لفافے پر لگا کر، لفافہ اور پانچ پیسہ آفس کو بھجواتے تھے کہ پانچ پیسے کا مزید ٹکٹ لگا کر اسے سپرد ڈاک کیا جائے۔ آفس سے ایک پیسے کا سامان لینا انہیں گوارا نہیں تھا۔ یہی نہیں کالج کے کسی ملازم کو اجازت نہ تھی کہ ان کے درِ دولت پر جا کر ان کی خبر گیری اور رفقاء کار کی مخبری کرے، کسی طالب علم کی جرأت نہ تھی کی ان کے گھر پہنچ کر کورنش بجالائے اور تقرب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

کسی منتظم کے لیے سب سے مشکل مرحلہ اس وقت پیش آتا ہے، جب اسے اپنے کسی فیصلے کے سقم کا احساس ہوجائے اور تحریری حکم صادر کرنے کے بعد مراجعت کرنی پڑے، جہاں اس اقدام سے اس کی انانیت کو ٹھیس پہنچتی ہے وہیں ماتحتوں پر انتظامی گرفت کے کمزور پڑ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایسے موقعوں پر عام روایت یہ ہے کہ اربابِ حل وعقد اور ان کے حاشیہ بردار، منتظم اعلیٰ کے فیصلہ کو درست ٹھہرانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اس کی گریز پائی

کو خارج از امکان قرار دیتے ہیں، تاکہ اس کی ساکھ و دبدبہ اور آہوانِ دفتر پر اس کی غضنفری قائم رہے، لیکن بعض دیانت دار ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہیں، فیصلے سے رجوع کرتے ہیں اور متاثرہ شخص سے اظہارِ افسوس کرنے میں بھی خفت محسوس نہیں کرتے، اس لیے کہ ان کا ضمیر کسی کے ساتھ زیادتی کی اجازت نہیں دیتا۔ طیب صاحب بہت دنوں تک سی سی آر یو ایم کی علی گڑھ یونٹ کے کوآرڈینیٹر رہے اور اس کے تحقیقی پروگراموں کی نگرانی کی۔ ایک موقع پر حکیم صاحب نے ایک ریسرچ آفیسر کو کئی شوکاز نوٹس جاری کیا اور مختلف امور پر جواب طلب کیا، آفیسر ان کی ہر بات کا تحریری جواب دیتا رہا اور اپنے فرائض کی تکمیل میں ہمیشہ کی طرح مستعد رہا، کچھ دنوں کے بعد حکیم صاحب کو احساس ہوا کہ آفس کے عملہ نے جو اطلاعات انہیں دی تھیں اور جن کے سبب انہوں نے شوکاز نوٹس جاری کیا تھا، وہ سب مبالغہ پر مبنی تھیں، ان کی بنیاد پر انہوں نے جو فیصلہ لیا، اس سے متعلقہ شخص کے ساتھ انصاف کا معاملہ نہیں ہوا، چنانچہ انہوں نے اپنے ماتحت آفیسر سے نہ صرف مل کر معذرت کی، بلکہ اس کو رکارڈ پر لائے، نوٹنگ کروائی اور تحریری معذرت نامہ بھجوایا، ان کا یہ انداز بظاہر ایڈمنسٹریشن کے اصولوں کے منافی معلوم ہوتا ہے، لیکن فی الواقع یہ تقاضۂ عدل اور دیانت داری کے عین مطابق تھا۔

ان کی ہم عصروں سے معاصرانہ چشمک بھی رہتی تھی، لیکن ان کی Versatility کی وجہ سے معاصرین کی 'کور' کہیں نہ کہیں دبتی ضرور تھی۔ اہمال ضرب کے تو طیب صاحب بھی قائل نہ تھے، لیکن حدودِ عدل سے تجاوز نہ کرتے تھے اور خردوں کے ساتھ عموماً التفات کا معاملہ کرتے تھے۔ ہمارے ایک استاذ نے جو طیب صاحب سے جونیر، لیکن عرصہ تک ان کے رفیق کار رہے، اپنا ایک ذاتی واقعہ یوں بیان کیا کہ ایک بار میں نے ایک کتاب لائبریری سے ایشو کروائی، کتاب بوسیدہ لیکن اپنے موضوع اور مواد کے لحاظ سے کافی اہم تھی۔ یہ کتاب میں گھر لے گیا اور مطالعہ کی میز پر رکھ دیا۔ میری دو چھوٹی بچیوں نے کتاب کو بازیچۂ اطفال جانا اور

اس کے ساتھ دھینگا مشتی کر کے کیفر کردار تک پہنچا دیا۔طیب صاحب اس زمانے میں لائبریری ہیڈ تھے، میں ان کے پاس گیا، اس ارادے سے کہ اب جو بھی تاوان مجھ پر عاید ہوگا اس کو قبول کرلوں گا، طیب صاحب سے سارا ماجرا بیان کیا، انھوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا، خاموشی سے کتاب کو رائٹ آف کروا دیا۔

کالج کو فیکلٹی کا درجہ دلانے میں ان کا اہم رول رہا ہے، وہ کالج کے پہلے ڈین بھی مقرر ہوئے، فیکلٹی میں نظم ونسق کی بحالی، تعلیمی میقات کی پابندی اور تعلیم وتربیت کی تنظیم ہمیشہ ان کی ترجیحات میں شامل تھیں، انھوں نے اپنے منصوبہ کے تحت فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کو دیگر فیکلٹیز کے دوش بہ دوش لا کھڑا کیا۔نظم ونسق اور معیارِ تعلیم کے معاملہ میں وہ کسی مفاہمت کے قائل نہ تھے۔ایک بار کا واقعہ ہے کہ ہم لوگ بی یو ایم ایس فرسٹ ایر کا امتحان دے رہے تھے، تین، چار انویجیلیٹرس ہماری نگرانی پر مامور تھے، سب کچھ حسبِ معمول چل رہا تھا کہ اچانک طیب صاحب (جو اس وقت ڈین تھے) نمودار ہوئے، درمیانی صف سے ایک طالب علم کو کھڑا کیا، اس کے رائٹنگ پیڈ کے نیچے سے ایک رقعہ نکلا، طالب علم کو فوراً کلاس سے باہر نکالا گیا، اس کا فارم بھرا گیا اور وہ ایک سال کے لیے معطل ہوا، انویجیلیٹرس خفیف ہوئے، کسی نے اُف تک نہ کی، ان کے دورِ اقتدار میں ایسا کئی بار ہوا، ایسا منظر طبیہ کالج نے پھر شاید کبھی نہیں دیکھا کہ نقل کرنے کے جرم میں کسی کو سزا ہوئی ہو۔البتہ اس کے برعکس ایک واقعہ سے طبیہ کالج سالوں شرمندگی سے سرنگوں رہا، ہمارے ہی ایک استاذ (سبکدوش لیکن باحیات ہیں) جو حکیم طیب سے تعلق کا دم بھرتے تھے، ممکن ہے ان کے شاگرد بھی رہے ہوں، جب ڈین مقرر ہوئے تو تعلیم وتدریس تو درکنار امتحانات تک کا تقدس برقرار نہیں رکھ سکے، خود ان کے اوپر یہ الزام عاید کیا گیا کہ وہ طلبہ کے ایک گروپ کو نقل کروانے کا باقاعدہ انتظام کرتے ہیں، نتیجتاً کالج کی حیثیت بطور امتحان گاہ منسوخ کردی گئی اور برسوں طبیہ کالج کے امتحانات شعبۂ طبقات الارض اور احمدی اسکول برائے نابینان میں ہوتے رہے۔

جب میرا داخلہ ایم ڈی علم الادویہ میں ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ فائنل ایر کی کلاس چار اسٹوڈنٹس کے بجائے صرف ایک طالبہ (شہلا قمر انصاری) کرتی ہیں۔ شہلا بہت ذہین اور با اخلاق خاتون تھیں، میں نے انھیں سے ان کے 'لاشریک' ہونے کا راز جاننا چاہا تو انھوں نے بتایا کہ ''ایڈمیشن ٹسٹ میں Qualifying Marks صرف میرے ہی آئے تھے، اس لیے میں 'وحدانیت' سے سرفراز ہوں'' میں ان پر فی الفور تو ایمان نہیں لاسکتا تھا کہ نصف گواہی (بلکہ دعویٰ) فقہی تقاضوں کی تکمیل سے قاصر تھی، لیکن جب باریش مفتیوں نے بھی ان کے دعوے کی توثیق وتصدیق کردی تو یقین آگیا۔ بعد میں یہ جان کر اور حیرت ہوئی کہ طیب صاحب پر جو اس وقت صدر شعبہ تھے، دباؤ تھا کہ ایم ڈی ٹسٹ کی میرٹ میں تخفیف کر کے وہ چار طلبہ کو داخلہ دے دیں تا کہ علم الادویہ کی نام زد نشستیں پُر کی جاسکیں، لیکن قوانین کو سپوثر و تار کرنا ان کی شریعت میں ظلمِ عظیم تھا۔ حالانکہ اسی شعبہ میں اس کی مثال موجود ہے کہ ایک موقع پر ایسی ہی صورت حال میں طلبہ کو ایڈمیشن ٹسٹ میں کم نمبر لانے کے باوجود داخلہ دیا گیا، لیکن طیب صاحب اپنی مثال آپ تھے۔

ہمارے ایک سینئر ایک بار مفردات کا امتحان دے رہے تھے، حکیم صاحب نے ان سے افیون کی مقدار خوراک پوچھی، بدحواسی میں ان کی زبان سے ملی گرام کے بجائے گرام نکل گیا، اس جرم کی پاداش میں انھیں مفردات کا امتحان کئی بار دینا پڑا، ایسی فاش غلطی پر طیب صاحب گردن زدنی کو بھی جائز سمجھتے تھے۔

یونیورسٹی یا کالج کے قوانین کی پاسداری تو خیر فرائضِ منصبی کا حصہ ہے، حکیم صاحب اپنے بنائے ہوئے قوانین کی بھی پوری سختی سے پابندی کرتے تھے۔ حکیم صاحب اپنے چیمبر میں ایک مخصوص وقفہ میں مریضوں کو دیکھا کرتے تھے، ایک بار دو نوجوان ایک ساتھ ان کے کمرے میں داخل ہوئے، حکیم صاحب نے کالی عینک کے پیچھے سے دونوں کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا اور پہلے نوجوان سے پوچھا کیسے آنا ہوا؟ سَر! طبیعت ناساز ہے، آپ کو دکھانا چاہتا ہوں، اور آپ کیسے؟ وہ دوسرے نوجوان سے مخاطب ہوئے۔ میں ان کے ساتھ ہوں،

نوجوان نے قدرے اعتماد کے ساتھ جواب دیا۔ آپ تشریف لے جایئے، یہاں صرف مریضوں کو دیکھا جاتا ہے۔ حکیم صاحب کا فرمان برجستہ صادر ہوا اور دوسرے نوجوان کو کمرے سے باہر جانا پڑا، یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ دوسرا نوجوان حکیم صاحب کا اکلوتا داماد تھا، جس کی شادی کو ابھی ۶/ماہ بھی نہیں ہوئے تھے۔

شعبۂ علم الادویہ کے ایک بڑے ہونہار طالب علم جو مجھ سے ایک سال سینئر تھے، فراغت کے بعد اپنے وطن مالوف میں جا کر پریکٹس کرنے لگے، ابھی ایک سال کا عرصہ گزرا ہوگا کہ وہ ایک اعصابی مرض میں مبتلا ہو گئے، علاج کے سلسلہ میں انھوں نے علی گڑھ اور دہلی کا سفر کیا۔ وہ طیب صاحب کے شاگرد اور ان کی طبی حذاقت کے قائل تھے، لہٰذا انھوں نے استاذ محترم سے مشورہ کے لیے ان کے در دولت پر، جہاں سبکدوشی کے بعد وہ طبابت کیا کرتے تھے، حاضر ہوئے۔ انھوں نے طیب صاحب سے خود کو متعارف کرایا اور حاضری کا مقصد بیان کیا۔ حکیم صاحب نے ان کو مناسب رائے دی اور نسخہ تجویز کیا، طیب صاحب ان دنوں مبلغ ۵۰/روپے Consultation Fee کے طور پر لیا کرتے تھے، جس کے لیے انھوں نے ایک چھوٹی سی V-Shaped تختی اپنی ٹیبل پر رکھ لی تھی، جس پر Consultation Fee کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب کو احساس ہوا کہ تختی کا رخ الٹ گیا ہے، لہٰذا نوشتۂ لوح کی باصرہ نوازی، مریض کے لیے ممکن نہیں ہو پا رہی ہے، انھوں نے تختی کا رخ بدل دیا، شاگرد نے فیس ادا کی، استاذ نے قبول کر لی۔ طیب صاحب کے لیے ۵۰/روپیوں کی نہ تو کوئی اہمیت تھی اور نہ ضرورت، لیکن جو اصول انھوں نے بنا رکھا تھا اس کی خلاف ورزی وہ خود نہیں کر سکتے تھے، چاہے معاملہ شاگرد کا ہو یا ان کے کسی عزیز کا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ طیب صاحب نے فیس لینا ترک کر دیا تھا، لیکن مریضوں کی کثرت کو کم کرنے کے لیے انھوں نے پھر سے فیس لینا شروع کر دیا، یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ وہ فیس لیتے ضرور تھے لیکن اس کا ایک پیسہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کرتے تھے، اس رقم کو وہ ضرورت مندوں کی نذر کر دیتے یا رفاہی کاموں کے لیے مختص کر دیتے تھے۔

طیب صاحب کو طبی دنیا اور حلقۂ عوام میں زیادہ شہرت ان کے مطب و معالجہ سے حاصل ہوئی، اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے عہد کے سب سے 'معقول طبیب' تھے، ان کے نسخے، معمولات و مجربات، ان کی علمی عرق ریزی، جبلی جدت طرازی اور تجرباتی جانفشانی کی بازیافت تھے، عطائیوں کے عطیات یا محض خیال آرائی کی سوغات نہ تھے، اسی لیے ان کا معالجہ ہم عصر طبیبوں سے ممتاز تھا۔ فنِ طب کے جملہ علوم کا استحضار اگر طبیب کو نہ ہو تو وہ اچھا معالج نہیں بن سکتا، اس مقصد کے لیے مطالعہ میں وسعت، تنوع اور استمرار ضروری ہے۔ معالجانہ حذاقت اور ذہانت میں چولی دامن کا ساتھ ہے، کم علمی اور کند ذہنی معقول معالجہ کے ساتھ دو قدم بھی نہیں چل سکتے، حرص و ہوس اور دنیا داری سے پاک ہونا بھی طبیب کے لیے ضروری ہے، طیب صاحب، جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے کہ صاحبِ علم تھے، ان کے علم میں تنوع اور تہہ داری تھی، بلا کے ذہین اور نکتہ رس تھے اور دنیا داری سے کوسوں دور، معالجے میں انھوں نے ہمیشہ کتابی روش اختیار کی، لہٰذا ایک کامیاب معالج ثابت ہوئے۔ وہ اس دور کے غالباً واحد طبیب تھے جو یونانی اصولوں کی روشنی میں تشخیص اور علاج پر کاربند رہے، صرف علامتوں کے ساتھ بازیگری ان کے معمولات میں شامل نہیں تھی۔ نسخے ہمیشہ مختصر لکھتے تھے اور صرف انھیں امراض کا علاج کرتے تھے، جن میں مجرب یونانی معالجہ موجود ہے۔ ایڈس، کینسر، پتے کی پتھری جیسے امراض کا نہ کبھی انھوں نے علاج کیا اور نہ ہی اس کی وکالت کی۔ میرے ایک دوست، جو ایک بڑے سرکاری منصب پر فائز ہیں، کسی مرض میں مبتلا ہو کر حکیم طیب صاحب کے پاس پہنچے، انھوں نے ایک نسخہ تجویز کیا اور ایک ہفتہ کے بعد دوبارہ بلایا، ایک ہفتہ دوا کھانے کے بعد انھوں نے حسبِ ہدایت دوبارہ رجوع کیا اور بتایا کہ ان کو افاقہ نہیں ہوا، حکیم صاحب نے دوسرا نسخہ تجویز کیا اور کہا کہ اب آنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ اس مرض میں استعمال ہونے والی سب سے زیادہ کارگر دوا ہے، اگر اس دوا سے بھی فائدہ نہ ہو تو آپ کہیں اور رجوع کر سکتے ہیں۔ بہر حال دوسرا نسخہ کارگر ثابت ہوا اور وہ شفایاب ہوئے۔ اسی طرح ایک موقع پر شعبہ کے ایک استاذ کے توسط سے ایک خاتون نے حکیم صاحب کے پاس

اپنا حال کہلوایا کہ وہ ٹی بی کی مریضہ ہیں، جس کا ایلو پیتھک علاج جاری ہے، لیکن اس مرض کے علاوہ انھیں کوئی دوسرا مرض بھی لاحق ہو گیا ہے، جس کا علاج وہ ان سے کروانا چاہتی ہیں۔ حکیم صاحب نے فوراً جواب دیا کہ نسخہ تو میں لکھ دوں گا مگر دونوں دوائیں ایک دوسرے کو Antagonize کر دیں گی، لہٰذا وہ اس مرض کا علاج بھی اپنے ڈاکٹر کے مشورے سے کروائیں۔ یونانی اور ایلو پیتھک دواؤں کے Interaction پر اس اعتماد سے رائے دینے کی جرأت ایک عام طبیب نہیں کر سکتا، ایسے موقعوں پر میں نے اطباء کو فخریہ نسخہ لکھتے دیکھا ہے۔ مریضوں کو جھوٹی تسلی دینا یا ان کو گمراہ کرنا حکیم طیب صاحب کا وطیرہ نہیں تھا، بیشتر مریض ان کی ڈانٹ کھا کر مطب سے واپس آتے تھے لیکن ان کی طبابت، نسخہ نویسی، اخلاص اور شانِ مسیحائی پر کلام نہیں کرتے تھے کہ علی گڑھ میں پچھلے کم و بیش پچیس سال سے وہی حرف آخر سمجھے جاتے رہے۔ میں نے کئی اطباء کو مفردات کا نسخہ ذوق و شوق سے لکھتے دیکھا ہے، لیکن جو معقولیت اور موزونیت طیب صاحب کے نسخہ میں تھی شاید کم اطباء کے حصہ میں آئی ہے، لکھنؤ اسکول کا نمائندہ ہونے کے باوجود ان کے نسخوں میں نرگسیت نہیں تھی، نسخوں میں گل بوٹے ٹانکنے کے بجائے وہ مناسب دوا کے انتخاب پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔

حکیم صاحب کی وابستگی شعبۂ علم الادویہ، علی گڑھ سے عرصہ تک رہی ہے، اس کے قیام اور سربلندی میں موصوف کا رول بہت نمایاں ہے، شعبہ میں صحت مند Working Culture کا فروغ بیشتر انھیں کا رہینِ منت ہے۔ ان کے جانے کے بعد یہاں جو کمی شدت سے محسوس کی گئی وہ یہ تھی کہ Administrative Control کی وہ جھلک اب نہیں دکھائی دیتی، جو ان کے زمانے تک باقی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار حکیم صاحب اپنے کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک بزرگ جن کی ڈیوٹی لیب کے اندر ہوا کرتی تھی، وہ اپنی لیب سے باہر نکل کر کھڑے ہیں، حکیم صاحب کا چہرہ غصے سے تمتما گیا اور انھوں نے ایسی ڈانٹ پلائی کہ موصوف کئی دنوں تک اپنی لیب سے باہر نظر نہیں آئے اور طیب صاحب کا سامنا تو انھوں نے مہینوں نہیں کیا۔ مناسب علمی ماحول کے لیے آفس اور لیب میں نظم و نسق کا ہونا ضروری ہے،

ورنہ سبھی علمی اور تجرباتی کام معطل ہو جاتے ہیں۔ طبیہ کالج کی بدنصیبی ہے کہ یہاں پر جو آفس اسٹاف یا غیر تدریسی عملہ مامور کیا جاتا ہے وہ یونیورسٹی کے کسی دوسرے شعبہ سے اپنی نا اہلی اور ناکارکردگی کا سرٹیفکیٹ لے کر آتا ہے اور طبیہ کالج کے اربابِ حل وعقد اسے خوشی سے قبول کر لیتے ہیں، ایسے لوگوں سے کام لے لینا بھی کارے دارد، لیکن حکیم طیب صاحب ایسے لوگوں کے گلے میں بھی 'جُوا ٹھا' ڈال دیتے تھے، پھر یا تو وہ کام کرنے پر مجبور ہوتے یا کسی دوسرے شعبے میں تبادلہ کروالیتے تھے۔ آج شعبہ کی حالت یہ ہے کہ کوئی ملازم اگر اپنی جائے کار (Work Place) پر موجود ہو تو یہ محض اتفاق ہوگا۔ نظم ونسق پر گرفت اگر ڈھیلی پڑ جائے تو پھر علمی سرگرمیاں متاثر ہوئے بنا نہیں رہتیں۔ ان کی پرنسپل شپ، ڈین شپ اور دوسرے انتظامی ادوار میں طبیہ کالج کی کارکردگی مثالی رہی اور اس کالج کا نام معیارِ تعلیم وتحقیق کے لیے ضرب المثل بن گیا تھا، لیکن ان کے جانے کے بعد پورے کالج کی ساکھ مجموعی طور پر متاثر ہوئی ہے۔

شعبۂ علم الادویہ تو پھر بھی کسی قدر عظمتِ رفتہ کی صدائے بازگشت کے زیر اثر اور کچھ بعض فقید المثال اساتذہ کی عمدہ کارکردگی کے طفیل اپنی علمی قدآوری کا بھرم کسی حد تک قائم رکھے ہوئے ہے، لیکن پورے کالج یا فیکلٹی کی من حیث المجموع جو شبیہ لوگوں کے ذہن پر نقش ہے، اس کا اندازہ مجھے اپنے بنگلور کے دو سال کے قیام کے دوران ہوا، جب میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ سے وابستہ تھا، مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کا ہر استاذ طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ملازمت کا خواہاں ہے، مجھے ان کی اس خواہش پر حیرت ہوئی۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ کا کیمپس اور بنگلور کی آب ہوا میں ایسی دلربائی اور رعنائی رچی بسی ہے کہ پلک جھپکانے کو جی نہیں چاہتا۔ بنگلور میں Quality of Life ہندوستان کے کسی دوسرے شہر سے بہتر ہے، مزید برآں انسٹی ٹیوٹ میں درس وتدریس اور ریسرچ وتحقیق کی جو سہولیات اور وسائل دستیاب ہیں، وہ ہندوستان کی بیشتر طبی درسگاہوں میں ممکن ہی نہیں ہیں، ایسے ماحول کو چھوڑ کر علی گڑھ جانے کے بارے میں لوگ کیوں سوچ رہے ہیں؟ جہاں انسان کی آدھی زندگی موسم کی ریشہ دوانیوں اور بجلی وپانی جیسی

سہولیات کی عدمِ دستیابی پر گفتگو کرتے گزر جاتی ہے، میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب بیشتر لوگوں نے (تنہائی میں) اعتراف کیا کہ انسٹی ٹیوٹ میں بہت پابندیاں ہیں۔ ۹-۵ تک کے اوقاتِ کار میں شعبہ میں موجود رہنا ہوتا ہے، روزانہ کلاس لینی ہوتی ہے، ریسرچ کا ڈھیروں کام رہتا ہے اور ہر ماہ اپنی کارکردگی کی روداد جمع کرنی پڑتی ہے، یہاں فرائض کی انجام دہی سے مفر نہیں ہے، میں ان کی جرأتِ رندانہ پر انگشت بدنداں رہ گیا کہ اب اجمل خاں طبیہ کالج جیسے رفیع الشان مینارۂ نور وحکمت پر ایسے لوگوں کی نظر ہے، جو اپنے فرائضِ منصبی کی انجام دہی سے فرار کی خاطر اسے گوشۂ عافیت کے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں۔

طیب صاحب ایک بڑے عالم تھے اور بڑے اچھے معلم ثابت ہوئے، لیکن کبھی کبھی ایک سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ شعبۂ علم الادویہ ہندوستان کا پہلا پوسٹ گریجویٹ ادارہ ہے، جس نے طب کی اعلیٰ تعلیم کی داغ بیل ڈالی اور اس کا اعلیٰ معیار بھی متعین کیا، اس شعبہ کے ایک اساسی رکن کو کیا اپنا دائرۂ کار کلاس ٹیچنگ، انتظام وانصرام اور مطب ومعالجہ تک محدود رکھنا چاہیے تھا یا تحقیق وتدوین اور تصنیف وتالیف پر بھی اسے کماحقہٗ توجہ کرنے کی ضرورت تھی؟، حالانکہ انھوں نے چند کتابیں، رسالے اور دسیوں ریسرچ پیپرس تحریر کیے ہیں اور متعدد تحقیقی کاموں کی نگرانی کی ہے، لیکن ان کی تحریروں کی مدتِ حیات بہت مختصر ہے اور ان کے جو کام سامنے آئے ہیں وہ اہم ہونے کے باوجود ان کے علمی مرتبہ سے فروتر اور غیر مماثل ہیں۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ طیب صاحب کی کوئی منضبط سماجی یا عائلی زندگی نہیں تھی وہ مردم بیزار قسم کے آدمی تھے، ان کے پاس وقت اور فراغت کی فراوانی تھی، جو ایک عالم اور دانشور کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں، ایک مدت مدید تک انھوں نے ملازمت کی اور اس کے بعد کم وبیش بیس سال کا وقت بالکل فراغت اور بے فکری میں گزارا، اس دوران وہ صحت منداور چاق وچوبند بھی رہے، ان کے پاس سنہری موقع تھا کہ پوری زندگی کے مطالعات اور علمی تجربات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر دیتے تو ایک شاہکار منصۂ شہود پر آجاتا۔ امید بھی تھی کہ ان جیسے عالم کے

رشحاتِ قلم سے ایک عالم فیضیاب ہوگا، لیکن یہ نہ ہو سکا اور ہم لوگ ایک بڑے اسکالر سے محروم ہونے کے ساتھ ساتھ، ان باقیات اور تبرکات سے بھی محروم ہو گئے جو ہمارے ورثے میں آتے۔ اہم سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہوا کہ ایک مایۂ ناز اسکالر، جس کے پاس نہ علم کی کمی تھی اور نہ فارغ اوقات کی، اس سے وہ علمی کام نہ ہو سکا جس کی اس سے توقع تھی، جبکہ ان کے ہم عصروں میں کئی اطباء ایسے ہیں جو ان جیسے Versatile نہ تھے، پھر بھی انھوں نے وقیع نہ سہی لیکن کچھ قابلِ ذکر علمی کام ضرور کر ڈالے۔

حقیقت کا حال تو خدا کو ہی معلوم ہے، لیکن اس کی ایک وجہ جو بادی النظر میں ذہن ناقص میں فلیش کرتی ہے، وہ یہ ہے کہ حکیم صاحب کے ذوقِ طبابت نے ان کو علمی اور تحقیقی کاموں سے دور رکھا۔ ان کو طبابت کا بہت شوق تھا اور اوائل عمری سے ہی وہ مطب و معالجہ سے وابستہ رہے اور اس فن میں مہارت اور اس کے توسط سے بڑی ناموری اور شہرت حاصل کی، ان کے شوق کا یہ عالم تھا کہ شعبۂ علم الادویہ سے وابستہ ہونے کے سبب طبابت گو کہ ان کے فرائضِ منصبی سے خارج ہو چکی تھی پھر بھی وہ اپنے چیمبر میں مریضوں کو دیکھتے تھے اور شعبہ کو مرجعِ خلائق بنائے رہتے تھے۔ یہ بات ظاہراً اچھی معلوم ہوتی ہے، لیکن شعبہ کے دائرۂ کار سے خارج ہونے کے سبب مطب و معالجہ اس کی خالص علمی فضا اور تحقیقی Set up کے لیے سمِ قاتل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ طبابت بلا شبہ ایک شریفانہ مصروفیت ہے، جس سے عوام الناس کو فائدہ ہوتا ہے، لیکن اس مقصد کے لیے طبیہ کالج میں ایک مستقل ہاسپٹل قائم ہے، جہاں متعلقہ شعبہ (معالجات، جراحت، نسواں وغیرہ) کے لوگ اپنی خدمات انجام دیتے ہیں۔ معالجہ ان کے فرائضِ منصبی اور اختصاص کا حصہ ہے، لہٰذا ان کی علمی سرگرمیوں کے لیے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ علم الادویہ کا دائرۂ کار بالکل جداگانہ ہے، جس میں مریض و معالجہ سے کم سابقہ پڑتا ہے، اساسی، تجرباتی اور محدود اطلاقی ریسرچ پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے، لیکن حکیم طیب صاحب نے شعبہ کو نیم مطب بنا کر ایک ایسی بدعت کی طرح ڈال دی جو علمی اور تحقیقی کاموں سے متغائر تھی۔ علاج و معالجہ، علمی سے زیادہ عملی بلکہ میکانیکی کام ہیں، آدمی کا میلان جب اس قسم کے کاموں

کی طرف بڑھ جاتا ہے تو علمی دقائق سے وہ صرفِ نظر کرنے لگتا ہے اور غالباً یہی حکیم طیب صاحب کے ساتھ ہوا، غیر معمولی صلاحیت کے حامل ہونے کے باوصف انھوں نے کوئی ایسا علمی کام نہیں کیا جو طب میں اضافہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ طبابت کی واہ واہ انھیں ترفع کا احساس دلاتی رہی اور ان کو حقیقی علمی دنیا سے دور لے گئی۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کے پاس وقت ہی وقت تھا، مجھے تعجب ہے کہ انھوں نے اپنے بیس سال کے شب و روز کو کیسے گذارا؟ حالانکہ ان کے پاس ظاہراً کوئی مصروفیت نہ تھی۔ مطب کی لت نے غالباً یہاں بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور ان کو کسی سنجیدہ علمی کام کی طرف مائل نہیں ہونے دیا۔ طیب صاحب جیسے ذی علم اور بالغ نظر انسان کے لیے یہ مناسب نہیں تھا کہ اپنے شایانِ شان کام کرنے کے بجائے مطب سجا کر بیٹھ جاتے۔ وہ اپنی بے کراں صلاحیتوں کو تخلیقی قالب میں نہ ڈھال سکے، بلکہ روایتی اطباء اور اوسط درجہ کے اسکالرس کی طرح خود کو 'خدمت خلق' پر مامور رکھا۔ صحیح بات تو یہ ہے مطب و معالجہ سے دلچسپی ان کے مزاج سے میل ہی نہیں کھاتی تھی، اس عمل کے دوران ایسے لوگوں سے گفت و شنید اور پرسشِ احوال کرنی پڑتی ہے، جن سے روزمرہ کی زندگی میں طیب صاحب بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے، انھیں تکوینِ ثروت کی بھی حاجت نہ تھی کہ ان کے اخراجات کے مواقع بہت محدود تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنی شناخت کو قائم رکھنے کے لیے یہ کڑوی دوا وہ تاعمر پیتے رہے۔

طیب صاحب کے مطب و معالجہ سے شعبۂ علم الادویہ کو تو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، البتہ ان کے تجربات سے دواخانہ طبیہ کالج نے ضرور فائدہ اٹھایا۔ دواخانہ بہت سی مصنوعات طیب صاحب کے ودیعت کیے ہوئے نسخوں پر تیار کرتا ہے، اس کی بعض مصنوعات کے نسخوں میں انھوں نے حذف و اضافہ بھی کیا ہے۔ سید حامد صاحب (وائس چانسلر) سے کسی نے شکایت کی کہ دواخانہ جو 'دماغین' تیار کرتا ہے وہ اسم بامسمی نہیں ہے، اس میں صرف آملہ بھرا ہوتا ہے، دیگر دوائی اجزاء یا تو شامل نہیں کیے جاتے یا ان کی کوئی افادیت نہیں ہوتی۔ اس مرکب کو کھانے سے ذہن و دماغ پر مثبت تو کیا کوئی منفی اثر بھی نہیں ہوتا۔ حامد صاحب نے طیب صاحب کو

کی طرح ہی ان کی دیانت داری اور جذبۂ عدل کو بھی شاید ان کے شاگردوں نے اخذ کرنے کا التزام نہیں کیا۔

بہر حال طیب صاحب ایک بڑے اسکالر، طبیب اور اکیڈمک ایڈمینسٹریٹر تھے، آزاد انسان تھے، لیکن ان کی دنیا محدود تھی، ہزاروں انسانوں کو اپنی مسیحائی سے فیضیاب کیا اور ہزاروں طالب علموں کے ذہن کی تنویر کی، جب تک وہ طبیہ کالج سے وابستہ رہے، ایک فعال اور باوقار زندگی گذاری اور جب رخصت ہوئے تو ان کے دامن پر کوئی داغ نہ تھا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

حضرت الاستاذ حکیم محمد طیب صاحبؒ

پروفیسر حکیم جلیس احمد
پرنسپل زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج، پونہ

کہو وہ کون حسیں ہے تمہاری محفل میں
کہ جس کے نام کے ساغر لنڈھائے جاتے ہیں

انسانی شرافت کا نمائندہ چہرہ، آنکھوں میں مروت وآدمیت کی قندیل روشن، لوح پیشانی پر آگہی کا مہر نیمروز تاباں، شرافت و دیانت کی چاندنی میں بسی ہوئی شخصیت، خاموش طبع لیکن خاموشیاں بھی فکر وجلال کی بلاغت سے معمور ومخمور، سج دھج سادگی کا مظہرِ جمیل، خوش وضع، خوش خصال وخوش جمال، علی گڑھ تہذیب کا معلم فرد، طلبہ کا ہمدرد، بہی خواہ وغمگسار وکارساز۔ یہ تھے محترم ومحتشم، مکرم ومعظم استاذ حکیم طیب صاحبؒ، طاب اللہ ثراہ واکرم مثواہ وجعلہ من ورثۃ جنۃ النعیم۔ آمین!

جب میں نے پہلی بار استاذ محترم کو دیکھا تو ان کی شخصیت کے روپ نگر کی یہی تصویر میرے ذہن میں اُبھری، جسے پہلی بار صفحۂ قرطاس پہ منتقل کر رہا ہوں، شاید علی گڑھ کی آنے والی نسل کو علی گڑھ سے محبت کا اس سے سبق مل سکے۔

الفاظ کی صنعت گری کے اس دور میں خلوص کے آبگینوں کی قدر وقیمت اگرچہ کچھ زیادہ نہیں رہ گئی ہے لیکن سچائی کا اظہار ضروری ہے اس لیے کہتا ہوں کہ استاذ محترم کی تصویر جو پہلی

بار میرے ذہن میں اُبھری تھی، آج بھی بے کم وکاست ہو بہو ویسی ہی ہے، مرورِ ایام سے اس میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ شعور کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس کی کشش و دلنوازی میں مزید اضافہ ہوتا گیا، ان کی یہی خوبیاں تھیں، جن کی وجہ سے ان کی شاگردی پہ ناز تھا اور برابر قائم رہا۔ طالب علمی کا زمانہ گذرنے کے بعد اپنی نسبت سے کچھ کہنا چاہوں تو حقیقت یہ ہے کہ ''مجھ کو ان کی دلبری پر اب بھی فخر وناز ہے''۔

طالب علمانہ زندگی کا ہر لمحہ اقبال کے 'طائرِ لاہوتی' کی طرح ہمہ دم جانب منزل آمادہ پرواز رہتا ہے اور دنیا کے رنگ وبو میں الجھ کر کوتاہ پروازی کا شکار نہیں ہوتا، یہی لمحے غیر محسوس طریقے پر اس کی زندگی کی نقش گری کرتے رہتے ہیں۔ جو استاذ نصابی تدریس کو آدمیت کی تدریس کا وسیلہ بنانے کا فن جانتا ہے وہ طلبہ کی زندگی کو آدمیت کا نقشِ تمام بنا دیتا ہے، یہ بات اب عموماً تسلیم کی جانے لگی ہے کی صرف نصابی کتابوں کی تدریس سے کسی استاذ کی عظمت طلبہ کے دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتی، بلکہ جو استاذ اپنے خونِ جگر سے سیکڑوں چراغ روشن کرنے کا ہنر جانتا ہے اسی کی عظمت کا شعور دلوں میں بیٹھتا اور جمتا ہے اور ہمیشہ ہی جما رہتا ہے۔ حکیم محمد طیب صاحبؒ کی عظمت کا یہی راز تھا، ان سے فیض یافتگان کی کثیر تعداد ایسی ہے، جن کے دلوں میں وہ زندہ ہیں، اور وہ ان کی عظمتوں کے پرستار ہیں۔ میں نے بارہا محسوس کیا کہ نصابی کتاب کا وہ درس دیتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ ان کی روح بولتی ہے، بالفاظ دیگر ان کی آواز میں مجھ کو روح کا لمس محسوس ہوتا تھا، یہ چیز کسی نصابی درس کی معلومات کو طالب علم تک منتقل کرنے سے پہلے اس کی قلب وروح میں بلند انسانی اخلاقی شرافت و پاکیزگی، عالی ظرفی اور بلند نگاہی کا عکس اتار دیتی ہے، جس سے طالب علم کو علمی فتوحات کے سرور کے ساتھ روحانی بلندیوں کے شعور کا خمار حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ جب وہ درس سے فارغ ہو کر کلاس سے نکلتا تھا تو چہرے پہ آگہی کا نور اور آدمیت کے احساس کی قوت اور پھبن ہوتی تھی۔

ع نکلے ہیں میکدے سے تو چہرے پہ نور ہے

مجاز نے ترانۂ علی گڑھ میں 'سرشار نگاہ نرگس ہوں' کی جو بات کہی ہے اس کا مدعا یہی ہے

کہ علی گڑھ کے طلبہ کی تعلیم صرف نصابی معلومات تک محدود نہیں ہوتی، بلکہ ان کو اپنے اساتذہ کا پورا پورا فیضِ صحبت اور بھر پور فیضِ نگاہ بھی حاصل ہوتا ہے اور مجھے حکیم صاحب کا شاگرد ہونے کی بناء پر جو خاص فیض پہنچا، اس کی بناء پر مجھے اس مصرعہ کی معنوی وسعتوں کا ادراک بھی خوب خوب ہوا اور میری سرشاری کا عالم بھی فزوں تر رہا۔

حکیم صاحب کی نگاہ کرم کا کچھ خاص فیضان ہم پر یوں بھی رہتا تھا کہ وہ ہر بات اور حرکت پر نظر رکھتے تھے تاکہ علی گڑھ کی تربیت کا کوئی گوشہ یا پہلو ناقص نہ رہ جائے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہم سب کلاس فیلو (غفران احمد، محمد تقی، طارق انور اور راقم الحروف) کلاس میں دو منٹ تاخیر سے پہنچے، حکیم صاحب کے چہرہ پر جلال کے آثار نمایاں تھے، لرزتے کانپتے ہوئے ہم سب نے اپنی اپنی نشست سنبھالی تو حکیم صاحب نے اپنے بارُعب انداز اور اخلاص کے طاقتور لہجے سے ہمارا دل چیر دیا، فرمایا! وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، اہتمام کیجئے کہ آئندہ زندگی کا کوئی لمحہ رائیگاں نہ جائے، وقت کی تنظیم ہی زندگی کی کامیابی کی شاہ کلید ہے اور زندگی کی کامیابی انسانیت واخلاق کی فتح ہے، جس سے علی گڑھ کی تہذیب کے سوتے پھوٹتے ہیں۔

مجاز کے ترانہ کے بند ''پابستۂ گیسوئے سنبل ہوں'' میں اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ علی گڑھ کو ملت کے سرمایۂ عزیز کے طور پر آفت اور نگاہ بد سے بچائے رکھے تاکہ اس کے فرزند سرشار نگاہ نرگس اور پابستۂ گیسوئے سنبل ہو کر زندگی کی بیکراں وسعتوں میں کامیابی وعروج کے زینے طے کرتے رہیں۔

طالب علمی کے زمانہ میں استاذ وشاگرد کے باہمی رشتوں کی سرحدیں ادب واحترام کے تقاضوں کی حساسیت ونزاکت کی وجہ سے کچھ فاصلوں کی پابند ہوا کرتی ہیں، تربیت کی تکمیل کے نقطۂ نظر سے یہ فاصلے ناگزیر ہوتے ہیں، اس لیے استاذ چاہتے ہوئے بھی ان فاصلوں کو کم نہیں ہونے دیتا اور بے تکلفانہ امور ومعاملات سے پرہیز اور برحزر رہتا ہے، مبادا مطلوبہ تربیت پر ناموافق اثرات مرتب ہوں۔ اس لیے علی گڑھ میں رہتے ہوئے ادب کے تقاضوں کے یہ فاصلے برقرار رہے اور ان کی شخصیت کا وہ استاذانہ پیکر میرے ذہن میں پیوست رہا، جس

کے گرد عظمتوں کا خود ساختہ حصار ہوتا ہے، لیکن تعلیم سے فراغت کے بعد جب زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج، پونہ میں تدریس کے منصبی فرائض پر مامور ہوا تو یہاں یونانی میڈیسن پر نیشنل کانفرنس کی نسبت سے انہیں کلیدی خطبہ کے لیے مدعو کیا گیا، انھوں نے دعوت نامہ کو شرف قبولیت بخشا اور پونہ تشریف لائے۔ میں ان کے مزاج کی شرافت و نزاکت سے بخوبی واقف تھا اس لیے ان کی ضیافت اور خاطر و مدارات کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی اور یہ ذمہ داری یقیناً میرے لیے خوش بختی تھی، کیونکہ اس دوران ان سے قریب اور کسی حد تک بے تکلف ہونے کا موقع فراہم ہوا، میں نے یہاں تمام تر چیزیں اسی انداز سے مرتب و منظّم کی تھیں جو علی گڑھ میں خود ان کا وصف خاص رہا تھا۔ انھوں نے تمام چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد خوشی و مسرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ''ایسا لگتا ہے کہ علی گڑھ سے سب کچھ اٹھالائے ہو اور پونہ میں اسے بڑی خوبصورتی سے سجادیا ہے'' اس کے بعد وہ بہت بے تکلف ہو کر باتیں کرنے لگے اور خوش ہو کر دیر تک مجھ کو فیضیاب کرتے رہے اور میں مدتوں بعد دوبارہ ان سے استفادہ کی سعادت حاصل کرتا رہا، اس بے تکلفی میں ان کی شخصیت کی پرتیں ایک ایک کر کے کھل چکی تھیں، وحدہٗ لاشریک پر ان کا یقین کامل، یونانی طب کی ترقی و کامرانی کی فکر ان کی ذات کا جزء لاینفک تھیں۔

مجھے حیرت ہوئی کہ طالب علمانہ ادب و احترام والے زمانہ میں ان کی عظمتوں کے جو نقوش میرے ذہن میں ثبت ہو چکے تھے، ان میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا بلکہ مزید اضافہ ہوا۔ میری عقیدتوں نے ان کی عظمتوں کو جھک کے سو سو سلام کیے، کیونکہ ان کی شخصیت میں عظمتوں کے جو نقوش میں نے دریافت کیے تھے، وہ ان کے منصب کی وجہ سے نہ تھے، بلکہ وہ ان کی ذات کا لازمہ تھے۔

پروگرام ختم ہونے کے بعد رخصت کرنے کے لیے ان کو ساتھ لے کر ایر پورٹ چلا تو میری عجیب کیفیت تھی، میری محبت و شیفتگی مچل مچل کر ان پر قربان ہوتی رہی اور وہ مجھے فرط مسرت سے دعاؤں سے نوازتے رہے۔ گیٹ سے ایر پورٹ کے اندر داخل ہوئے، چند قدم کے بعد رکے، میری طرف دیکھا، دعائیہ انداز میں ہاتھ لہرایا اور الوداع کہتے ہوئے آگے

بڑھ گئے، حضرت الاستاذ سے یہ میری آخری ملاقات تھی۔ افسوس اب اس دنیا میں ان سے کبھی ملاقات نہ ہو سکے گی، اب تو صرف ان کی یادیں رہ گئی ہیں، یقین جانئے ان ہی یادوں کی وجہ سے میرے تصور کا نشیمن گلزار رہتا ہے اور میرے کاموں میں حسن وخوبی کی رحمتیں اور برکتیں رہتی ہیں۔

حضرت الاستاذ کو علاج بالمفردات میں کمال حاصل تھا۔ مطب میں لاعلاج مریضوں کا ہجوم رہتا تھا لیکن دولت کی بہتات جمع کرنے کے بجائے ان کو طلبہ کی فکر ولگن رہتی تھی اس لیے وہ طلبہ پر اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کرتے تھے اور ان کو زیادہ سے زیادہ باکمال بنانے کی دھن میں رہا کرتے تھے۔ جب کوئی مصیبت کا مارا، ڈاکٹروں کا تختۂ مشقِ ستم بن کر بے حال وناامید ہو جاتا تو آپ سے رجوع کرتا اور الحمدللہ وہ چند روپیوں میں ہی صحت مند وشفایاب ہو جاتا۔ ایک بار ایک مریض ایسا آیا جس کو بول الدم کی شکایت تھی، مختلف ڈاکٹروں نے علاج کیے، لیکن 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی' کے مصداق، اس کی حالت دگرگوں ہوتی گئی، جب کوئی چارہ نہ رہا تو کسی نے حضرت الاستاذ سے علاج کی سفارش کی، آپ نے اس کو دیکھا، کیفیات دریافت کی پھر نسخہ تجویز کیا اور اس کو صرف روغنِ صندل استعمال کروایا کچھ ہی دنوں میں سالوں کا مریض پورے طور پر صحت مند تھا۔ ایسے باکمال اطباء کی عصر حاضر کو ضرورت ہے۔ حکیم صاحب پوری لگن سے عصر حاضر کی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے طلبہ کو تیار کرتے تھے، لیکن افسوس کہ طلبہ کی اکثریت ایلوپیتھک کے سکہ رائج الوقت کی ہی زیادہ دلدادہ وپرستار رہتی تھی اور ان سے وہ فیض نہ حاصل کر سکی جو کرنا چاہئے تھا۔

حکیم محمد طیب کا طریقۂ تدریس

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی
دہلی

۱۹۸۳ء میں میرا داخلہ اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں، پری طب میں ہوا، ایک سال کے بعد مجھے جن اساتذہ سے کسبِ فیض کی سعادت حاصل ہوئی ان میں حکیم محمد طیب صاحب بھی تھے۔ حکیم صاحب کا شمار ان دنوں کالج کے انتہائی سینئر اساتذہ میں تھا، ساتھ ہی ان کے پاس کالج کی پرنسپل شپ کا بھی چارج تھا۔ سینئر اساتذہ ابتدائی درجات کی کلاس لینا کسرِ شان سمجھتے تھے، یا کالج انتظامیہ ہی ان درجات کی تدریس ان کے حوالے نہ کرتی تھی، مجھے نہیں معلوم، لیکن میرے لیے حیرت کی بات تھی کہ حکیم طیب صاحب بے حد سینئر اور بہت زیادہ مصروف ہونے کے باوجود بہت پابندی سے سال اول کی کلاس لیتے تھے، ان کے ذمہ ادویۂ مفردہ کا مضمون کیا گیا تھا۔

اس وقت کالج کے اساتذہ کا طریقۂ تدریس جدا جدا تھا، کچھ اساتذہ چھوٹی پرچیوں پر اسباق کے نکات لکھ کر لاتے اور وہ ان کی مدد سے لکچر دیا کرتے تھے، ان کا لکچر زیادہ تر زبانی ہوتا تھا مشکل الفاظ اور قابل ذکر نکات کو وہ بلیک بورڈ پر لکھ دیا کرتے تھے، درمیان میں وقتاً فوقتاً پرچیاں بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ کچھ اساتذہ نوٹس لکھ کر لایا کرتے تھے اور کلاس میں ان کا املا کرادیا کرتے تھے، بعض اساتذہ کے نوٹس تو اتنے پرانے ہو گئے تھے کہ لگتا تھا، انہوں نے

بہ حیثیت لکچرر تقرری کے بعد سال دو سال کے اندر جو نوٹس تیار کیے تھے، انہی کا املاوہ ہر سال طلبہ کو کرادیتے تھے، نئی معلومات کا اضافہ اور نئی درسی کتب سے استفادہ تو دور کی بات تھی، کاغذ کی بوسیدگی کے باوجود وہ پرانے نوٹس کو نئے کاغذ پر نقل کر کے لانے کے بھی روادار نہ تھے، لیکن حکیم طیب صاحب کا معاملہ بالکل جدا تھا، ان کا پورا لکچر زبانی ہوتا تھا، وہ نہ اپنے ساتھ کوئی پرچی لاتے تھے، نہ زبانی لکچر دینے کی وجہ سے ان کی زبان پر کبھی لڑکھڑاہٹ آتی تھی، ایسا لگتا تھا کہ پورا لکچر انہیں بالکل ازبر ہے اور وہ پوری روانی کے ساتھ اسے دہرا رہے ہیں۔

حکیم طیب صاحب بڑے رعب داب کے مالک تھے، یوں تو اپنے مخصوص مزاج کی وجہ سے ہی دورانِ طالب علمی کسی استاذ سے قریب نہ ہو سکا، تمام اساتذہ سے صرف کلاس کی حد تک ہی تعلق رکھا، لیکن حکیم صاحب کو دیکھ کر کچھ زیادہ ہی خوف محسوس ہوتا تھا، ان کا پیریڈ شروع ہوتے ہی پوری کلاس میں سناٹا چھا جاتا تھا، حکیم صاحب وقت کے بہت پابند تھے، کیا مجال کہ پیریڈ شروع ہونے کے بعد ان کی کلاس کا کوئی طالب علم باہر رہ جائے، اگر کوئی کسی ضرورت سے باہر رہ گیا ہے اور حکیم صاحب کلاس میں آگئے ہیں تو ان کے بعد کلاس روم میں داخل ہونے کی اس کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

حکیم طیب صاحب مرحوم کی آواز بڑی پاٹ دار تھی، ہمارا بیچ (Batch) پچاس طلبہ وطالبات پر مشتمل تھا، کسی کو شکایت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کوئی بات نہیں سن سکا ہے یا اس تک ان کی آواز صاف نہیں پہنچی ہے، حکیم صاحب ایک ایک لفظ صاف ادا کرتے تھے، ایک بات یہ قابل ذکر ہے کہ وہ نہ تو کوئی لفظ یا جملہ دہراتے تھے اور نہ یہ پسند کرتے تھے کہ کوئی طالب علم ان سے کوئی جملہ دہرانے کو کہے، بسا اوقات کوئی طالب علم کچھ پوچھ بیٹھتا یا یہ اظہار کرتا کہ وہ فلاں بات ٹھیک سے نہیں سن سکا ہے، اسے دہرا دیجئے تو اس پر سخت ناگواری کا اظہار کرتے تھے۔

ادویۂ مفردہ پر لکچر انہوں نے حروفِ تہجی کی ترتیب سے دیا، پہلے وہ دوائیں جو الف مدآ سے شروع ہوتی ہیں، پھر الف سے شروع ہونے والی دوائیں، پھر 'ب' سے شروع ہونے والی دوائیں،

اسی طرح آخر تک۔ انہوں نے تقریباً ڈیڑھ سو دواؤں پر لیکچر دیا، ہر دوا کے بارے میں وہ یہ باتیں بتاتے تھے: نام، ماہیت، افعال، مواقعِ استعمال، وزن، اوقاتِ استعمال، طریقۂ استعمال، مصلح وغیرہ۔ جس دوا پر لیکچر دیتے اس کا نام بلیک بورڈ پر لکھ دیا کرتے تھے، پھر دورانِ درس جو مشکل الفاظ آتے ان کا صحیح تلفظ بتاتے اور انہیں بھی بلیک بورڈ پر تحریر کر دیتے، اس طرح ایک دوا کا بیان آٹھ دس سطروں میں آجاتا تھا۔

اس موقع پر ایک واقعہ کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا، ہمارے ایک کلاس فیلو نے امتحان میں نقل کرنے کے لیے ایک انوکھی ترکیب نکالی، انہوں نے ادویۂ مفردہ کی پرچی اس طرح بنائی کہ حکیم صاحب نے پورے کورس میں جو کچھ پڑھایا تھا، سب کو ایک بڑے کاغذ کے دونوں طرف انتہائی باریک خط میں لکھ لیا، مزید غضب یہ کیا کہ فوٹو اسٹیٹ کروا کے اسے اپنے قریبی دوستوں میں تقسیم کر دیا کہ وہ حافظہ پر زور دیئے بغیر پوچھے گئے سوالات کا صحیح صحیح جواب اس پرچے کی مدد سے لکھ سکیں۔ مگر شومیٔ قسمت کہ وہ امتحان ہال میں پکڑے گئے اور ان کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

حکیم طیب صاحب لیکچر کے دوران الفاظ واصطلاحات کے صحیح تلفظ پر بہت زور دیتے تھے۔ طب کی بیش تر اصطلاحات کا تعلق عربی زبان سے ہے اور اس میں زیر زبر بدل جانے سے معانی بالکل بدل جاتے ہیں۔ خاص طور سے ادویۂ مفردہ کے مضمون میں استعمال ہونے والے بہت سے الفاظ اسمِ فاعل کے وزن پر ہیں، جیسے مفرِّح، مقرِّح، محلِّل، معدِّل، مخدِّر، معطِّس، معطِّش، مفجِّر، منجِّز، مدمِّل، مسمِّن، مسخِّن، معرِّق، محمِّر، مبخِّر، منقِّط، مغلِّظ، مولِّد وغیرہ۔ ان میں ہر لفظ کے پہلے حرف پر پیش، دوسرے حرف پر زبر اور تیسرے حرف پر تشدید کے ساتھ زیر ہے، بعض الفاظ اسم مفعول کے وزن پر ہیں جیسے مروَّق، مکلَّس، محمَّص، مشوَّی، مدبَّر، مقرَّض، مجوَّف وغیرہ، ان میں سے ہر لفظ کے پہلے حرف پر پیش، دوسرے حرف پر زبر اور تیسرے حرف پر تشدید کے ساتھ زبر ہے۔ عموماً عربی زبان سے ناواقف لوگ یہ فرق ملحوظ نہیں رکھ پاتے اور زیر کی جگہ زبر اور زبر کی جگہ زیر لگا کر پڑھتے ہیں، اسی طرح کچھ الفاظ ایسے بھی ہیں

جن کے تیسرے حرف پر کبھی زیر آتا ہے اور کبھی زبر، مثلاً منقیٰ، مصفیٰ وغیرہ۔ جب ان پر زیر آتا ہے تو ان کے معنیٰ کچھ ہوتے ہیں اور جب زبر آتا ہے تو کچھ اور، حکیم صاحب جب کسی دوا پر لکچر کے دوران ان الفاظ میں سے کسی لفظ کا استعمال کرتے تو نہ صرف یہ کہ اس کا تلفظ بہت صاف اور واضح انداز میں کرتے، بلکہ یہ بھی ضرور کہتے کہ اس کے تلفظ میں عموماً لوگ غلطی کرتے ہیں۔ صحیح تلفظ یہ نہیں، بلکہ یہ ہے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہونے کی وجہ سے مجھے حکیم صاحب کے اس انداز بیان میں بڑا مزا آتا تھا اور میں خوب محظوظ ہوتا تھا۔

ادویہ مفردہ کا مضمون ایک خشک اور بے مزہ مضمون ہے۔ نام، ماہیت، افعال اور مواقع استعمال، ہر دوا میں بار بار ایک طرح کے الفاظ آتے ہیں، لیکن حکیم صاحب اپنے لکچر میں اسے ایک دلچسپ مضمون بنا کر پیش کرتے تھے، بیچ بیچ میں واقعات سناتے، جس سے بوریت ختم ہوجاتی اور باتیں بھی ذہن نشین ہوجاتیں، دواؤں کے اوزان کے معاملے میں بسا اوقات جو غلطیاں ہوجاتی ہیں اور رتی کی جگہ ماشہ استعمال کرنے کے نتیجے میں فائدہ کے بجائے الٹا نقصان ہوجاتا ہے، اس کا تذکرہ بڑے مزے سے کرتے تھے۔ بعض دواؤں کا استعمال داخلاً یعنی براہِ دہن کیا جاتا ہے اور بعض دوائیں خارجاً استعمال کی جاتی ہیں، طریقہ استعمال بدل جانے سے نہ صرف یہ کہ کسی دوا سے مطلوبہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ الٹا نقصان ہوجاتا ہے اور بدن پر اس کے مضر اثرات ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً ایک دوا کے بارے میں بتایا کہ وہ مسوِّدِ شعر ہے، یعنی وہ بالوں کو سیاہ کرتی ہے اور اس کا استعمال خارجاً کیا جاتا ہے، ساتھ ہی یہ واقعہ سنایا کہ ایک حکیم صاحب نے سوچا کہ اگر اس دوا کا استعمال داخلی طور پر کیا جائے تو امکان ہے کہ بال اندر ہی سے سیاہ نکلیں، چنانچہ انہوں نے اس دوا کو خود اپنے اوپر آزمایا اس کے نتیجے میں ان کے بال تو اندر سے سیاہ نکلے، لیکن ساتھ ہی پورا چہرہ بھی سیاہ ہوگیا۔

حکیم محمد طیب مرحوم کی خدمات دیگر میدانوں میں بھی اہم ہیں، انہوں نے نصف صدی سے زائد عرصہ مریضوں کا علاج معالجہ کرتے گزارا ہے، تصنیف وتالیف اور ترجمہ کے میدان

میں بھی ان کی اہم یادگاریں ہیں۔ ان کی ایک نصابی کتاب حفظانِ صحت کے موضوع پر 'قانونِ صحت' کے نام سے ہے۔ اگرچہ ہمارے زمانے میں عموماً طلبہ اس سے استفادہ نہیں کرتے تھے۔ حنین بن اسحاق کی 'کتاب العشر مقالات فی العین' کا ان کا اردو ترجمہ معروف اور مستند ہے۔ ان کی ایک کتاب 'اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات' سریریات کے موضوع پر ایک اہم تصنیف ہے۔ ان تمام پہلوؤں کی روشنی میں حکیم صاحب کی خدمات کو نمایاں کرنے اور ان کی قدر و قیمت متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب بحیثیت ایک استاذ

پروفیسر حکیم عبدالودود
شعبۂ علم الادویہ، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

پروفیسر حکیم محمد طیب کے بارے میں کچھ لکھنا آفتاب کو چراغ دکھانے جیسا ہے، ایسی عظیم شخصیت جس پر مختلف زاویوں سے ہزارہا صفحات قلم بند ہو سکتے ہوں، اس کی حیات اور کارناموں کے کسی ایک گوشہ پر قلم اٹھانا اور ایک مربوط نظریہ قائم کرنا بہت مشکل ہے، ایسی شخصیتوں پر خامہ فرسائی کرنا بھی صحیح معنوں میں بڑی شخصیتوں کا کام ہے۔ پروفیسر حکیم محمد طیب جیسی عظیم شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ راقم نے اس مضمون میں ان کی زندگی کے ایک اہم پہلو یعنی طرزِ تدریس پر کچھ لکھنے کی جسارت کی ہے، یہ مضمون خالص تأثراتی ہے، جوان یادوں پر مبنی ہے جو میری طالب علمی کی زندگی کی ہیں، اسے کسی قسم کی تبصرہ نگاری پر محمول نہ کیا جائے کیونکہ خاکسار کوئی طبّی نقاد یا مبصر نہیں، بلکہ موصوف کا محض ایک ادنیٰ شاگرد ہے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب کی شخصیت کثیر الجہت تھی، اسے چاہے جس زاویہ سے دیکھا جائے بھرپور نظر آتی ہے۔ معلم، معالج، مصنف، محقق اور منتظم ہر اعتبار سے وہ عظمت کی حامل ہے، کبھی کبھی تو فرق کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں کون سی خصوصیت کس پر غالب ہے۔ عملی

زندگی میں لکچرر (۱۹۵۴ء) سے لے کر فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پہلے ڈین (۱۹۸۷ء) تک کا علمی اور طبی سفر نہایت کامیاب رہا۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ انتظامی امور میں بہت زیادہ مصروفیت کی وجہ سے درس وتدریس کا حق کماحقہٗ ادا نہیں ہو پاتا، لیکن آپ نے اجمل خاں طبیہ کالج کے انتظامی امور اور دیگر طبی اداروں سے علمی اور انتظامی وابستگی کے باوجود تدریس، طبابت اور دیگر ذمہ داریوں کے درمیان ہمیشہ توازن برقرار رکھا اور درس وتدریس اور علاج ومعالجہ سے کبھی رشتہ نہیں توڑا۔ ابتدائی عملی زندگی میں آپ کا تعلق زیادہ تر معالجات سے رہا، لیکن شعبۂ علم الادویہ سے وابستگی کے بعد اس مضمون میں آپ کی گہری دلچسپی رہی۔ آپ کی زیر نگرانی تکمیل پانے والے تمام تحقیقی مقالات علم الادویہ سے ہی متعلق ہیں۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ یونانی طب کے زیادہ تر طلبہ یونانی مضامین، خصوصاً علم الادویہ کو ایک خشک مضمون تصور کرتے ہیں اور کلاس کرنے سے کتراتے ہیں، اس کے برخلاف جدید طبی مضامین نہایت ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں اور ان کی ایک کلاس بھی چھوڑنا نقصانِ عظیم سمجھتے ہیں، لیکن استاذ محترم کی ادویہ کی کلاس کے ساتھ ایسا نہیں تھا، ان کا طریقۂ تدریس اتنا دلنشیں تھا کہ طلبہ ان کی کلاس میں نہایت دلچسپی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ وہ نہ صرف پوسٹ گریجوٹ طلبہ، بلکہ بی یو ایم ایس سالِ دوم کے طلبہ کو بھی مفردات کا درس دیا کرتے تھے۔ ایک سینئر استاذ کا ایک جونیر کلاس کو پڑھانا اس بات کی دلیل ہے کہ ابتدا ہی سے وہ طالب علموں کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کرنا چاہتے تھے، احقر ان خوش نصیب طلبہ میں ہے، جس کو آپ سے استفادہ کرنے کا دوبار موقع نصیب ہوا۔ راقم اور ہم جماعت تین طلبہ کو ایم. ڈی علم الادویہ کے دوران آپ کی شاگردی کا نہ صرف موقع ملا، بلکہ ان کے آخری شاگرد ہونے کا شرف بھی حاصل رہا۔ افسوس کہ انہیں دنوں ملازمت سے آپ کی سبک دوشی کا وقت آن پہنچا اور ہم لوگ مکمل طور سے فیض یاب نہ ہو سکے، لیکن جو بھی سیکھا، جتنا بھی سیکھا، آج بھی ان کے نقوش باقی ہیں۔ مجھے یاد نہیں کہ، میں اور میرے تین ہم جماعت نے قصداً ایک بھی کلاس چھوڑی ہو۔

بعض طبّی مسائل، جن میں ہم لوگوں کو اشتباہ رہتا بغیر کسی خوف وڈر کے نہ صرف پوچھ لیا کرتے بلکہ اعتراض کی جسارت بھی کر لیتے، آپ نے کبھی اس طرح کے علمی سوالات اور مباحثہ کو ناپسند نہیں کیا، بلکہ ہمیشہ حوصلہ افزائی کی۔ کبھی کبھی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ یہ فرماتے کہ میاں میرا منھ نہ کھلواؤ، جو سوالات تم مجھ سے کر رہے ہو، یہی سوالات کبھی میں اپنے اساتذہ سے کیا کرتا تھا۔ اور کبھی یہ کہتے کہ میاں زیادہ اڑان نہ بھرو، ابھی طب کی مبادیات سیکھو۔ بی یو ایم ایس اور ایم ڈی علم الادویہ دونوں ہی میں، میں نے ان سے مفردات پڑھا، لیکن دونوں کلاسوں میں ان کے طرزِ تدریس میں واضح فرق تھا۔ بی یو ایم ایس سالِ دوم میں خاص طور سے سائنس گروپ کے طلبہ پوری طرح طبّی مضامین سے واقف نہیں ہوتے، ایک ایسے مضمون کو پڑھنا ان کے لیے بہت دشوار گزار مرحلہ ہوتا ہے، لیکن استاذ محترم کے سمجھانے کا طریقہ اتنا اچھا تھا کہ پوری کلاس یہ محسوس کرتی کہ کوئی جدید طبّی مضمون پڑھایا جا رہا ہے۔ طیب صاحب کی تدریس کا ایک خاص منفرد انداز تھا، وہ یہ کہ تختۂ سیاہ پر دوا کے افعال پھر اس کے ذیل میں متعلقہ اور ممکنہ استعمالات لکھنا اور ان کو ایک مرکزی اور عمودی خط سے مربوط کرنا انتہائی دلچسپ ہوا کرتا تھا، ایسا محسوس ہوتا کہ مفردات نہیں، بلکہ اقلیدس کا درس دے رہے ہوں۔ مزید برآں ادویہ کے کیمیائی اجزا اور افعال کے مابین ربط پیدا کرنا ان کے درس کا ممتاز وصف تھا۔ ان کے طریقۂ تدریس کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی تھا کہ وہ استثنائی اصولوں کو اپنانے پر زور دیتے تھے، جیسے وہ اکثر فرمایا کرتے کہ مزاجِ ادویہ کو انفرادی طور سے یاد کرنے کے بجائے تیسرے اور چوتھے درجہ کی ادویہ، معتدل ادویہ اور مرکب القوی ادویہ جن کی تعداد کم ہے، علاحدہ فہرست تیار کر کے انہیں یاد کیا کرو، اس طرح جو دوائیں باقی بچیں گی ان میں اکثر پہلے اور دوسرے درجہ کے مزاج کی حامل ہوں گی۔ اسی طرح ادویہ کے دیگر متعلقات میں بھی یہی طریقہ تھا جس سے طلبہ کو کافی آسانی ہوتی تھی۔ آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو یونانی مضامین کو جدید انکشافات سے تطبیق دے کر پڑھنا پڑھانا معیوب اور طب کے لیے باعث نقصان سمجھتے ہیں۔ لیکن طیب صاحب کی نگاہیں بہت دور رس تھیں، اسی وجہ سے وہ اپنے طلبہ میں فنّی نزاکت کے ساتھ ساتھ جدید

انکشافات سے آشنائی کو مفید تصور کرتے تھے۔ احقر نے ان کے انداز درس وتدریس کو اپنانے کی تھوڑی سی کوشش کی ہے، جس کا نتیجہ بہت مثبت رہا۔ آج کل زیادہ تر طلبہ مفردات کے نوٹس کو رٹتے ہیں، ادویہ کی ماہیت، مزاج، افعال، استعمال و مقدار خوراک کی تفصیل رٹنے کی کوشش کرتے ہیں، جس میں کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے اور دورانِ امتحان رٹے رٹائے مضامین کو بھولنے کا خطرہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔ استاذِ محترم اس طریقہ کو منع کیا کرتے تھے، ان کا کہنا تھا جب تک کسی مضمون کے بنیادی اصولوں کو نہ سمجھا جائے اس سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا ہے، اس کو ایک مثال سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر کسی دوا کا فعلِ خاص مسہل ہے تو اس کا استعمال قبض میں ہوگا، جو یاد کیا جاسکتا ہے لیکن استاذ محترم اس بات کو اس طرح سمجھاتے کہ وہ امراض جن میں بذریعہ اسہال مادہ خارج کیا جاتا ہے، جیسے فالج، لقوہ، رعشہ اور وجع المفاصل وغیرہ میں بھی مسہل دوا سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، وعلیٰ ھذا القیاس۔ آج کل کے اساتذہ اگر اس طرز کو اختیار کریں تو طلبہ کو نہ صرف امتحان میں آسانی ہوگی، بلکہ یہ ساری چیزیں ان کی عملی زندگی میں بھی کام آئیں گی۔

معلم کو مختلف زبانوں پر عبور حاصل ہو تو اس سے درس میں مزید نکھار پیدا ہو جاتا ہے، رائج الوقت آفاقی زبان انگریزی پر عبور کا طبی برادری میں اکثر فقدان رہا ہے۔ اطبا پر یہ الزام ہے کہ ان کی انگریزی بہت کمزور ہوتی ہے، نہ وہ اچھی انگریزی لکھ سکتے ہیں اور نہ ہی بول سکتے ہیں، بعض لوگ تو اس کو یکسر غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کو فارسی زبان کے ساتھ ساتھ انگریزی پر بھی عبور حاصل تھا۔ جدید طبی مضامین پر دسترس میں آپ کی انگریزی دانی کا بہت حصہ رہا ہے، قدیم وجدید کے اس حسین امتزاج کی وجہ سے ایسا اندازِ تحریر، تقریر اور تدریس پیدا کیا جو کم لوگوں کے حصہ میں آیا ہے۔ ان کا یہ انداز ان کو اکثر اطبا سے ممتاز کرتا ہے، اسی وجہ سے اہم طبی مجالس میں ان کی شمولیت کو لازم سمجھا جاتا تھا۔

تعلیم وتدریس اور تصنیف وتالیف کو ایک دوسرے سے جدا نہیں سمجھنا چاہیے۔ اگر ایک اچھا معلم اچھا مصنف بھی ہو تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے، موصوف اس کا عمدہ

نمونہ تھے۔ گرچہ ان کی زیادہ تر کتابیں ترجمہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور ان کی فہرست بھی مختصر ہے، لیکن انہوں نے جن کتابوں کے تراجم کیے ہیں وہ جامع ہیں۔ ترجمہ نگاری ایک بہت ہی نازک فن ہے ذراسی لغزش یا کسی لفظ کا غلط یا غیر موزوں انتخاب مفہوم کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتا ہے، لیکن ان کے تراجم، فنی مہارت کے بیّن ثبوت ہیں، 'کتاب العشر مقالات فی العین' اس کی روشن مثال ہے۔

بیسویں صدی میں طب یونانی کی عمارت جن چند مضبوط ستونوں پر قائم تھی، پروفیسر حکیم محمد طیب اس عمارت کے مستحکم ستون تھے، وہ اپنے اہم اساتذہ کی مجسم تصویر تھے۔ جن لوگوں نے ان کے اساتذہ کو نہیں دیکھا ہے، انھوں نے آپ کی شکل میں انہیں جانا ہے، لیکن مستقبل کا طبیب آپ کی شخصیت کو آپ کے شاگردوں کے ذریعہ شاید نہیں پہچان سکے گا، کیونکہ طیب جیسا کوئی طبیب نہیں۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کے جن فرزندوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر نام پیدا کیا ہے، ان کی فہرست میں آپ کا نام سب سے اُوپر ہے۔

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ ایک شمعِ راہ پیدا کر

استاذ الاساتذہ پروفیسر حکیم محمد طیب مرحوم

حکیم خورشید احمد شفقت اعظمی

سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، لٹریری ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

کم و بیش نصف صدی تک آسمانِ طب پر پورے جمال و کمال کے ساتھ جگمگانے والا خورشید مبیں اپنی رہائش گاہ پر ۵؍ جون ۲۰۱۳ء کی شب میں اتنی خموشی سے غروب ہوگیا کہ خود اہلِ علی گڑھ کو بھی بروقت خبر نہ ہو سکی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ عمر کے آخری حصے میں ان کی زندگی "موتوا قبل ان تموتوا" کی تفسیر بن گئی تھی، خدمتِ خلق (مطب) سے جو وقت بچتا یادِ الٰہی میں صرف کرتے اور اس قدر رجوع الی اللہ ہو گئے تھے کہ کم و بیش دو عشرے سے مطب کے علاوہ تمام طبی، علمی و فنی سرگرمیوں سے مکمل طور سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔

جنوری ۱۹۷۵ء میں جب میں کونسل کی لٹریری ریسرچ یونٹ (علی گڑھ) سے بحیثیت ریسرچ اسسٹنٹ (یونانی) وابستہ ہوا تو حکیم محمد طیب کا نام یونیورسٹی میں گونج رہا تھا، طرح طرح کی روایتیں گشت کر رہی تھیں، جن کی طرف میں نے کوئی توجہ نہیں دی، بس اپنے کام سے کام رہا۔ اس وقت جناب شبیر احمد خاں غوری (مرحوم)، سینئر ریسرچ آفیسر کی سربراہی میں یونٹ کام کر رہی تھی، لیکن جلد ہی حکیم طیب صاحب اعزازی پروجیکٹ آفیسر بنا دیے گئے، اس وقت وہ پروفیسر اور اجمل خاں طبیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ ۱۹۵۴ء میں طبیہ کالج میں لکچرر کے عہدہ پر ان کا تقرر ہوا تھا، ۱۹۶۶ء میں ریڈر (معالجات) ۱۹۷۴ء میں

پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج کی پوسٹ پر تقرر ہوا، ۱۹۷۹ء میں شعبۂ علم الادویہ میں پروفیسر کا عہدہ آفر کیا گیا، جسے قدرے توقف سے قبول کرلیا، پروفیسر شپ قبول کرنے کے بعد بھی پرنسپل کے فرائض اعزازی طور پر انجام دیتے رہے، ۱۹۸۲ء میں شعبۂ علم الادویہ کے چیرمین مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں جب طب یونانی کی علیٰحدہ فیکلٹی قائم ہوئی تو وہ اس کے اولین ڈین مقرر ہوئے۔ حکیم طیب صاحب کا تعلیمی کیریر از ابتدا تا آخر نہایت شاندار رہا ہے، ہائی اسکول (مع فارسی اضافی مضمون) امتیازی نشانات کے ساتھ اپنے وطن مالوف بارہ بنکی سے ہی پاس کر کے اساتذہ، ارباب خاندان نیز بہی خواہوں کے دلوں پر سکہ جما دیا تھا۔ انٹرمیڈیٹ گورنمنٹ جوبلی کالج، لکھنؤ سے پاس کیا، طبی تعلیم کے دوران بھی یہ وصف برقرار رہا۔ چنانچہ طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ سے ۱۹۵۳ء میں بی، یو، ٹی، ایس ممتاز نمبروں سے پاس کیا، جس میں بالخصوص معالجات اور تشخیصِ عملی میں اعلیٰ پوزیشن حاصل کی اور پھر یہی مضمون ان کی زندگی بھر کا اوڑھنا بچھونا بن گیا۔ حصولِ علم کے لیے طیب صاحب نے تادیر سلسلہ جنبانی جاری رکھی، چنانچہ بی، اے اور ایم، اے (فارسی) اول درجہ میں پاس کیا۔ قابلِ ذکر ہے کہ ان دونوں امتحانات میں انہوں نے نہ صرف فرسٹ پوزیشن، بلکہ یونیورسٹی میڈل بھی حاصل کیا۔ یہ ان کی خوش طالعی تھی کہ پروفیسر نذیر احمد مرحوم جیسے نابغۂ روزگار اسکالر اور دانشور کی رہبری میں فارسی میں پی، ایچ، ڈی کرنے کا شرف حاصل ہوا، چنانچہ شاہانِ ہند بابر و ہمایوں کے درباری طبیب 'یوسف بن محمد یوسفی کی حیات اور علمی کارناموں' پر مقالہ لکھ کر ۷۰-۱۹۶۹ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اربابِ زبان وفن نے ان کی تحقیق کو بہت سراہا۔ ضرورت ہے کہ اسے شائع کر کے تشنگانِ علم وفن کے لیے عام کردیا جائے، تاکہ یہ علمی کام دستبردِ زمانہ سے محفوظ ہو جائے۔

طیب صاحب درس وتدریس اور مطب کی غیر معمولی مصروفیات کے باوصف مطالعہ وتالیف کے لیے وقت نکال لیا کرتے تھے، کیونکہ ان کے لکھنے پڑھنے کا ذوق پژمردہ نہیں ہوا تھا۔ ایک روایت کے مطابق ان کی سات کتابیں منصۂ شہود پر آئی ہیں، جن میں سے قانونِ صحت، حنین بن اسحاق کی العشر مقالات فی العین (اردو ترجمہ) اور اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات

کافی مقبول ہوئیں۔ مرحوم نے موخرالذکر کتاب کا ایک نسخہ ۱۰/اپریل ۱۹۷۵ء کو اپنے آٹوگراف کے ساتھ ازراہِ تلطف راقم الحروف کو بھی مرحمت فرمایا تھا۔ طیب صاحب کے زیرنگرانی چھ ریسرچ اسکالرس نے تحقیقی مقالات لکھ کر ایم، ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ مقالات کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے اہم ہیں۔

طیب صاحب نے ملک کے مختلف شہروں کے علاوہ بیرون ممالک منعقد ہونے والے قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کے لیے متعدد اسفار کیے، ان میں ڈھاکہ (بنگلہ دیش)، اٹلی، سنگاپور، بینکاک (تھائی لینڈ) اور بیجنگ (چین) بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ ان میں سے موخرالذکر مقام پر پہلی بار اس تحقیق کا انکشاف کیا کہ 'اسرول' میں حساسیت (الرجی) کے خلاف بھی افادی پہلو موجود ہے، جبکہ ہنوز اس کی شفابخشی محض جنون اور ضغط الدم قوی تک ہی محدود تصور کی جاتی تھی۔ ان کے پیش کیے جانے والے تحقیقی مقالات کی تعداد بھی کم وبیش ۴۰ تک پہنچتی ہے۔ ان کی ایڈیٹنگ کر کے اگر شائع کر دیا جائے تو اربابِ علم کے لیے سوغات ثابت ہوگی۔

فارسی اور اردو زبان پر عبور کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی انہیں دستگاہِ کامل حاصل تھی۔ اس زبان میں ان کے لکھے ہوئے مقالات سے ان کی عالمانہ شان اور فنی بصیرت کا پتہ چلتا ہے، وہ بہترین اسپیکر بھی تھے۔ علمی وفنی مذاکرات، صدارتی خطبات اور سائنٹیفک مقالات پیش کرتے ہوئے اپنی انگریزی دانی کا سکہ سامعین کے دلوں پر بٹھا دیتے تھے، پوری محفل پر وقار چھا جاتا تھا، اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ انگریزی زبان میں فنی رموز ونکات پر عین فطری اور فی البدیہہ انداز میں عالمانہ گفتگو کرنے والا ان کا کوئی ہمسر نہیں تھا، یونانی کونسل کے علاوہ نصابی کونسل CCIM، وزارتِ صحت نیز متعدد دانشگاہوں کی مختلف کمیٹیوں اور آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس سے بھی برابر وابستہ رہے اور اس استمرار کے نتیجے میں ہی بالآخر صدر کے منصب تک پہنچ گئے۔ یونانی کونسل ہو یا نصابی کونسل، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس ہو یا وزارتِ صحت، ہر جگہ ماہرین اور اربابِ فن ان کی اصابتِ رائے کے قائل ہو جاتے تھے۔ مرحوم حاضرین

محفل کے قلوب پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتے تھے، ان کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ریسرچ و تحقیق میں مبادیاتِ طب سے کبھی سمجھوتے نہیں کرتے تھے۔

حکیم طیب صاحب کو لٹریری ریسرچ یونٹ کا پروجیکٹ آفیسر اس لیے بنایا گیا تھا تا کہ ان سے زیادہ سے زیادہ علمی وفنی استفادہ کی راہیں ہموار ہوسکیں اور اربابِ کونسل کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں میسر آسکیں، حکیم عبدالرزاق مرحوم ان کی رائے اور مشورے کو بہ طیبِ خاطر قبول فرماتے تھے، آخر میں تو دونوں میں دوستی کی حد تک تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ حکیم شکیل احمد شمسی صاحب مرحوم کا، حکیم عبدالرزاق مرحوم سے تعلقات کا انداز اگر مربیانہ تھا تو طیب صاحب مرحوم کا دوستانہ، چنانچہ حکیم عبدالرزاق مرحوم کی رحلت پر جو مقالہ قلمبند کیا تھا، اس میں انہوں نے صحیح معنوں میں الفاظ کی ساحری کی ہے، وارداتِ قلبی کا طریقۂ اظہار دلوں کو چھو لینے والا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

> "Razzack had some very outstanding qualities and capabilities. Confident of his approach and some of his point of view very often he used to manage to get things done his way rather difficult bureaucrats. I saw him equally at ease in the presence of the President of India, Prime Minister or Union Ministers. He had a way of presenting his case and getting it through. Research in Unani Tibb on modern lines, had been a long cherished desire since the days of Hakim Ajmal Khan, but the dream was in fact transformed in to reality by Hakim Razzack."

مذکورہ بالا سطور میں حکیم عبدالرزاق مرحوم کی جرأت وبیبا کی، عظمت وخوداعتمادی کا اعتراف کھلے دل سے کیا ہے۔ اسی پر بس نہیں کیا، بلکہ آگے مزید حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "He was the man who organized an International

Seminar on Unani Medicine for the first time in the history of Indian system of Medicine . He had become Synonymous with Unani Tibb''.

حکیم عبدالرزاق مرحوم سے دوستی اچانک معجزاتی طور پر ظہور پذیر نہیں ہوئی تھی، بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ پہلے دونوں انانیت کے خول میں بند تھے، ایک ہی میٹنگ میں دونوں ایک دوسرے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے، بعض دفعہ تو دورانِ گفتگو اختلافات اس قدر بڑھتے تھے کہ ذاتیات تک کی نوبت آجاتی تھی۔

حکیم عبدالرزاق مرحوم بلا کے زیرک اور مردم شناس تھے، انہوں نے اختلافات کی خلیج پاٹنے میں ہی عافیت سمجھی، رفتہ رفتہ دوستی اتنی بڑھ گئی کہ ان کی دوستی کی مثال دی جانے لگی۔ نتیجہً کارکونسل نے ان کی صلاحیتوں سے بہت فائدہ اٹھایا۔

اپنے دوست حکیم محمد عبدالرزاق کی مرضی کیفیات اور خورونوش میں افراط وتفریط پر بھی ان کی نظر رہتی تھی۔ مرحوم کے آخری سفر کا منظرنامہ کتنے دردوکرب کے ساتھ پیش کیا ہے:

"The same Razzack who had climbed the China wall, had walked through the shopping centres of Beijing for hours.... This was his last journey. A vacuume left behind, friends devoid of his company and family to mourn his irreversible absence."

(ماخوذ از 'مجاہد طب حکیم محمد عبدالرزاق' مرتبہ ام الفضل وحکیم سید غلام مہدی)

دونوں کے تعلق خاطر کا پتہ اس سے بھی چلتا ہے کہ حکیم طیب مرحوم نے اپنے مقالہ کا عنوان ہی رکھا ہے:

'A friend recalls'

''اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات'' اردو زبان میں اپنی نوع کی اولیں کوشش ہے، جو ان کی دیگر تالیفات پر سبقت لے گئی ہے۔ اقتباساتِ ذیل، طیب صاحب کی گہری فنی بصیرت

اور وسیع مطالعہ کی غمازی کرتے ہیں:

''یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ فنِ طب پر بے شمار کتابیں لکھی گئیں اور ہر مرض کے تفصیلی بیان کے ساتھ سیکڑوں نسخے درج کیے گئے، مگر محض ان کے مطالعہ سے کوئی طبیب نہیں ہوسکتا۔ کسی مرض کی علامات اور نشانیاں جس طرح معالجات کی درسی کتاب میں درج ہوتی ہیں، اکثر و بیشتر ہو بہو عملی زندگی میں نہیں ملتی ہیں۔ ایسی صورت میں تشخیص و معالجہ طبیب کی وسعتِ نظر، ذہانت اور تجربہ پر منحصر ہوتی ہے..... یونانی و اسلامی طب کی تاریخ میں جس قدر بھی کلینکی مشاہدات دستیاب ہیں، وہ میرے خیال میں ٹھیٹ معالجاتی درسی اسباق پر بھاری بیٹھتے ہیں..... محدود ذرائع کے باوجود اطبائے قدیم نے جو گرانقدر اضافات علمِ طب میں کیے اور جو کچھ ایک فنکار کی حیثیت سے مشاہدات کیے، ان سے واقفیت اور ان کو اُجاگر کرنا ہمارا قومی فریضہ ہے۔ یہی فراشیات جس کا سہرا طبِ مغرب اپنے سر باندھے لیتی ہے، دراصل اطباءِ قدیم کی مرہونِ منت ہے''۔

مذکورہ اقتباس آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے، جس سے طیب صاحب کی سائنٹیفک اپروچ اور فنی شعور ہویدا ہے۔ پھر اس کتاب میں مریضوں کے حالات و کوائف کی روشنی میں بین القوسین کسی کلینکی روداد کے تناظر میں جو تبصرے طیب صاحب کے طبّاع ذہن نے پیش کیے ہیں، وہ ان کا کارنامہ اور اہم Contribution ہے، جس سے فن پر ان کی گرفت اور وسعتِ مطالعہ کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، چند مثالیں درج ذیل ہیں:

''ایک آدمی سواری کے جانور سے گر پڑا اور اس کی پشت زمین سے ٹکرا گئی، پھر تیسرے دن اس کی آواز میں ضعف واقع ہوگیا اور چوتھے دن اس کے دونوں پیر مسترخی ہوگئے، مگر اس کے دونوں ہاتھوں میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی، نہ تنفس باطل ہوا اور نہ اس میں کوئی دشواری لاحق ہوئی اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا، کیونکہ گردن سے نیچے کے نخاع میں ورم ہوگیا تھا، اسی لیے پسلیوں کے مابین عضلہ مسترخی ہوگیا تھا۔ لہٰذا تنفس تو جاری رہا، مگر آواز متاثر ہوگئی، کیونکہ تنفس حجاب حاجز اور چھ فوقانی عضلات سے متعلق ہوتا ہے اور بہر حال سانس جو آواز کا سبب ہوتی ہے، باطل ہوگئی، کیونکہ اس کا تعلق اس عضلہ سے ہوتا ہے جو پسلیوں کے مابین ہوتا ہے۔ پس اطباء نے اپنی جہالت سے اس

کے پیروں پر دوائیں لگانے کا ارادہ کیا تو میں نے ان کو روک دیا اور میں نے اس جگہ لگانے کا قصد کیا جہاں چوٹ پہنچی تھی، پھر جب ساتویں دن نخاع کا ورم ساکن ہو گیا تو اس کی آواز عود کر آئی اور اس کے دونوں پیر سیدھے ہو گئے۔

میرا (رازی کا) خیال یہ ہے کہ اس کے ہاتھوں میں تکلیف اس لیے نہیں ہوئی، کیونکہ ان کے اعصاب گردن کے نخاع سے آتے ہیں"۔

اب طبیب صاحب کی سائنٹیفک تنقیح ملاحظہ فرمایئے:

"مندرجہ بالا بیان سے یہ پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ چوٹ ظہری حرام مغز کو پہنچی ہے اور عضلات بین الاضلاع کی عصبی پرورش متاثر ہونے کے سبب تنفس بہتر طور پر ہونا مشکل ہو گیا اور نتیجتاً آواز میں ضعف لاحق ہو گیا، جیسا کہ خود وضاحت کی گئی ہے کہ آواز کا مادہ تنفس ہے۔ مزید برآں رازی کا یہ کہنا کہ اس کے ہاتھوں میں اس لیے آفت نہ پہنچی کیونکہ عنقی حرام مغز محفوظ تھا اور ہاتھوں میں عصبی پرورش گردن سے ہوتی ہے، اس کی تشریحی معلومات اور سوجھ بوجھ پر دال ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ رازی نے اس مرضی کیفیت کی کتنی صحیح توجیہ کی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مریض خود رازی کے مشاہدہ میں آیا ہو اور یہ پورا واقعہ خود اس کی معالجاتی صلاحیتوں کا ایک نمونہ ہو، اس لیے کہ حاوی کے اسکوریال نسخہ میں 'قال جالینوس' مفقود ہے"۔

طبیب صاحب آگے رقم طراز ہیں:

"ایک دوسرا آدمی سواری سے گر پڑا تو اس کے ہاتھ کی چھنگلیا اور اس کے پاس کی انگلی اور نصف بیچ والی انگلی کی حس جاتی رہی، جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ گردن کے آخری مہرہ کے بل گرا تھا تو میں سمجھ گیا کہ ساتویں مہرہ کے بعد جو عصب ہے اس کے مخرج پر ورم ہو گیا ہے، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ گردن سے نکلنے والے اعصاب میں سے آخری عصب کے اجزا میں نچلا جز دونوں انگلیوں یعنی خنصر اور بنصر کی طرف جاتا ہے اور جو جلد ان کو محیط ہے، اس میں اور بیچ والی انگلی کی جلد کے نصف حصہ میں متفرق ہو جاتا ہے"۔

حکیم محمد طیب مرحوم کا ذہنِ رسا یہاں بھی طبی سائنٹیفک نکات اپنے مخصوص انداز میں معلوم کر کے ان کی وضاحت کرتا ہے:

''اس مرض میں رازی کے بیان کے مطابق یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں ہے کہ شخص مذکور کا عصبِ زندی اسفل (Ulner nerve) متاثر ہو گیا تھا اور اس اعتبار سے انگلیاں متاثر ہو گئی تھیں۔ رازی نے اس کی اہمیت بتانے میں تشریحی معلومات کا جو ثبوت دیا ہے وہ قابلِ صد ستائش ہے''۔

پروفیسر حکیم محمد طیب، شفاء الملک حکیم عبداللطیف کے مایۂ ناز تلامذہ میں تھے، جن سے انہوں نے بھرپور اکتسابِ فیض کیا تھا۔ ان کے مزاج میں قدرے سختی ضرور تھی، جسے غالباً ڈسپلن برقرار رکھنے کے لیے قدرت نے انہیں ودیعت فرمادیا تھا۔ وہ کم آمیز ضرور تھے لیکن مردم بیزاری کی حد تک نہیں، کیونکہ وہ ضروری باتیں سننے کا عزم بھی رکھتے تھے، البتہ فاضل باتیں کرنے کے عادی نہ تھے۔ دوست احباب کی محفلوں میں انہیں قہقہے لگاتے بھی دیکھا گیا ہے، وہ حسب ضرورت گفتگو میں مزاح بھی شامل کرلیا کرتے تھے، جس سے سامعین محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے، ان کی بذلہ سنجی تحریر و تقریر میں صاف محسوس کی جاسکتی تھی، وہ یقیناً خوش مزاج بھی تھے۔

کونسل کے ایک قومی سیمینار منعقدہ مدراس (۲۰ر ستمبر، ۱۹۸۲ء) میں جب حکیم مہدی بانو، اسسٹنٹ ریسرچ آفیسر (یونانی)، لٹریری ریسرچ یونٹ حیدرآباد کا مقالہ "Scabies in Unani Medicine" اختتام کو پہنچا، جو اُس سیشن کا آخری پیپر تھا، طیب صاحب نے برجستہ فرمایا کہ کھجلی اچھی ہو یا نہ ہو لیکن ریسرچرس اپنے دماغ میں ریسرچ و تحقیق کی کھجلی لے کر ضرور جارہے ہیں۔ ملحوظ رہے کہ طیب صاحب ہی اُس سائنٹیفک سیشن کی صدارت فرمارہے تھے۔

میرے مفوضہ کام ''امراضِ قلب'' کی وہ باقاعدہ اسکریننگ فرماتے رہتے تھے اور مناسب ہدایات بھی دیتے رہتے تھے۔ بعض دفعہ بہت دلچسپ Comments کے ساتھ فائل واپس آیا کرتی تھی۔ میں نے ایک جگہ لکھا تھا کہ ''رنج و غم سے اجتناب کریں''۔ مرحوم کا تبصرہ تھا کہ ''گویا کہ یہ بھی کوئی اختیاری فعل ہے''۔ باہر سے ماہرین کے جو Comments آتے تھے بعض دفعہ حق بجانب ہوا کرتے تھے، لیکن بیشتر اعتراض برائے اعتراض، کبھی کبھی لفظی گرفت بھی ہوتی تھی، مثلاً 'Cardiac Neurosis' کے لیے قلبی عصبانیت کا انتخاب راقم الحروف نے کیا تھا، چونکہ میرا موقف مضبوط تھا، لیکن فریق ثانی کو بھی مطمئن کرنا تھا،

لٰہذا پروفیسر حکیم محمد عبدالوہاب ظہوری مرحوم نے درمیانی راہ نکالتے ہوئے عُصاب قلبی کو فائنل کردیا، جو جدید عربی میں مروج ہے۔ بعینہٖ 'Hypertrophy' کے لیے جامعہ عثمانیہ کی اصطلاح بیش تضخم سے بھی مرحوم غیر مطمئن تھے، ان کا موقف یہ تھا کہ تضخم میں بجائے خود بیش شامل ہے، لٰہذا یہ اصطلاح تسلیم کرلی گئی۔ اسی طرح ''فشار الدم'' پر یہ اعتراض تھا کہ فشار چونکہ فارسی لفظ ہے، لٰہذا عربی ترکیب غلط ہے، اس کے لیے 'زیر کسرہ کے ساتھ لکھا جاسکتا ہے، میرا موقف یہ تھا کہ دونوں طرح لکھنے میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ متاخرین نے عربی ترکیب کے ساتھ بھی لکھا ہے اور زبان زد بھی ہے، لٰہذا اسے برتنے میں کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیے۔ طیب صاحب نے اس ریمارک کے ساتھ فائل واپس فرمادی کہ ''بہر حال کام کو آگے بڑھائیے''۔

ایک دفعہ پرنسپل آفس میں کونسل کے اہم حضرات موجود تھے، میں بھی حاضر تھا وہاں، فرمانے لگے کہ میں کان کا کچا نہیں ہوں، جب بھی کسی کے خلاف کوئی بات مجھ تک پہنچتی ہے، تاوقتیکہ میں ذاتی طور پر توثیق نہ کرلوں، کوئی ایکشن نہیں لیتا، لیکن توثیق کے بعد جب فیصلہ لے لیتا ہوں تو چپراسی سے لے کر پروفیسر تک کے ساتھ میرا سلوک یکساں ہوتا ہے، ان میں کوئی امتیاز نہیں برتتا ہوں، دوسرے لفظوں میں مداہنت اور چاپلوسی کی شروع میں ہی بیخ کنی کردیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حاشیہ برداروں کی تعداد وہ بھی علی گڑھ کی سرزمین پر صفر کے برابر تھی۔ یہ وہ مخلوق ہے جس نے بڑی سے بڑی شخصیتوں کے قصر وایواں کو ہلا کر رکھ دیا، انہیں کتنے باصلاحیت مخلصین سے ہمیشہ کے لیے محروم کردیا، بعض دفعہ تو انہیں یکہ وتنہا کر کے دم لیا۔

اوائل ستمبر ۱۹۷۹ء میں ریسرچ آفیسر (یونانی) کے انٹرویو کے لیے صبح کی نشست میں حاضر ہوا تو میری کتاب 'امراض النساء' موضوع بحث بن گئی اور اس پر طیب صاحب نے ایک بڑی پر مزاح بات کہی، جس سے محفل زعفران زار ہوگئی، رمضان کا مہینہ تھا، دوپہر بعد والی نشست میں جب ARO (U) کے انٹرویو کے لیے حاضر ہوا تو فرمانے لگے، لیجیے پھر آگئے، میں سکتے میں آگیا تھا، مجھے کیا معلوم کہ میرا انتخاب .R.O کے لیے ہوچکا ہے۔

حکیم طیب صاحب کے لہجے میں تیزی ضرور تھی، تاہم محبت آفریں حلاوت بھی صاف

محسوس کی جاسکتی تھی، انہوں نے اصاغر سے دوران گفتگو ہمیشہ عزتِ نفس کا خیال رکھا اور اسے مجروح نہیں ہونے دیا۔ میرے خیال میں اعلیٰ قدریں ناپنے کا بہترین پیمانہ یہ بھی ہے۔ طیب صاحب اگر ابتدا میں نہایت ذہین، ہوشمند اور سمجھ دار طالب علم تھے تو تکمیلِ تعلیم کے بعد بہترین اتالیق ثابت ہوئے، ان کی شخصیت میں معلم کا عنصر ہمیشہ نمایاں رہا۔ کونسل کی ہائی پروفائل میٹنگ ہو یا لٹریری ریسرچ کی، ہر جگہ ان کا رنگ معلمانہ ہوتا تھا اور انداز انتہائی پُر وقار۔ ان کا مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ بہت وسیع اور متنوع تھا، انہوں نے حکیم عبدالرزاق مرحوم کے ساتھ کثرت سے اسفار کیے، اس دوران ہر سطح پر ہر طرح کے ذہنوں سے گوناگوں مسائل پر گفت وشنید کے مواقع آئے ہوں گے، ان کو افہام وتفہیم سے حل کرنے میں کیسی کیسی اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا پڑا ہوگا، اس کا اندازہ ان لوگوں کو زیادہ ہوگا جو ان سے قریب رہے ہوں گے۔ وہ علم وفن کے ارتقا کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے، تحقیق وتدریس ان کا مزاج تھا، نیز خدمت خلق کی خاطر وہ مطب میں تاحیات مصروف رہے۔ یہ ان کے لیے بہترین توشۂ آخرت بھی تھا۔ اللہ رب العزت ان کے سیئات کو حسنات سے تبدیل فرما کر جنتِ نعیم مرحمت فرمائے۔ یہ شعر ان کے فلسفۂ حیات کا بھرپور ترجمان ہے۔

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب - یادیں اور تأثرات

پروفیسر حکیم سید مودود اشرف
سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اے ایم یو، علی گڑھ

دار العلوم سے فراغت کے بعد اجمل خاں طبیہ کالج میں داخلہ (۶۵-۱۹۶۴ء) لیا تو ممتاز اساتذہ کی فہرست میں نمایاں نام حکیم محمد طیب صاحب کا پایا۔ ان کی شہرت نامور معالج، بہترین استاذ، بارعب مدرس کی حیثیت سے تھی۔ اطباء میں انگریزی بولنے اور لکھنے میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا، اہم عہدوں پر فائز ہوئے اور چھائے رہے۔ فارسی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی تھے۔ جدید و قدیم طبی کتابوں پر ان کی نظر تھی۔ ہمارے بیچ کو ان سے صرف سریریات وہ بھی انڈور میں پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مضمون کو ذہن نشیں کر دینے کا انداز آج بھی دماغ میں تازہ ہے۔ رعب و دبدبہ کا یہ عالم تھا کہ انڈور میں ان کے قدم رکھتے ہی سناٹا چھا جاتا، کیا طلبہ اور کیا پیرا میڈیکل اسٹاف، سب گھبرائے ہوئے نظر آتے، یہ گھبراہٹ ان کے وارڈ سے رخصت ہونے کے بعد ہی رفع ہوتی۔ طبی علاج و معالجہ میں ان کی مہارت مسلم تھی، اپنے کامیاب علاج پر خوش بھی ہوتے اور مسکراتے ہوئے کچھ اس طرح کی بات کرتے، دیکھئے میں نے اتنا اچھا علاج کیا اور اس کا کوئی ذکر نہیں، اشارہ میرے شفیق استاذ حکیم افہام اللہ صاحب کی طرف ہوتا۔ علاج و معالجہ میں ان کا ایک بڑا مقام اور نام تھا۔ حکیم طیب صاحب جو نسخہ تحریر کرتے اُنہیں اس کا اچھی طرح علم ہوتا کہ وہ کیا اور کیوں لکھ رہے ہیں، ایک بار کا واقعہ ہے،

اس وقت میں ہاؤس جاب کر رہا تھا، انڈور میں ان کے ایک مریض کو شدید قبض کی شکایت ہوئی راؤنڈ کے لیے انڈور تشریف لائے تو ان سے بتایا گیا، انہوں نے اس کے لیے کوئی ایک مفرد دواء تجویز کی جو عام روش سے ہٹی ہوئی تھی۔ اس پر اسسٹنٹ حکیم جناب محسن جلیل شمسی (جوان کے ہم سبق بھی تھے) نے دھیرے سے کہا بس ایک دوا، حکیم صاحب ان کی طرف مڑے اور کہا ''اچھا'' پھر آگے بڑھ گئے۔ ہم لوگ اس دوا کا اثر دیکھنے کے منتظر تھے، دوسری صبح سیدھے مریض کے بستر کی طرف گیا، پوچھا تو اس نے بتایا کہ اس دوا کے لینے کے بعد دو تین نرم اجابت ہوئی۔ اس سے میں نے ایک عجیب سی فرحت محسوس کی، دل حکیم صاحب کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا۔ مفردات پر ان کی گرفت اچھی تھی، نسخہ مفرد و مرکب دونوں دواؤں پر مشتمل، مختصر مگر جامع ہوتا تحریر خوبصورت و پاکیزہ تھی۔

تندیٔ مزاج کا یہ حال تھا کہ اچھے اچھے مریض ان کا تیور ہی دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوتے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ لطف اس وقت آتا جب ان سے کوئی ان کا ہم مزاج اکھڑ قسم کا مریض ٹکراتا، بات بگڑ جاتی تو مطب کا رنگ ہی دوسرا ہوتا، ان سب کے باوجود مریض تھے کہ ٹوٹے پڑتے تھے۔

مزاج کے اکھڑپن کی بات چلی ہے تو حکیم صاحب کا ایک دلچسپ واقعہ سناتا چلوں، یہ ''شنیدہ'' نہیں بلکہ ''دیدہ'' ہے۔ زمانۂ طالب علمی میں چند ساتھیوں کے ساتھ مچھلی کے شکار کے لیے ''قلعہ'' (علی گڑھ) کی طرف گئے، وہاں دیکھا تو ہم سے پہلے، ہمارے بعض اساتذۂ کرام بنسی لیے موجود ہیں، ان میں حکیم طیب صاحب بھی تھے۔ شکار کھیل چکنے کے بعد واپسی ہوئی تو حکیم صاحب اپنی صبار فتار ''وکی'' پر سوار ہوئے اور چل دیئے، ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے، دیکھا کتوں کا ایک مختصر سا جھنڈ بر سر راہ بیٹھا ہوا جیسے تیز رو سواری پر سوار کسی مسافر کی آمد کا منتظر ہو، جونہی حکیم صاحب کی ''وکی'' ان کے زد پر آئی انہوں نے گھیر لیا۔ اب حکیم صاحب چاہیں کہ ان کو اپنی ''وکی'' کے پہیے تلے روند ڈالیں، ان کا کچومر نکال کر دم لیں، لیکن وہ کہاں ماننے والے۔ جب حکیم صاحب نے سپر ڈال دی اور وکی سے اتر کر کھڑے ہو گئے تب جا کے جان چھوڑی،

جب تک ہم لوگ بھی قریب پہنچ گئے تھے۔ کتوں سے نجات ملتے ہی وہ ہوا ہو گئے۔

حکیم صاحب احباب کی محفل میں ہوتے تو رنگ دوسرا ہوتا، خوب کھل کر باتیں کرتے، چھینٹا کشی اس زمانہ کی ایک عام روایت تھی، جس کو علی گڑھ کی زبان میں ''کھینچائی'' کہتے ہیں۔ نہ یہ احباب کو بخشتے نہ احباب ان کو۔ ہم جیسے نو وارد اساتذہ دور ہی سے تماشا دیکھتے۔ کبھی کبھی شریکِ محفل ہوتے تو شرکت گفتگو میں نہیں، ہنسی میں ہوتی، وہ بھی دبی دبی۔ اسی طرح کی ایک محفل تھی، قدیم پرنسپل آفس کے سامنے اپنے سینئر اساتذہ کے ساتھ ہم لوگ بھی کھڑے تھے، تفریحی باتیں ہو رہی تھیں کہ حکیم قیام الدین صاحب (سابق پرنسپل اجمل خاں طبیہ کالج) تشریف لے آئے۔ ابھی وہ سنبھل بھی نہیں پائے تھے کہ حکیم طیب صاحب نے دھولیا۔ محفل میں ان سے ان کے رخسار کی ''سرخی'' کا راز پوچھ لیا۔ جواب آنے سے پہلے اس سوال پر قہقہہ لگا، حکیم قیام الدین صاحب نے برجستہ جواب دیا ''یہ سرخی'' ازدواجی تعلقات خوش گوار ہوں تو آتی ہے، (الفاظ کم وبیش) بعد کا قہقہہ پہلے سے بھی زوردار تھا، وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں حکیم صاحب کے ازدواجی رشتے ناخوشگوار چل رہے تھے، مگر انہوں نے اس جواب کا ذرا بھی برا نہ مانا، یہ ان کی عالی ظرفی تھی۔

مزاج کی سختی کا بعض ماہر کلرک بڑا اچھا حل ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ حکیم صاحب پرنسپل تھے اور ان کے آفس میں صولت صاحب نامی ہیڈ کلرک تھے۔ ان کا محبوب مشغلہ، حکیم صاحب کے حکم کے بموجب ماتحتوں سے سختی سے تحریری جواب طلب کرنا اور ماتحتوں کی طرف سے حکیم صاحب کو معقول قانونی جواب دینا تھا۔ حکیم صاحب جب خود اُن پر برہم ہوتے تو یہ بڑے قاعدے سے ان کو رام کرتے۔ ایک دن یہ سب کچھ بچشم خود دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہوا یہ کہ ایک دن صولت صاحب حکیم صاحب کے لیے ٹیبل لیمپ خرید کر لائے، وہ ان کو پسند نہیں آیا۔ صولت صاحب سے انہوں نے فوری واپسی کا مطالبہ کیا۔ گرمی کا موسم تھا، شدید گرمی کا دن تھا' صولت صاحب دوبارہ بازار جانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑی خوبصورتی سے جواب دیا حکیم صاحب! اس سے اچھا ٹیبل لیمپ دوکاندار کے پاس نہیں تھا۔ آپ کہہ رہے ہیں تو میں

جارہا ہوں، لیکن اب اگر اس سے خراب لے آیا تو پھر کچھ نہ کہیۓ گا۔ حکیم صاحب خاموش ہوگئے پھر دوبارہ ان سے جانے کے لیے نہیں کہا۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ تو بولے آپ ہی بتائے اس شدید گرمی میں بازار جانا کوئی آسان کام ہے؟۔

بدظنی بھی عجیب چیز ہے، بیٹھے بیٹھے دو آدمیوں کے مابین غیر محسوس طور پر خواہ مخواہ رشتہ خراب کردیتی ہے، جب میں ایم ڈی کررہا تھا اور میرے سپروائزر حکیم سید ظل الرحمٰن صاحب تھے۔ میرے ایک حیدرآبادی دوست سنگ سماق کا ایک خوبصورت کھرل فروخت کرنے کے لیے لائے۔ دواخانہ یا کالج سے اس سلسلہ میں رابطہ کیا۔ ماہرانہ رائے کے لیے وہ استاذ محترم حکیم طیب صاحب تک پہنچا، وہ ان کی نظر میں کھب گیا، قیمت طے ہوگئی، حکیم صاحب نے اس کھرل کو بقول حکیم رفیق الدین صاحب کے یہ کہہ کر سونپا کہ "اس کو دوسروں کی نظروں سے اس طرح بچا کر رکھیۓ، جس طرح ایک عورت حیض سے آلودہ کپڑے کو چھپاتی ہے"۔ اسے اتفاق ہی کہیۓ کہ میری نظر اس پر پڑگئی اور میں اس کو لینے کے لیے بیتاب ہوگیا، لیکن اب کیا ہوسکتا تھا؟ سودا تو مکمل ہوچکا تھا، پر کالج یا دواخانہ کی طرف سے پیسوں کی ادائیگی میں کاغذی کارروائی کی وجہ سے تاخیر ہوتی چلی جارہی تھی۔ میں اپنے حیدرآبادی دوست سے ملا، ان کو پیسوں کی فوری اور سخت ضرورت تھی۔ میں نے قیمت بڑھادی اور نقد ادائیگی کی بات کی، بالآخر وہ راضی ہوگئے۔ جب یہ بات طیب صاحب کو معلوم ہوئی تو انہوں نے بلاتأمل سارا الزام حکیم سید ظل الرحمٰن کے سر تھوپ دیا۔ حکیم صاحب کا خیال تھا کہ اس کھرل کے حصول کے لیے حکیم سید ظل الرحمٰن نے مجھ کو آلۂ کار بنایا، یعنی بطور مہرہ استعمال کیا۔ حالانکہ سچی بات یہ تھی کہ اس سودے کی خبر حکیم سید ظل الرحمٰن کے فرشتوں کو بھی نہیں تھی، لیکن آخر تک وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ حکیم سید ظل الرحمٰن کی چال تھی۔

حکیم صاحب کی ایمانداری کے، دوست، دشمن سبھی قائل تھے۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ہم لوگ کسی پروگرام میں شرکت کے لیے سی سی آر یو ایم، دہلی گئے ہوئے تھے۔ شرکاء میں حکیم طیب صاحب بھی تھے۔ آمدورفت کے کرایہ کے لیے جب فارم بھرا جانے لگا تو فارم ان کو

بھی دیا گیا۔ انہوں نے فارم بھرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں تو فلاں کے ساتھ ان کی گاڑی سے آیا اور جاؤں گا بھی اسی سے۔ ان کو رقم مل گئی تو میرا حق ہی نہیں بنتا۔

ان کی ذاتی زندگی بہت سادہ تھی، سب کچھ ہوتے ہوئے بھی رہائش معمولی تھی، خاصا بڑا گھر تھا، لیکن زینت و آرائش سے عاری۔ خرچ کے معاملے میں بھی بہت محتاط تھے، حتیٰ کہ اپنی ذات پر واجب خرچ میں بھی ان کو تامل ہوتا۔ حج سے واپس آئے تو ملاقات کے لیے گھر حاضر ہوا۔ دوران گفتگو فرمانے لگے سعودی عرب میں ''لونگ'' بہت مہنگی مل رہی تھی، میں نے ''پان'' میں لونگ کھانا وہاں چھوڑ دیا۔ گھر میں اکیلے ہی رہتے تھے۔ انتقال کے وقت کوئی بھی پاس نہ تھا، عسر تنفس کے مریض تھے۔ دورہ پڑا، گہری چوٹ آئی، خون بہا، ''اِن ہلر'' ہاتھ میں تھا اور جان جان آفریں کو سونپ دی۔ 'اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن' ۔

ایک واقعہ جوان کے قریبی عزیز نے سنایا وہ بھی قابل ذکر ہے۔ ہوا یہ کہ ''دوہرّہ'' علی گڑھ میں ایک محلّہ ہے، وہاں کے لوگوں نے مسجد کی ضرورت محسوس کی، چندہ کے لیے حکیم صاحب کے پاس گئے، حکیم صاحب نے دس ہزار کا چک کاٹ کر دے دیا مگر دوسرے ہی دن کسی کو بھیج کر چک واپس منگوا لیا۔ لوگوں میں چہ می گوئیاں ہونے لگیں کہ عجب آدمی ہیں، چک دیا بھی اور واپس بھی لے لیا، لیکن حکیم صاحب نے دوبارہ ان لوگوں کو اس زمین کے مالک کے ساتھ بلوایا، جس سے یہ لوگ خریدنا چاہتے تھے۔ اس کی پوری قیمت اپنی جیبِ خاص سے مرحمت فرمائی اور اپنے پیسوں سے ایک خوبصورت چھوٹی سی مسجد تعمیر کروائی اور اس کا نام اپنی والدہ ماجدہ کے نام پر ''مسجد زبیدہ'' رکھا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

حکیم صاحب بذات خود اچھے نسخوں کے مرتب تھے۔ دوا کے ذرا سے پھیر بدل سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا ان کو ہنر آتا تھا، یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کو مفردات پر عبور ہو۔ نسخوں کی ترتیب کا ان کا اپنا خاص ذوق تھا۔ مجوزہ دوائیں دواخانہ سے تیار کراتے، مریضوں پر برتتے، افادیت ثابت ہو جاتی تو دواخانہ کو عوض لیے بغیر (میری معلومات کی حد تک) سونپ دیتے۔ ایسی تقریباً دس دوائیں ہیں، جو دواخانہ طبیہ کالج تیار کرتا اور بیچتا ہے۔ ان کے

نام اس طرح ہیں۔ ۱- قلبین، ۲- حب صرع خاص، ۳- ستاوری، ۴- عصبی، ۵- سفوف مکھانا، ۶- اسروفین یا سرفین؟ یہ سب دوائیں رجسٹرڈ ہیں، جو غیر رجسٹرڈ ہیں وہ یہ ہیں، معجون مقوی خاص، اناسین، ضماد خراطین شنگرفی۔

ان کے اختراعی نسخوں کا سلسلہ آخر عمر تک جاری رہا۔ دیسی دواخانہ آباد مارکیٹ (علی گڑھ) کے مالک کو بہت سارے نسخے عطا کیے۔ اس دواخانہ کو اپنے پیروں پر کھڑا کیا اور بامِ عروج تک پہنچایا۔ غرض ان کی مرتب کردہ مجرب وصحت بخش دوائیں آج بھی ان دواخانوں کی زینت بنی ہوئی ہیں اور مریضوں کے کام آرہی ہیں۔ گویا حکیم صاحب اصلاً اور خالصتاً معالجات کے آدمی تھے۔ اصل ذوق ان کا علاج ہی تھا، آخر عمر تک اپنے مطب سے جڑے رہے اور مریضوں کو فیض پہنچاتے رہے۔

حکیم صاحب کی ایک بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی نگاہ میں جو طالب علم جچ جاتا خواہ اس کی آمد ورفت ان کے پاس رہی ہو یا نہ رہی ہو، بعد از فراغت کالج میں کوئی جگہ خالی ہوتی تو اس کو بلاتے اور اس جگہ کے لیے درخواست طلب کرتے۔ یہ بات میں نے اپنے سینئر ساتھیوں سے سنی تھی۔ ایک بار مجھے بھی طلب کیا (حالانکہ اس وقت تک میں کبھی نہ ان کے گھر گیا تھا نہ آفس) تشریح میں اس وقت کوئی جگہ خالی تھی، اس کے لیے انہوں نے مجھ سے درخواست مانگی تو میں نے اس سبجکٹ سے عدم دلچسپی کا اظہار کیا۔ عذر قبول ہوا اور میں چلا آیا۔

ایک بار طبیہ کالج لائبریری میں بیٹھا 'ترجمۂ کبیر' دیکھ رہا تھا حکیم صاحب کا اس طرف گزر ہوا، وہ میری طرف مڑے، پوچھا 'مولانا کیا پڑھ رہے ہو؟' میں نے عرض کیا 'سر! آپ لوگوں سے جو بچا، اس کو پڑھنے کوشش کررہا ہوں'۔ یہ میرا کچھ اُٹ پٹا سا جواب تھا۔ حکیم صاحب نے بڑے مایوسانہ لہجہ میں جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ تھا 'اس فن پر میری محنت بیکار گئی' یہ سن کر میں سناٹے میں آگیا اور ادب سے عرض کیا 'دعا فرمائیں کہ مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر نہ پہنچوں' (یہ آخری دور کی بات ہے) خاموشی سے میری بات سنی اور چلے گئے۔ اسی طرح طب کی ایک نامور شخصیت نے دوران گفتگو فرمایا کہ 'دوسروں کے سامنے باتیں جتنی عالمانہ آپ چاہیں کرلیں

لیکن جوں ہی ان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ طبیب ہیں آپ کی وقعت ان کی نگاہ میں کم ہو جاتی ہے (حاصل گفتگو) بڑوں کے ان اقوال کے پس منظر میں جانے کی کوشش کی تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ ان کے خیال میں جتنی محنت ان اکابرین نے اس فن پر کی، اگر اتنی ہی محنت وہ کسی دوسرے فن مثلاً اردو، انگریزی یا کسی اور فن پر کرتے تو شاید ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے، بڑا نام ہوتا، وقار میں اضافہ ہوتا، لیکن اپنے گھر میں وہ مرتبہ نہ مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ یا یہ فن اپنا وہ مرتبہ کھو چکا جس کے لئے یہ کبھی جانا جاتا تھا۔ اپنا خیال تو یہی ہے باقی اللہ جانے۔

تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں

حکیم محمد طیب صاحب سے ہمارے مراسم

طبیبہ ام الفضل

سابق ڈپٹی ڈائرکٹر سی سی آر یو ایم، نئی دہلی

اکتوبر ۱۹۵۶ء میں میری شادی حکیم عبدالرزاق صاحب سے حیدرآباد میں ہوئی، اس وقت وہ ہمدرد، دہلی میں بحثیت طبیب ملازم تھے، ۱۹۵۴ء میں آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ، نئی دہلی سے کامل طب و جراحت کی تکمیل کے بعد وہ ہمدرد سے وابستہ تھے۔ میں ۱۹۵۵ء میں نظامیہ طبی کالج، حیدرآباد سے طبیب مستند کی سند حاصل کر چکی تھی، جس کا نصاب چار سال پر مشتمل تھا، اس وقت طبیب مستند کرنے کے بعد بہت سے طلبہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں ایک سال تعلیم حاصل کر کے پانچ سالہ BUMS کی ڈگری پالیتے، میں نے حکیم عبدالرزاق صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی ایک سال طبیہ کالج علی گڑھ میں پڑھنا چاہتی ہوں، انہوں نے بخوشی اجازت عطا کر دی، مزید کہا کہ تم اپنی دوست رقیہ خاتون کو بھی تیار کر لو، وہ بھی تمہارے ساتھ علی گڑھ میں پڑھ لے، ان کے ایما پر میں نے رقیہ کو خط لکھا، اس وقت وہ ورنگل میں تھی، میرے ساتھ وہ بھی علی گڑھ آنے کے لیے آمادہ ہوگئی، جب ہم علی گڑھ آئے تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد کی مزید تین لڑکیاں زہرہ سلطانہ، زاہدہ بیگم اور واحدہ بیگم یہاں داخلہ لے چکی ہیں، یہ تینوں ہم سے ایک سال جونیر تھیں، اس طرح ۱۹۵۷-۵۸ء میں حیدرآباد کی پانچ لڑکیاں طبیہ کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھیں، ہم سب

کی رہائش 'عبداللہ ہال' کے سلطانہ ہوسٹل میں تھی، اس وقت کرنل بشیر حسین زیدی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ جب ہم علی گڑھ پہنچے تو جولائی کا آخری ہفتہ تھا، یہاں بے حد شدید گرمی پڑ رہی تھی، ہم حیدر آباد میں ایسی گرمی کے عادی نہیں تھے، وہاں جولائی میں بارش کی وجہ سے موسم بہت سہانا ہو جاتا ہے۔

حکیم عبدالرزاق مجھ سے ملنے جب بھی علی گڑھ آتے، حکیم محمد کبیر الدین صاحب کے مکان پر ان کا قیام رہتا، اس وقت حکیم محمد کبیر الدین صاحب طبیہ کالج میں استاذ تھے۔

طبیہ کالج میں داخلہ کے بعد حکیم محمد طیب صاحب سے میری پہلی ملاقات حکیم عبداللطیف فلسفی (پرنسپل) کے آفس میں ہوئی، اس وقت میرے ساتھ حیدر آباد کی چاروں طالبات بھی تھیں، طیب صاحب نے ہمیں دیکھ کر کہا کہ یہ کتنی چھوٹی لڑکیاں ہیں، لگتا ہے ابھی میٹرک پاس کیا ہو، یہ حکیم محمد طیب صاحب سے ہمارا پہلا تعارف تھا۔ جب داخلہ کے بعد درس و تدریس کا باضابطہ سلسلہ شروع ہوا تو انہیں ہم نے استاذ کی شکل میں پایا، جو ہمیں معالجات پڑھایا کرتے تھے، ان کا طریقۂ درس اتنا عمدہ تھا کہ شروع سے آخر تک تمام طلبہ کی دلچسپی قائم رہتی، یہ ان کے کلاس لکچر کی بڑی خوبی تھی، اس کے علاوہ وہ بڑے رعب اور دبدبہ والے انسان تھے، یہ ان کی شخصیت کا بڑا نمایاں پہلو تھا، ان کی بارعب شخصیت بہت سے لوگوں کو سخت گیر معلوم ہوتی تھی، ان کے بارے میں یہ بات بہت مشہور بھی تھی، لیکن مجھے ذاتی طور پر ان کا یہ مزاج کبھی محسوس نہیں ہوا، بلکہ مجھے یاد ہے کہ جب میں علی گڑھ سے تعلیم پوری کر کے واپس آئی تو برسوں بعد انہوں نے مجھے خط لکھا، جس کا مضمون تو اب یاد نہیں لیکن ایک بات اب بھی یاد ہے انہوں نے لکھا تھا کہ "تمہارے شوہر تو ہمارے داماد ہوتے ہیں"۔ ان کے یہ الفاظ مجھ سے اور میرے شوہر سے ان کے اس تعلقِ خاطر کے مظہر ہیں، جو انہیں ہم سے ہمیشہ رہا۔

حکیم عبدالرزاق صاحب جب سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے ڈائرکٹر منتخب ہوئے تو انہوں نے حکیم طیب صاحب کو کونسل کی گورننگ باڈی، سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی اور کلینکل ریسرچ سب کمیٹی کا ممبر مقرر کیا، حکیم طیب صاحب نے ان ذمہ داریوں کو

بحسن وخوبی انجام دیا۔ کونسل کے کلینکی ریسرچ پروگراموں کے لیے ایسے امراض جن میں یونانی طریقۂ علاج خاص طور پر موثر ہے، ان بیماریوں پر تحقیق کے لیے موزوں ادویہ کے انتخاب کے سلسلہ میں جن ماہرین سے رجوع کیا گیا ان میں حکیم محمد طیب صاحب، شکیل احمد شمسی اور حکیم محمد شبلی کا نام بے حد قابلِ ذکر ہے، خصوصاً حکیم محمد طیب صاحب کے تجویز کیے ہوئے کئی نسخوں پر کونسل نے ریسرچ پروجیکٹ شروع کیا، اس طرح کونسل ایک عرصہ تک ان کی فنی رہنمائی سے مستفید ہوئی ہے۔

علاج ومعالجہ میں مہارت اور درس وتدریس میں درک رکھنے کے ساتھ وہ ایک اچھے منتظم بھی تھے، کئی موقعوں پر ان کی اس صلاحیت کا اظہار ہوا ہے، فروری ۱۹۸۵ء میں کونسل نے ایک سیمینار علی گڑھ میں منعقد کیا تھا، اس کا سارا انتظام حکیم موصوف نے ہی کیا تھا، اس سیمینار کی افتتاحی تقریب یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ہوئی، اس کی رسم افتتاح کے لیے محترمہ محسنہ قدوائی مرکزی وزیر صحت مدعو تھیں، جس خوش اسلوبی سے یہ سیمینار ہوا، وہ صرف حکیم صاحب کے حسنِ انتظام کا نتیجہ تھا۔

طیب صاحب ہر موقع پر حکیم عبدالرزاق کے شانہ بہ شانہ رہے اور ہمیشہ کونسل کے کاموں میں اپنا گرانقدر تعاون پیش کیا، علی گڑھ میں کونسل کے ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کے سلسلہ میں ان کی مساعی بے حد اہم ہیں، انسٹی ٹیوٹ قائم ہوا تو وہ اس کے پروجیکٹ آفیسر بھی مقرر ہوئے اور ایک عرصہ تک اسے اپنی سرپرستی سے نوازتے رہے۔ ان کی سرپرستی اور نگرانی میں یہاں کئی تحقیقی کام انجام پائے، ان کے زیر انصرام یہاں برص اور ذیابیطس پر جو کام ہوا ہے، وہ نہایت بیش قدر ہے، یونانی طب میں آطریلال کا ذکر برص کے تعلق سے بڑی اہمیت کے ساتھ ہوا ہے۔ اس دوا کا تجربہ کر کے وہ اس کے اثرات کا مطالعہ ومشاہدہ کرنا چاہتے تھے، مگر یہ دوا ہندوستان میں دستیاب نہیں تھی، اس لیے کہ یہ مصر کی پیداوار ہے، حکیم طیب صاحب نے علی گڑھ قلعہ پر یونیورسٹی سے ایک قطعۂ آراضی حاصل کر کے اس کی کاشت کا اہتمام کیا، برص میں اس دوا کا تجربہ بہت کامیاب رہا، اس واقعہ سے حکیم طیب صاحب کے تحقیقی شعور اور

تحقیقی مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔

فروری ۱۹۸۷ء میں سنٹرل کونسل نے دہلی میں عالمی سیمینار کا انعقاد کیا، اس میں تقریباً پچیس ممالک کے پانچ سو سے زائد مندوبین شریک ہوئے تھے، سیمینار کے پہلے روز حکیم طیب صاحب نے Unani Medicine Rationale and Relevance کے عنوان سے گیسٹ لکچر پیش کیا تھا، جو بڑا جامع اور معلوماتی تھا۔ حکیم صاحب بہت ذہین تھے اور طب میں انہیں کمال کا درجہ حاصل تھا، ان خوبیوں کی وجہ سے وہ ہر فنی مسئلہ پر پُرمغز بحث کی صلاحیت رکھتے تھے، عالمی سیمینار میں انہوں نے جو خطبہ عطا کیا تھا، اس سے ان کی اعلیٰ ذہنی صلاحیت اور فنی مہارت کا اظہار ہوتا ہے۔

حکیم عبدالرزاق کے ساتھ طیب صاحب کا تعلق بے حد مخلصانہ تھا، کئی موقعوں پر ان کے اس اخلاص کا مشاہدہ ہوا، اکتوبر ۱۹۹۱ء میں حکیم عبدالرزاق چین جارہے تھے، وہاں انہیں ایک سیمینار میں مقالہ پڑھنا تھا، میں ان کے اس سفر کو لے کر بے حد فکرمند تھی، اس لیے کہ وہ دل کے مریض تھے اور اس وقت ان کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی، ایسی حالت میں اتنی دُور اُن کے تنہا جانے سے میں کافی پریشان تھی جب مجھے معلوم ہوا کہ حکیم طیب صاحب اس سفر میں ان کے ساتھ ہوں گے تو مجھے اطمینان ہوا۔ چین جانے کے لیے طیب صاحب علی گڑھ سے میرے گھر آگئے پھر دونوں ایرپورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔ میں نے طیب صاحب سے التجا کی کہ وہ عبدالرزاق کی صحت کا خیال رکھیں گے، انہوں نے اسی طرح حقِ رفاقت ادا کیا، جس طرح مجھے امید تھی، حکیم عبدالرزاق کو طیب صاحب کی معیت میں دے کر میں مطمئن ہوگئی تھی، چین سے واپسی پر حکیم طیب صاحب نے کہا کہ بھئی تمہارے میاں نے مجھے بہت پریشان کیا، وہ چائنا وال دیکھنے کے لیے چڑھائی پر چلے گئے، ادھر میں پریشان ہوتا رہا، بہت دیر بعد وہ مسکراتے ہوئے واپس آئے، تم سے کیے ہوئے وعدہ کی وجہ سے ان کی واپسی تک میں فکرمند رہا۔ طیب صاحب کے اس بے پایاں خلوص کے لیے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا، اس وقت مجھے احساس ہو کہ وہ مزاجاً سخت ضرور ہیں، مگر ان کے اندر ایک نیک اور نرم دل دوست بھی ہے، میرا ان سے ہمیشہ

استاذ اور شاگرد کا رشتہ رہا اور حکیم عبدالرزاق سے ان کے دوستانہ مراسم رہے، انہوں نے ہر موقع پر ان رشتوں کو نبھایا ہے۔ ۱۰ر اپریل ۱۹۹۲ کو حکیم عبدالرزاق کے انتقال کی خبر سن کر وہ اپنے کئی احباب کے ساتھ علی گڑھ سے دہلی تشریف لائے اور اس تعلق کو نبھایا، جو انہیں میرے شوہر اور مجھ سے تاحیات رہا ہے۔

حکیم عبدالرزاق سے طیب صاحب کے تعلقات کونسل کے معاملات اور دفتری امور سے بڑھ کر ذاتی سطح پر بھی استوار تھے، اس کا اندازہ ان خطوط سے بھی ہوتا ہے جو انہوں نے مختلف مواقع پر عبدالرزاق کو لکھے ہیں۔ ان میں دفتری باتوں کے علاوہ بہت سے نجی معاملات کا بھی تذکرہ ہے، ان مکتوبات کی اہمیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ان کا اسلوب تحریر بہت دلچسپ ہے، ان سے طیب صاحب کے ادبی مزاج کا اظہار ہوتا ہے اور ان کے ذریعہ مکتوب نگار کی شخصیت کے کئی اہم گوشے سامنے آتے ہیں۔

ان سے ذاتی نوعیت کا تعلق استوار ہونے کے بعد بہت سے اہم خانگی امور بھی زیر بحث آنے لگے تھے، چونکہ اب ان سے ہمارے مراسم ذاتی سطح پر قائم تھے، اس لیے یہ حکیم عبدالرزاق کی وفات کے بعد بھی جاری رہے۔ ابھی چند برس پہلے جب میری لڑکی کو کینسر ہوگیا تھا تو میں بے حد پریشان تھی، اس موقع پر طیب صاحب نے بڑی ڈھارس بندھائی اور مجھے تسلی دی کہ تم فوراً اس کے آپریشن کا بندوبست کرو، انشاء اللہ نتائج بہتر ہوں گے، میں نے کئی عورتوں کو دیکھا ہے کہ وہ آپریشن کے بعد صحت مند زندگی گزار رہی ہیں۔

ادھر کچھ دنوں سے مجھے پیروں پر سوجن کی شکایت ہے، ڈاکٹروں نے بتایا کہ دل کے انقباضی نظام میں خلل کی وجہ سے دورانِ خون کم ہوگیا ہے اور وہ وریدوں سے رِس کر سوجن کا باعث ہوجاتا ہے، اس سلسلہ میں میں نے طیب صاحب سے مشورہ کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ ایسے مریضوں کو خمیرہ ابریشم حکیم ارشد والا، خمیرہ مروارید اور دواء المسک معتدل جواہر والی ملا کر استعمال کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ ساتھ میں شربت بزوری معتدل کا استعمال بغرض ادرار کرتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی یہ دوائیں استعمال کرنے کا مشورہ دیا، میں نے ان کی

ہدایت کے مطابق یہ دوائیں کھانا شروع کر دیا تھا، انہیں استعمال کرتے ہوئے پندرہ روز ہو چکے تھے، میں اس سلسلہ میں ان سے مزید مشورہ کرنا چاہتی تھی کہ اسی دوران حکیم رئیس الرحمٰن (ایڈوائزر یونانی وزارتِ صحت، حکومت ہند) کا فون آیا، انہوں نے اطلاع دی کہ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب اب اس دنیا میں رہے، ابھی حکیم مظہر سبحان عثمانی کی وفات کا غم تازہ ہی تھا کہ حکیم طیب جیسا فن کا ایک نقیب اور چل بسا، یہ اموات ہر صاحبِ فن کے لیے صدمہ کا باعث ہیں، لیکن حکیم طیب صاحب کی رحلت میرے لیے ایک ذاتی صدمہ بھی ہے، ناسازیٔ صحت کے باوجود میں نے ان کی آخری رسم میں علی گڑھ جا کر شرکت کا فیصلہ کیا، میرا بیٹا سہیل جو اس وقت گھر پر موجود تھا، اس نے کہا ممی! اگر آپ علی گڑھ جانا چاہتی ہیں تو میں آپ کو لے کر چلوں گا، چونکہ تدفین کا صحیح وقت مجھے معلوم نہیں تھا، لہٰذا میں نے حکیم سید ظل الرحمان سے اس کی تفصیل معلوم کی اور علی گڑھ کے لیے نکل پڑی، جب وہاں پہنچی تو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور تیز بارش ہو رہی تھی، حکیم طیب صاحب کے جسد خاکی کو دیکھ کر میری آنکھیں بھی برس پڑیں، میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے حکیم صاحب کی بیٹی شاذیہ اور تینوں نواسیوں سے تعزیت کی اور طیب صاحب کی بھتیجی سے ان کے انتقال کی تفصیل معلوم کی، رات کے تقریباً دس بجے ہم لوٹ کر دہلی آئے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کرے اور ان کے پسماندگان کو صبر عطا فرمائے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب ۔ یادوں کے حصار میں

پروفیسر حکیم سعد عثمانی
سابق پرنسپل، اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج، الہ آباد

حکیم محمد طیب صاحب کا نام اکثر میں اپنے والد مرحوم حکیم حماد عثمانی اور حکیم ظہیر الدین مرحوم سے سنتا تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب میں یونانی طب کا طالب علم تھا، حکیم طیب صاحب کی سخت گیری اور لیاقت کے تذکرے عام تھے، اس وقت تک مجھے شرف نیاز حاصل نہیں تھا۔ والد مرحوم کے مطب میں حاضر ہونے والے عملی ٹریننگ کے طلبہ کو بھی بارہا کہتے ہوئے سنا تھا کہ حکیم طیب صاحب علی گڑھ سے اگر عملی ممتحن ہو کر آئے تو ہم سب کا فیل ہونا یقینی ہے۔ والد صاحب ان کو سمجھاتے، کیسے فیل ہو جاؤ گے؟ جاؤ تیاری کرو اور خوب پڑھو۔ طیب صاحب ایسے نہیں ہیں۔

پہلی بار حکیم محمد طیب صاحب سے میری ملاقات ۱۹۷۲ء میں دہلی ایرپورٹ پر ہوئی تھی، اس وقت میں بی ایس سی کا طالب علم تھا۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا سالانہ اجلاس سری نگر کشمیر میں منعقد ہونا تھا۔ اس سلسلہ میں والد مرحوم جو طبی کانفرنس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے، نے بھی شرکت کا ارادہ کیا، مجھے اور میرے چھوٹے بھائی شمویل عثمانی کو بھی والد صاحب کے پروگرام کی اطلاع مل گئی۔ ہم دونوں بھائیوں نے والد صاحب سے درخواست کی کہ ہم لوگ بھی آپ کے ساتھ چلیں گے، اسی بہانے کشمیر گھوم لیں گے۔ والد صاحب راضی ہو گئے،

ہم الہٰ آباد سے بذریعہ ریل دہلی پہنچے، یہاں سے بذریعۂ جہاز سری نگر جانا طے تھا۔ پروگرام کے مطابق ہم تینوں دہلی ایرپورٹ پہنچے۔ یہاں حکماء کا ایک جم غفیر تھا، جس میں سے صرف ایک حکیم صاحب کو میں پہچانتا تھا۔ ان سے بھی ملاقات نہ تھی، لیکن والد صاحب کے فوٹو البم میں ان کی تصویر ضرور دیکھی تھی، تھوڑی دیر بعد ہم لوگ جہاز پر سوار ہو گئے، ہمارے ساتھ حکماء اور اطباء کی ایک جماعت تھی، جس میں حکیم عبدالحمید، حکیم محمد طیب، حکیم عبدالرزاق، حکیم عبدالاحد، حکیم محمد احمد لاری، حکیم جمیل احمد وغیرہ جیسے ماہرینِ فن شامل تھے۔

ہم لوگ بیٹھے ہی تھے کہ حکیم عبدالرزاق صاحب، جن کی حکیم طیب صاحب سے بہت بے تکلفی تھی، آئے اور کہنے لگے۔

''طیب جو دعائیں یاد ہوں سب پڑھ لو اور اپنے گناہوں سے توبہ کرلو، اگر یہ طیارہ Crash کر گیا تو ہندوستان سے یونانی طب کا خاتمہ ہو جائے گا''۔

یہ جملہ حکیم عبدالرزاق صاحب بار بار طیب صاحب کو مخاطب کر کے کہہ رہے تھے اور ان کو چھیڑ رہے تھے، مگر حکیم طیب صاحب کوئی جواب نہیں دے رہے تھے۔

بات یہ تھی کہ ان دنوں کئی طیارے حادثے کا شکار ہو چکے تھے، ایسے ہی ایک حادثہ میں الہٰ آباد یونیورسٹی کے ایک نامی گرامی پروفیسر اور دیگر کئی سائنسداں ہلاک ہوئے تھے۔ اس وجہ سے لوگ ہوائی جہاز سے سفر کرتے وقت گھبرائے رہتے تھے، یہی اثر حکیم صاحبان پر بھی تھا، جو اس جہاز کے مسافر تھے۔

حکیم عبدالرزاق صاحب جب مذاق کر رہے تھے، تبھی اچانک ایک Air Hostess نے اعلان کیا:

"Calling Prof. Abdul Razzaq from Delhi" اس اعلان کی طرف عبدالرزاق صاحب کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے، جب کچھ لوگوں نے انہیں توجہ دلائی تو وہ بولے "Yes, Airhostess what is the problem" ایرہوسٹس نے کہا "Please may I see your ticket" ایرہوسٹس کا اتنا کہنا تھا کہ جہاز میں بیٹھے ہوئے سارے مسافر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے اور حکیم طیب صاحب کو موقع مل گیا وہ بولے:

''تم ریل گاڑی کی طرح اس میں بھی بغیر ٹکٹ چڑھ گئے ہو کیا؟''۔

ایک بار پھر قہقہوں کا ماحول بن گیا اور طیب صاحب پورے سفر عبدالرزاق صاحب کو چھیڑتے رہے اور سری نگر تک کا سفر ہنسی خوشی طے ہو گیا۔ مجھے یاد ہے کہ والد صاحب اور ہم دونوں بھائیوں کے قیام کا انتظام سری نگر کے لال چوک کے Juniper Hotel میں کیا گیا تھا۔ یہ ہوٹل حکیم شمبھوناتھ پاریمو کا تھا، اس کی نچلی منزل پر حکیم پاریمو صاحب کا ''الکوثر دواخانہ'' تھا، جہاں وہ طبابت کرتے تھے۔

اس کے بعد حکیم محمد طیب صاحب کو متعدد طبّی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں بھی دیکھا، نہایت متحرک نظر آئے، وہ زیادہ تر شیروانی میں ملبوس ہوتے اور آنکھوں پر گہرے نیلے رنگ کا دھوپ کا چشمہ لگائے رہتے تھے۔ اب تک میری ان سے گفتگو کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور نہ وہ مجھے جانتے، پہچانتے تھے۔

۱۹۸۲ء/۱۹۸۳ء میں وہ ڈائرکٹریٹ آف آیوروید اور یونانی سروسز یوپی لکھنؤ کے Adhoc Selection کی انتخابی کمیٹی میں بہ حیثیت اکسپرٹ تشریف لائے وہ بھی لکچرر معالجات کے مضمون میں۔ راقم بھی اس پوسٹ کا امیدوار تھا۔ انٹرویو ہوا۔ حکیم صاحب موصوف دھوپ کا چشمہ لگائے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے سوالات عام اطباء کے طرزِ سوال سے مختلف ہوتے۔ پہلے وہ ایک لمبی تمہید باندھتے اور پھر ایک چھوٹا سا سوال مجھ سے کرتے۔ انہوں نے مجھ سے صداع، قلتِ نوم اور نسیان پر زیادہ سوالات کیے تھے اور ایلوپیتھی کے نظریات اور Regimenal Therapy کے بارے میں دریافت کیا تھا، اس سے اندازہ ہوا کہ قدیم یونانی طریقۂ علاج کے ساتھ جدید طب پر بھی اُن کی گہری نظر تھی۔ معالجات کے علاوہ دوسرے مضامین، جن کے انٹرویو ہوئے تھے، ان سبھی کے نتیجے چھ دنوں بعد آؤٹ کردیے گئے۔ معالجات کے نتیجے کا اعلان ڈائرکٹریٹ نے نہیں کیا تھا۔ میں فکر مند تھا، بعض ذرائع سے میں نے حکیم طیب صاحب سے معلوم کیا، سراغ لگا کہ انتخاب میرا ہی ہوا ہے۔ اس وقت کے ڈائرکٹر ست پال گپتا سے ملاقات کی اور نتیجہ کے نہ اعلان کئے جانے کی وجہ جاننی چاہی، مگر کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ حالانکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ خانوادۂ عثمانی نے یونانی میڈیکل کالج الٰہ آباد کو

حکومت یو پی کی تحویل میں لینے کی مخالفت کی تھی۔ والد مرحوم حکیم حماد عثمانی صاحب نے اس سلسلہ میں بڑی جدّ و جہد کی تھی، مگر کہتے ہیں جب ظالم کی نیت خراب ہو جاتی ہے تو کوئی دلیل اور حجت کام نہیں آتی۔ یونانی میڈیکل کالج الہٰ آباد، خانوادۂ عثمانی کے خونِ جگر سے سینچا ہوا ایک تناور درخت تھا، جسے صوبہ یو پی کی اسمبلی میں پاس ایک ایکٹ کے ذریعہ حکومتی تحویل میں لے لیا گیا تھا۔

کیا اس لیے تقدیر نے چنوائے تھے تنکے
بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے

خاندان کے ذریعہ کالج کو تحویل میں لیے جانے کی مخالفت کا خمیازہ راقم کو بھگتنا پڑا۔ اس واقعہ کے تقریباً پندرہ سال بعد یو پی پبلک سروس کمیشن، الہٰ آباد کی انتخابی کمیٹی نے میرا اسلیکشن کیا، جس کے Technical Expert پروفیسر محمد طیب تھے، ان کے علاوہ حکیم جمیل احمد صاحب پرنسپل ہمدرد طبی کالج، نئی دہلی بھی اکسپرٹ تھے۔ اس بار بھی مخالفین نے کوئی کسر نہ چھوڑی، مگر خدا کی مرضی کے آگے کسی کی نہ چل سکی۔ اس بار بھی طیب صاحب کے سوالات اوروں سے مختلف تھے جو زیادہ تر Life Style Diseases سے متعلق تھے۔ حابسِ دم ادویات کے نام دریافت کرنے پر میں بتاتا گیا، وہ خوش ہو کر کہتے گئے 'اور'، 'اور' اور تب ہی رُکے، جب میں نے تخم خرفہ سیاہ کا نام لیا۔

۱۳؍فروری ۱۹۸۷ء تا ۱۵؍فروری ۱۹۸۷ء یونانی طب پر پہلا بین الاقوامی سیمینار دہلی میں منعقد ہوا تھا۔ راقم بھی والد صاحب کے ساتھ اس میں شریک ہوا۔ اس سیمینار کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی، کیونکہ اس میں بیرونِ ممالک کے بہت سے مندوبین شریک ہوئے تھے۔ چین سے بھی ایک عرصہ بعد تین مندوبین نے شرکت کی تھی، جس کی وجہ سے وزارتِ صحت نے حکیم عبدالرزاق صاحب کی کافی پذیرائی کی تھی۔ اس سیمینار میں طیب صاحب بہت پیش پیش تھے اور ان کا کلیدی خطبہ، جو انگریزی زبان میں تھا، اسے سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ نہایت جامع، پُر مغز اور معلوماتی تھا۔ اس میں انہوں نے جو Quotation پڑھے تھے وہ بہت ہی اہم اور موقع

کی مناسبت سے تھے۔

راقم نے طیب صاحب کا غصّہ اور تیور بھی دیکھا ہے، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کا سالانہ اجلاس، جو جنوری ۱۹۸۶ء میں بُرہانپور، ایم پی میں ہوا تھا، اس میں جناب موتی لال ووہرا، وزیر اعلیٰ مہمانِ خصوصی تھے، پروفیسر طیب صاحب کسی بات پر خفا ہو گئے تھے اور اُکھڑے اُکھڑے پھر رہے تھے، اسے حکیم عبدالحمید صاحب صدر طبّی کانفرنس نے محسوس کیا۔ انہوں نے حکیم طیب صاحب کو بلا کر ان کو منایا اور ان کے غصے کو ٹھنڈا کر دیا۔ کچھ بات تو حکیم طیب میں رہی ہوگی کہ حکیم عبدالحمید صاحب نے حکیم صاحب موصوف کی مزاج پُرسی کی۔

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کے خطوط:

میرے والد سے طیب صاحب کے دیرینہ تعلقات تھے، اکثر ان کے درمیان خط و کتابت ہوا کرتی تھی۔ ایک بار کی بات ہے والد صاحب کو رات میں نیند کے دوران کچھ تکلیف ہوئی، جو علامتیں ظاہر ہوئیں وہ امراضِ قلب کی طرف اشارہ کر رہی تھیں، اُسی درمیان حکیم طیب صاحب کا خط آیا۔ جواب میں والد صاحب نے اپنی تکلیف کا ذکر کیا۔ حکیم طیب صاحب کا جوابی خط آیا، جس میں انہوں نے تشویش ظاہر کرتے ہوئے اس بات کا شک ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے کہ Reflux Oesophagitis ہو، جانچ کے بعد ان کی تشخیص صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح جب والد صاحب سی سی آر یو ایم کی Scientific Advisory Committee کے ممبر منتخب ہوئے تو حکیم صاحب نے والد صاحب کو تہنیت کا خط بھیجا اور اس میں تحریر کیا کہ یہ ممبر شپ آپ کو کئی سال قبل ہی تفویض ہونی چاہیے تھی۔

والد صاحب کے پاس طیب صاحب کے خط برابر آیا کرتے تھے، کبھی ہائی کورٹ میں مقدمہ کے سلسلہ میں، کبھی پبلک سروس کمیشن الہ آباد کی انتخابی کمیٹی میں شرکت کے لیے آمد کے موقع پر، طیب صاحب ہر خط میں راقم کے لیے دعائیں ضرور لکھتے۔ طیب صاحب کے زیادہ تر خطوط والد صاحب کی فائلوں میں محفوظ ہیں۔ یہ مضمون چونکہ عجلت میں تحریر کیا جا رہا ہے، اس لیے اُن کو یہاں نقل کرنا ممکن نہیں ہے۔ آئندہ کسی موقع پر یہ خطوط شائع کیے جائیں گے۔

والد مرحوم کے انتقال کے بعد حکیم صاحب نے مجھے ایک تعزیتی خط لکھا تھا، اس سے والد صاحب سے ان کی محبت اور تعلق کا اندازہ ہوتا ہے، وہ خط اس موقع پر پیش خدمت ہے۔

پروفیسر محمد طیب

بی یوٹی ایس (پی ایچ ڈی)

الشفا-۲/۷ یونائیٹڈ کالونی

امیر نشاں روڈ، علی گڑھ، یوپی

عزیزی سعد عثمانی

السلام علیکم

بہت صدمہ ہوا یہ خبر سن کر کہ حماد صاحب نہیں رہے۔ ایک ایک کر کے سب اٹھتے جا رہے ہیں۔ وضعدار، دیندار دوست حماد بھی بچھڑ گئے۔

اللہ تعالیٰ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کی طاقت۔

۳۱ر دسمبر ۲۰۰۰ء

خیر اندیش

'طیب'

والد صاحب کے انتقال (۳۰ر دسمبر ۲۰۰۰ء) کے بعد راقم جب بھی بہ سلسلۂ کانفرنس، سیمینار یا بہ حیثیت ممتحن علی گڑھ جاتا، کوشش ہوتی کہ شام کو حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا جائے۔ پہلی بار جب حکیم طیب صاحب کے دولت کدہ پر حاضری کا ارادہ ہوا تو میں نے کئی اساتذہ سے رہنمائی کی درخواست کی، اس لیے کہ مجھے حکیم صاحب کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ مگر زیادہ تر لوگوں نے جانے سے انکار کر دیا، شاید وہ لوگ حکیم صاحب کے رعب وجلال سے خائف تھے۔ میری عاجزانہ گزارش پر پروفیسر افضال احمد صاحب تیار ہو گئے اور میرے ساتھ حکیم صاحب کے یہاں گئے، طیب صاحب نے نہایت پُرتپاک اور مشفقانہ انداز میں مصافحہ کیا اور بڑے خوشگوار ماحول میں گفتگو ہوئی، تھوڑی دیر بعد ہم اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ اس کے بعد میں ایک بار حکیم محمد ایوب خاں، جو اُس وقت ریسرچ آفیسر تھے، ان کے

ساتھ گیا۔ ہر ملاقات اچھے ماحول میں ہوئی کوئی شکوہ شکایت نہیں، طبّی سیاست پر کوئی گفتگو نہیں، البتہ ایک ملاقات میں انہوں نے اپنے کچھ شاگردوں کے کامیاب مطب کا تذکرہ کیا، خاص طور سے ڈاکٹر مصباح الدین صدیقی (اُس وقت طبیہ کالج کے لکچرر تھے) کی تعریف کی۔ اُن کی زبان سے کسی کی تعریف بڑی بات تھی۔

اس طرح ملاقاتوں کا میرا یہ سلسلہ جاری رہا۔ "Teacher's Re-orientation Training Programme" جو پہلی بار اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ کے شعبۂ کلیات میں جون۔ جولائی ۱۹۹۵ء میں منعقد ہوا تھا، اس میں راقم سطور بھی شریک تھا۔ ایک ماہ کی طویل ٹریننگ میں میرا قیام یونیورسٹی کے نیو گیسٹ ہاؤس میں تھا، ٹریننگ کے لیے طبیہ کالج جانا ہوتا تھا۔ ایک دن ایک لکچر کے دوران پروفیسر انیس احمد انصاری، جو کلیات کے چیئرمین تھے، نے مجھے ایک Slip دی اور کہا پروفیسر حکیم طیب صاحب نے آپ کو بھیجی ہے۔ میں نے Slip کو اسی وقت پڑھا، لکھا تھا۔

عزیزی سعد سلمہٗ

دعائیں

آج شام کا کھانا آپ میرے ساتھ کھائیں گے، ٹھیک ۸؍ بجے۔

خیر اندیش

'طیب'

ٹھیک ۸؍ بجے کو طیب صاحب نے Underline کر دیا تھا۔ شاید وقت کی پابندی پر زور تھا۔ میں حسبِ حکم ۷؍ بج کر ۵۵؍ منٹ پر طیب صاحب کے دولت کدے پر پہنچ گیا۔ انہوں نے ٹھیک ۸؍ بجے اپنے مطب کے دروازے بند کیے اور مجھے کھانے کی میز پر لے گئے، وہاں میرے سوا کوئی اور مہمان نہیں تھا۔ میز پر انواع واقسام کے کھانے تھے، کھانے کے دوران دریافت کیا، کھانا کیسا ہے؟ میں نے کہا بہت لذیذ ہے۔ فرمایا ساری چیزیں میں نے پکائی ہیں، سوائے چپاتیوں کے، کیونکہ مجھ سے چپاتیاں ٹھیک سے نہیں بنتیں، اس لیے میں نے چپاتیاں

بازار سے منگائی ہیں۔ یہ تھا خلوص طیب صاحب کا۔

پچھلے چار برس سے میری ملاقات ان سے نہیں تھی، جس کی وجہ خود میری صحت کی خرابی اور علی گڑھ کا کم سفر تھا۔ ملاقات نہ ہونے کا مجھے افسوس ہے۔

آج ہمارے درمیان طیب صاحب نہیں ہیں، مگر ان کی بہت سی یادیں اور باتیں ہمارے ساتھ ہیں، جنہیں کبھی نہیں بھلایا جا سکتا، ان یادوں کے ذریعہ وہ ہمارے قلوب میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

آہ! حکیم محمد طیب

حکیم سید غلام مہدی راز

سابق ڈپٹی ڈائرکٹر، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، نئی دہلی

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اُٹھتے جاتے ہیں

کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

۱۹۵۳ء کے ماہ جولائی کی درمیانی تاریخیں تھیں، میرے والد محترم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج میں داخلہ کے لیے مجھے علی گڑھ لے گئے تھے۔ داخلہ مکمل ہو چکا تھا اور طبیہ کالج ہوسٹل میں رہائش کی جگہ بھی مل گئی تھی، ہوسٹل کی یہ عمارت ایک پرانی رہائشی کوٹھی تھی، جس کا نام 'حبیب باغ' تھا، اسے خواجہ عبدالمجید صاحب نے مسلم یونیورسٹی کو ہبہ کر دیا تھا۔ پرانی عمارت ہوسٹل کا اولڈ بلاک تھی، جبکہ گیٹ کے قریب کھلی جگہ میں کچھ کمرے تعمیر کر کے اسے ہوسٹل کا نیو بلاک بنا دیا گیا تھا۔ اس ہوسٹل میں صرف طبیہ کالج کے طلبہ ہی رہتے تھے۔ میرے طبیہ کالج سے تعلیم ختم کرنے کے بعد ہوسٹل کا نام 'شفاء الملک حکیم عبداللطیف ہوسٹل' (شفاء الملک اس دور میں کالج کے پرنسپل تھے) ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہوسٹل ختم کر کے طبیہ کالج کے طلبہ کو دیگر ہوسٹلوں میں منتقل کر دیا گیا پھر اس کے بعد اولڈ بلاک میں یو جی سی کے کاموں سے متعلق دفتر اور گیسٹ ہاؤس بن گیا اور نیو بلاک میں یونانی طبی او پی ڈی قائم ہو گئی اور غالباً آج بھی یہی صورتِ حال ہے۔

داخلہ کی کارروائی پوری ہونے کے بعد والد صاحب گھر واپس جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ایسے ہی ایک روز صبح کے وقت میں والد صاحب کے ہمراہ ہوسٹل سے باہر جا رہا تھا۔ گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی سامنے سے ایک خوب رو، خوش لباس اوسط قد و قامت، ذہین اور تیز طرار جوان آتا نظر آیا۔ قریب پہنچے تو سلام دعا کے بعد معلوم ہوا کہ وہ وہیں کے طالب علم ہیں۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ میں طبیہ کالج کا طالب علم بن گیا ہوں اور ہوسٹل کے اولڈ بلاک میں رہائش پذیر ہوں تو انہوں نے ہوسٹل اور طبیہ کالج کے قاعدے قانون، یہاں رہنے کے طور طریقے، یونیورسٹی اور کالج کی روایات، پروٹوکول، رسم و رواج، سینئر اور جونیئر طلبہ کے تعلقات، یونیفارم کی پابندی وغیرہ کی ہدایات پر پورا لکچر دے ڈالا، ان کی باتوں کا انداز بہت متاثر کن تھا۔ اس طرح یہ گفتگو راستے میں کھڑے کھڑے نصف گھنٹہ سے بھی زیادہ دیر تک جاری رہی۔ یہ تھے محمد طیب جنہوں نے بعد میں طبی دنیا میں عظیم معلم، محقق اور معالج کی حیثیت سے شہرت پائی۔ وہ اسی سال طبیہ کالج کی تعلیم سے فارغ ہو کر بی یو ٹی ایس (بیچلر ان یونانی طب اینڈ سرجری) ہو گئے، جب کہ میں اسی سال طبیہ کالج کا طالب علم بنا تھا اور مجھے بہت کچھ سیکھنا، سمجھنا تھا۔ طیب صاحب اسی سال یا غالباً آئندہ سال طبیہ کالج میں لکچرر ہو کر تدریسی اسٹاف میں شامل ہو گئے۔ وہ ایک بے حد ذہین، باعلم اور درجۂ اول میں کامیابی حاصل کرنے والے طالب علم رہے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بارہ بنکی کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے تھے اور ہائی اسکول میں پورے بارہ بنکی سٹی میں ٹاپ کیا تھا، انٹر کالج کے فائنل امتحان میں بھی انہوں نے پہلی پوزیشن حاصل کی تھی اور طبیہ کالج کے فائنل امتحان میں بھی وہ امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے تھے۔ جب وہ استاذ ہوئے تو یہ تمام خوبیاں ان میں بدرجۂ اتم موجود تھیں، ان کی وجہ سے رفتہ رفتہ وہ اپنا مقام پیدا کرتے جا رہے تھے، وہ جن مضامین کے استاذ تھے، وہ نصاب کے لحاظ سے ہم کو آخری درجات میں پڑھنے تھے، جب کہ شروع کے دو سال اناٹمی، فزیالوجی، تاریخ طب اور انگریزی یا معہ منطق و فلسفہ پڑھنا تھا۔ شروع کے دور میں ان سے کوئی خاص رابطہ نہیں رہا۔ جب ان کے درس سے مستفید ہونے کا موقع ملا تو ان کی

اور بہت سی خوبیاں سامنے آئیں۔

طیب صاحب بہت اچھے استاذ تھے۔ ان کو اپنے مضمون پر مکمل عبور تھا۔ پوری تیاری اور وقت کی پابندی کے ساتھ کلاس میں آتے تھے۔ انداز و اطوار ایسے تھے کہ طلبہ کی نبض پہچانتے تھے۔ ان کا لکچر طلبہ کی ذہنی سطح کے مطابق ہوتا تھا۔ بڑے اچھے انداز میں سمجھاتے تھے۔ موضوع پر تفصیلی معلومات فراہم کرتے تھے، وہ تقریر اور تحریر کے ماہر تھے، نہ صرف اردو، بلکہ انگریزی زبان میں بھی۔ گفتگو میں جاذبیت اور دلکشی تھی، وقت اور موقع کے لحاظ سے باتوں میں ہلکا سا مزاح بھی ہوتا تھا۔ طلبہ ان کے لکچر کے دوران بور نہیں ہوتے تھے۔

اپنے مزاج کے لحاظ سے طیب صاحب لیے دیئے انداز سے رہنے والے انسان تھے اور آپسی معاملات میں ذرا خشک اور کچھ سخت تھے، کسی ساتھی سے بھی بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔ طلبہ پر رعب کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ مزاج میں سختی ضرور تھی مگر وہ اصول پسند تھے، چاہتے تھے کہ طلبہ کی تعلیم معیاری ہو، وہ محنت کریں اور نصابی تعلیم کے علاوہ مختلف موضوعات کا علم بھی حاصل کریں۔ آخری درجات میں معالجات کے پریکٹیکل کے طور پر طیب صاحب اسپتال کے انڈور وارڈس میں بیڈ سائڈ لکچر (Bed Side Lecture) دیا کرتے اور مریض کی تشخیص کے لیے ضروری اور کارآمد نکات بیان کرتے تھے۔ طبیہ کالج اسپتال کی او پی ڈی کے طور پر مطب ہوتا تھا، جہاں مریضوں کا مرجوعہ بہت ہوتا تھا۔ کالج کے پرنسپل شفاء الملک حکیم عبد اللطیف فلسفی پابندی سے مطب کرتے تھے۔ ان کا معالجہ بے حد مقبول تھا۔ طیب صاحب بھی بہ حیثیت معالج مطب میں بیٹھتے تھے، فلسفی صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد مطب کی ساری ذمہ داری طیب صاحب کے اوپر آ گئی، انہوں نے یہ فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیئے اور علی گڑھ میں وہ بہترین معالج کے طور پر کافی مشہور ہوئے۔

۱۹۵۸ء میں بی یو ایم ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد، میں دس سال سے کچھ زیادہ عرصہ تک ہمدرد (وقف) لیباریٹریز دہلی میں بہ حیثیت طبیب ملازم رہا۔ اُس دور میں طیب صاحب سے کوئی رابطہ نہ ہوسکا، وہ فقط ایک اچھے استاذ کی حیثیت سے یاد رہے۔ ۱۹۷۱ء میں

وزارتِ صحت کے خودمختار ادارہ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی (CCRIMH) اور سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (CCRUM) سے تعلق ہوا تو لکھنؤ میں لٹریری ریسرچ یونٹ میں کام کیا، پھر کونسل کے ہیڈ کوارٹر میں دہلی آ گیا۔ چونکہ علی گڑھ میں بھی کونسل کی ریسرچ یونٹ قائم تھی، اس لیے منصبی فرائض کے سلسلہ میں وہاں جانا ہوتا رہا اور طیب صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ طیب صاحب علی گڑھ میں قائم لٹریری ریسرچ یونٹ کے اعزازی پروجیکٹ آفیسر تھے، یہ یونٹ انہی کی نگرانی میں تھا، کونسل میں میری خدمات، فارسی طبّی مخطوطات و مطبوعات کے ترجمے، ترتیب و تدوین اور اشاعت سے متعلق تھیں اور یہ کام لٹریری ریسرچ پروگرام کے زمرہ میں آتا تھا، اس شعبہ سے وابستگی کے دوران مجھے طیب صاحب کی علمیت نیز وسیع معلومات سے بہت فائدہ پہنچا وہ اردو اور انگریزی زبان پر تو عبور رکھتے ہی تھے، انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کر کے شعبۂ فارسی کے مشہور محقق پروفیسر نذیر احمد کی نگرانی میں پی ایچ ڈی بھی کی تھی۔

جب سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن (CCRUM) قائم ہوئی (۷۹-۱۹۷۸ء) تو طیب صاحب اس کی گورننگ باڈی اور سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر مقرر ہوئے اور ایک زمانہ میں سائنٹفک ایڈوائزری کمیٹی کے چیئرمین بھی رہے۔ کونسل کے ہیڈ کوارٹر میں کام کرنے کی وجہ سے میٹنگوں وغیرہ سے متعلق اکثر کام میرے سپرد رہتے تھے۔ طیب صاحب جب کسی میٹنگ میں دہلی آتے تو ان سے ملاقات تو ہوتی ہی تھی، بہت سے ٹیکنکل کاموں سے متعلق مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کا موقع بھی ملتا تھا نیز مختلف شہروں میں منعقد ہونے والے اکثر سیمیناروں اور میٹنگوں میں طیب صاحب آتے اور ملاقات ہوتی۔ وزارتِ صحت کی قائم کردہ نیشنل یونانی فارماکوپیا کمیٹی کے وہ سرگرم رکن تھے۔ جب پارلیمنٹ کے ایکٹ ۱۹۷۰ء کے تحت سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن (CCIM) بنی تو طیب صاحب اس میں بھی بہت نمایاں رہے اور اس کی ایجوکیشن کمیٹی کے صدر بنے۔ طیب صاحب آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس سے بھی وابستہ تھے۔ ایک عرصہ تک اس کے سینئر نائب صدر بھی رہے۔ جب

حکیم عبدالحمید صاحب کا ۱۹۹۹ء میں انتقال ہو گیا تو حکیم محمد مختار اصلاحی اس کے کارگزار صدر ہو گئے تھے پھر باقاعدہ انتخاب ہونے پر حکیم محمد طیب صاحب اس کے صدر بنائے گئے۔ اس سلسلے میں بھی طیب صاحب کئی بار دہلی تشریف لائے اور ملاقاتیں ہوئیں۔ طیب صاحب ۱۹۷۳ء میں طبیہ کالج علی گڑھ کے پرنسپل ہوئے اور ۱۹۷۹ء میں پروفیسر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فیکلٹی آف یونانی میڈیسن بنی تو طیب صاحب سب سے پہلے اس فیکلٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا طیب صاحب اعلیٰ علمی ذوق کے ساتھ تحریر و تقریر کے بھی ماہر تھے۔ طبیہ کالج کے تدریسی اسٹاف میں شامل ہوتے ہی انہوں نے تصنیفی کام شروع کر دیا تھا۔ ان کی تین کتابیں بہت مشہور ہوئیں اور طبی طلبہ نیز اساتذہ نے ان کتابوں سے بہت استفادہ کیا۔

طیب صاحب ایک تندرست، توانا اور صحت مند انسان تھے۔ وہ بے حد چاق و چوبند اور فرض شناس تھے۔ ہمیشہ صاف ستھرا اور عمدہ لباس زیب تن کرتے تھے۔ علی گڑھ کے لحاظ سے زیادہ تر شروانی پہنتے تھے۔ درس و تدریس کے علاوہ ان کے مشاغل میں یہ بھی تھا کہ مختلف شہروں میں طبیہ کالجوں کے مختلف مضامین (خصوصاً معالجات) کے بیرونی ممتحن کی حیثیت سے امتحان (Viva) لینے جاتے، سلیکشن کمیٹیوں میں اکسپرٹ کی حیثیت سے بیٹھتے نیز طبی سیمیناروں اور میٹنگوں میں شرکت کرنے جاتے تھے۔ وہ بے حد سنجیدہ مزاج تھے، لیکن میں نے ان کو حکیم خلیفۃ اللہ صاحب سے بے تکلف ہوتے اور مذاق کے موڈ میں دیکھا ہے۔ طیب صاحب بے تکلفی میں ان کو صرف 'خلیفہ' کہتے تھے۔ طیب صاحب آگے بڑھتی ہوئی زندگی کا ساتھ دیتے تھے۔ اُس دور میں علی گڑھ میں طلبہ اور اساتذہ کی عام سواری، سائیکل یا سائیکل رکشہ تھا۔ جب طیب صاحب لکچرر تھے، میں نے ان کو اس زمانے کی نئی اور نسبتاً تیز رفتار سواری موپیڈ پر سواری کرتے اور اُسی پر کالج آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ سواری ان کو زیب بھی دیتی تھی۔ بائک اور اسکوٹر تو اس زمانے میں خال خال تھے اور کاریں تو تقریباً عنقا تھیں۔

طیب صاحب کی خانگی زندگی کے بارے میں میری معلومات صفر ہیں، مگر مشہور یہ تھا کہ

وہ کچھ زیادہ خوشگوار نہیں تھی، وہ زیادہ تر اپنے گھر میں تنہا رہے۔ اس بارے میں مجھے ایک واقعہ یاد ہے، میں مذبذب ہوں کہ اسے لکھوں یا نہ لکھوں، ہوا یہ کہ ایک بار منصبی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں، میں نے دہلی سے علی گڑھ کا ایک دن کا سفر کیا۔ کونسل کے ڈائرکٹر حکیم عبدالرزاق صاحب کی ہدایت تھی کہ طیب صاحب سے مل کر آنا۔ رزاق صاحب اور طیب صاحب ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور ان میں دوستی کی حد تک ارتباط تھا۔ میں علی گڑھ پہنچا اور اپنا کام کر کے طبیہ کالج گیا، تاکہ طیب صاحب سے ملاقات کرلوں۔ طبیہ کالج کے طلبہ اور اساتذہ کی آپسی سیاست کے بارے میں مجھے کوئی علم نہ تھا، نہ مجھے طیب صاحب کی علمی اور درس وتدریس کی سرگرمی کے علاوہ کچھ اور خبر تھی۔ یہ غالباً ۱۹۸۰ء کی شروعات کا دور تھا، طبیہ کالج پہنچا تو طیب صاحب وہاں نہیں تھے، معلوم ہوا کہ کچھ طلبہ نے ان سے زبردستی استعفیٰ لکھوالیا ہے۔ مجھے ڈائرکٹر صاحب کے حکم کے مطابق طیب صاحب سے ملنا تھا، میں ان کے گھر چلا گیا، وہ اس وقت تار والے بنگلہ کے قریب غالباً یونیورسٹی سے الاٹ کیے گئے ایک گھر میں رہتے تھے۔ میں پہنچا تو طیب صاحب خاصے بڑے گھر میں بالکل تنہا تھے۔ مجھے بٹھالیا اور بہت دیر تک اس دن کے واقعہ کے بارے میں بات کرتے رہے (پیرانہ سالی کی وجہ سے اب مجھے کوئی بات یاد نہیں) دہلی واپس پہنچ کر میں نے صورتِ حال سے رزاق صاحب کو مطلع کردیا۔ اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ چند دن بعد ہی وہ کالج میں آگئے اور درس وتدریس کا سلسلہ شروع کردیا، جو بھی معاملہ تھا، غالباً رفع دفع ہوگیا تھا۔

ایک اور واقعہ طیب صاحب کی مزاجی اُفتاد پر ہلکی سی روشنی ڈالتا ہے، بیان کیے دیتا ہوں۔ کونسل کی سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی کی ایک میٹنگ چنڈی گڑھ میں رکھی گئی تھی۔ وہاں کے پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل ایجوکیشن اینڈ ریسرچ (PGIMER) کے فارماکولوجی ڈیپارٹمنٹ کے صدر پروفیسر رنجیت رائے چودھری کونسل کی گورننگ باڈی اور سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی کے ممبر تھے، وہ کونسل کے ڈائرکٹر حکیم رزاق صاحب کے دوست تھے، یہ میٹنگ انہی کے ایما پر ہو رہی تھی۔ رزاق صاحب نے مجھے حکم دیا کہ میں اس میٹنگ کے لیے

طیب صاحب کو لے کر چنڈی گڑھ جاؤں۔ سفر زیادہ طویل نہ تھا۔ ٹرین میں ریزرویشن ممکن نہ ہوا۔ مجبوراً میں نے بس سے سیٹس ریزرو کرالیں۔ بس کشمیری گیٹ کے بین الریاستی بس اڈے سے نصف شب کے قریب روانہ ہوئی۔ راستے میں چند منٹ انبالہ ٹھہری اور صبح تقریباً چار بجے ہم چنڈی گڑھ پہنچ گئے اور انسٹی ٹیوٹ کے گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ کچھ دیر بعد ہی گیسٹ ہاؤس کا ملازم چائے لے آیا اور مجھ سے کہا، دوسرے صاحب کو اُٹھادوں۔ میں نے بہت جھجکتے ہوئے طیب صاحب کو اٹھا دیا اور انہوں نے چائے پی بھی لی۔ مگر صبح کو رزاق صاحب سے ملاقات ہوئی تو مجھ پر خفگی کا اظہار کرتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا کہ اِن حضرت نے مجھے رات بھر بس میں سفر کرایا اور یہاں آرام کرتے ہوئے چند منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ چائے کے لیے جگادیا۔ میں نے طیب صاحب کی ناراضگی کا اس لیے کوئی اثر نہ لیا کہ رات بھر کے سفر کی تھکان اس وقت چائے کی متقاضی تھی۔

طیب صاحب تقریر وتحریر کے ماہر تو تھے ہی، اپنے جذبات کو تحریری لباس پہنانے میں بھی بڑی قدرت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی دو تحریروں کا تذکرہ کروں گا۔ ایک اردو زبان میں اور دوسری انگریزی میں۔ ان تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کتنی مخلصانہ ہیں اور ان میں کتنی گہرائی، علمیت، ادبیت، رعنائی اور تاثیر ہے۔

۲۹ر اور ۳۰ر مارچ ۲۰۰۳ء کو سنٹر فار ہسٹری آف میڈیسن اینڈ سائنس، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی میں اردو اکیڈمی، دہلی کے اشتراک سے ایک دوروزہ قومی سیمینار "طب یونانی اور اردو زبان وادب" کے موضوع پر منعقد ہوا۔ پروفیسر الطاف احمد اعظمی اس سنٹر کے سربراہ تھے اور اتفاق سے اُن دنوں اردو اکیڈمی، دہلی کے وائس چیئرمین بھی، یہ سیمینار انہی کی تحریک پر اور ان ہی کی سربراہی میں جامعہ ہمدرد کے آرکائیوز کے آڈیٹوریم میں بہت اعلیٰ پیمانہ پر منعقد ہوا، اردو زبان اور طب یونانی کے مشاہیر اور دانشوروں نے چھ اجلاسوں میں چالیس سے زیادہ مقالے پیش کیے (راقم الحروف نے 'قصائد ذوق میں طبی اصطلاحات' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا)، افتتاحی اجلاس میں تین مقالات پیش کیے گئے تھے۔ پہلا مقالہ 'اُردو کے فروغ میں طب یونانی کی خدمات'

پروفیسر الطاف احمد اعظمی کا تھا۔ دوسرا پروفیسر حکیم محمد طیب کا بہ عنوان 'طب یونانی اور اردو زبان و ادب' اور تیسرا مقالہ 'علم طب اور اردو شاعری' مشہور ادیب اور ناقد پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے پیش کیا، جو کلیدی خطبہ تھا۔

طیب صاحب کا مقالہ نہ صرف بے حد معلوماتی، بلکہ اطباء اور اردو دوستوں کو چونکا دینے والا تھا۔ ان کی زبان میں سلاست، ادب کی چاشنی اور علوءِ فکر کے نمونے تھے۔ مقالے کے پہلے پیراگراف کے چند جُملے ملاحظہ فرمایئے:

> "یہ سیمینار جس کے افتتاحی جلسے میں ہم سب موجود ہیں، عام سیمیناروں سے ذرا ہٹ کر ہے۔ عنوان میں موافقت یا مخالفت کے درمیان انتخاب کی گنجائش نہیں۔ ایک مثبت بیان ہے۔ جس کی صراحت وفصاحت بعد میں ہونے والی مجالس میں کی جائے گی اور ثبوت ونظائر پیش ہوں گے۔ مقالہ نگاروں کے ذریعہ باتیں تو بعد میں ہوں گی جو معلوماتی اور پر مغز ہوں گی، مجھے تو اختصار کے ساتھ کچھ اظہار خیال کرنا ہے"۔

اس مقالے میں طیب صاحب نے اُردو زبان کی موجودہ صورتحال پر بڑی دلچسپ چٹکیاں لی ہیں اور بعض قدیم طبّی کتابوں کے اردو تراجم کا ذکر کیا ہے۔ موجودہ دور میں اُردو کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "کم از کم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے حلقہ میں ایسی مایوس کن صورت حال تو نہیں ہوئی تھی۔ ہزاروں سال اپنی بے نوری پر روتے روتے نرگس کی ابھی تک آنکھ لگی تھی کہ بالیں پر شورِ قیامت اٹھا کہ سر سید پیدا ہوئے۔ نرگس نے نیم وا آنکھوں سے دور مستقبل کے اُفق پر کچھ روشن چراغ دیکھے اور مسکرا کر چین کی نیند سوگئی۔ تاریخ کے پنے پلٹتے رہے۔ علی گڑھ میں ایک عظیم درسگاہ نے جنم لیا۔ علم وادب کی قندیلیں جگمگانے لگیں۔ ہر شام شام مصر، ہر شب شب شیراز۔ مختلف علوم وفنون میں تعلیم حاصل کر کے اس عظیم درسگاہ کے فارغین ملک اور بیرون ملک پھیلنے لگے۔ جس درسگاہ میں منعقد ہونے والے مشاعرے حسین یادگار بن جاتے تھے، ان کا حشر خراب ہونے لگا۔ اردو ثانوی حیثیت کی بھی حامل نہیں رہی۔ اردو اور تہذیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے جب

اردو علم وادب کا شعور نہ رہا تو مشاعروں میں گئے، بلّی کی بولیاں ہی سننے کو ملیں گی۔
لباس تو اپنی شکل بگاڑ ہی چکا تھا، زبان کا حال یہ ہے کہ 'سربت' پیتے ہیں۔ 'ساہی ٹکڑا'
کھاتے ہیں اور 'جکام' میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آخر کیوں اردو کی بنیادی تعلیم کورس کے
ساتھ لازمی قرار نہیں دی جاتی''۔

اقتباس قدرے طویل ہو گیا، مگر یہ تو دیکھیے کہ زبان کتنی رواں، سلیس، شستہ اور ادبی ہے۔
آخر میں طب یونانی کی تعلیم کے لیے اردو کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب قبل اس کے کہ آپ مزید بور ہوں، میں اجازت چاہتا ہوں مگر اگر اظہارِ خیال
اچھا نہ لگا ہو تو حافظؔ کے اس مصرعہ کے مصداق آپ بھی مجاز ہیں۔ ع

ایں دفترِ بے معنی غرقِ مے ناب اولیٰ

میں نے مذکورہ اقتباس طیب صاحب کی اردو زبان و ادب کی معلومات اور ان کی شفاف ذہنیت کے مظاہر کے طور پر پیش کیے ہیں۔ اب چند جملے ان کی انگریزی، مخلصانہ ادبی تحریر کے نمونے کے طور پر دیکھ لیجیے۔

اپریل ۱۹۹۲ء میں حکیم محمد عبدالرزاق ڈائرکٹر، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کا انتقال ہوا۔ مرحوم ایک ایسی شخصیت کے طور پر مشہور و معروف تھے، جس نے بیسویں صدی کے نصف آخر میں طب یونانی کے احیا و ترقی کے لیے بے حد کام کیا، وہ مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور حکیم عبدالحمید (متولی ہمدرد) کے بعد تیسری ایسی شخصیت تھے، جس نے طبّی تحقیق کے لیے نمایاں کام کیا۔ وہ ایک وسیع النظر انسان تھے، ان کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ فنِ طب کی نمایاں ہستیاں اور صاحبانِ اقتدار ان کے عظیم کارناموں سے واقف ہیں۔ ان کی شخصیت اور کارناموں پر ایک کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا گیا اور ایسے بہت سے صاحبانِ قلم سے مضامین حاصل کیے گئے، جو کسی نہ کسی طرح رزاق صاحب سے وابستہ رہے تھے اور ان کی شخصی خوبیوں اور اوصاف سے واقف تھے۔ اخبارات میں شائع ان کی وفات کی خبروں اور مضامین کو بھی لیا گیا۔ بہت سی وہ تصاویر لی گئیں جو رزاق صاحب کی حیات اور کارناموں سے متعلق تھیں۔ ان سب کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب کیا گیا۔ کتاب کے ایک طرف اردو اور دوسری جانب

انگریزی میں مضامین شائع کرنے کا پروگرام بنا۔ اس طرح یہ دولسانی کتاب ہوگئی۔ کتاب تو مرتب ہوگئی مگر اس کی اشاعت میں مختلف وجوہ کے باعث دیر ہوتی چلی گئی، بالآخر یہ 'مجاہدِ طب حکیم محمد عبدالرزاق' کے نام سے شائع ہوئی، ام الفضل اور راقم اس کے مرتب ہیں، (کتاب کے مرتبین ام الفضل اور سید غلام مہدی دونوں طیب صاحب کے شاگرد ہیں) یہ کتاب ۲۰۱۰ء میں حکیم محمد عبدالرزاق ریسرچ فاؤنڈیشن، حیدرآباد نے شائع کی ہے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں اس کا دیباچہ ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی، گورنر ہریانہ نے لکھا ہے۔

کتاب کی رسم اجراء، 'سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، حیدرآباد' میں ہوئی تھی۔ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب ایک مشہور طبیب، معالج اور ایک عظیم دانشور اور رزاق صاحب کے دوست تھے۔ اس کتاب میں چھپنے کے لیے انہوں نے جو مضمون عنایت کیا وہ بہ عنوان 'A Friend Recalls' اُس میں شامل ہے۔ مضمون کی ابتداء، انہوں نے ام الفضل صاحبہ کے ذکر سے اس طرح کی ہے "طبیہ کالج علی گڑھ میں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۶۵ء تک میں کلینکل میڈیسن کی کلاس لیا کرتا تھا، مجھے یاد نہیں وہ کونسا تعلیمی سال تھا کہ میں نے اپنی کلاس میں ایک سنجیدہ معصوم شکل نظر آنے والی ایک طالبہ کو دیکھا، جیسے ابھی عبادت کر کے آئی ہو وہ حیدرآباد کی تھی۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

> "Then one fine morning while I was on duty in the Matab of Late Hakim Abdul Latif, then Principal, one young man in kurta payjama, rather handsome came to Hakim sahab and I was introduced to him. He was one Hakim Abdul Razzaak, serving probably in Hamdard at that time, Neither Hakim Abdul Razzaq took any notice of me nor I bothered him any more-"

آخری جملہ سے ان دونوں حضرات (طیب صاحب اور رزاق صاحب) کی مزاجی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ وہ سنجیدہ دکھائی دینے والی لڑکی جس کا نام،

ام الفضل تھا، ان سے منسوب تھی یا غالباً شادی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد رزاق صاحب سے جان پہچان کبھی ایک دوسرے کو نظر آتے تو تعارفی انداز پر گردن ہلا دینے سے آگے نہیں بڑھی۔ اکثر وہ حکیم کبیرالدین صاحب کے گھر آیا کرتے۔ اس کے بعد کا پیرا گراف دیکھئے:

"I am confused as to when and where we came close to each other---- through thick and thin, seeing each other virtues and vices, capabilities and incapabilities, chequred past and wishful future. We often have difference of opinion and approach. We frequently disagreed. We excahanged notes and very personal matters as well."

اس کے بعد جب حکیم محمد عبدالرزاق صاحب، سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے ڈائرکٹر بن گئے تو طیب صاحب کونسل کی مختلف کمیٹیوں کے ممبر بنے۔ رزاق صاحب ان کو اکثر میٹنگ وغیرہ میں شرکت کے لیے دہلی بلانے لگے، اس طرح دونوں کی ملاقاتوں کا سلسلہ دراز ہوا اور دونوں میں دوستی بڑھنے لگی۔ طیب صاحب نے یہ سب باتیں ایک سیدھے، سچے پیرایہ اور بہت دلچسپ انداز میں لکھی ہیں۔ یہ مضمون سوانحی نہیں مگر رزاق صاحب کی زندگی اور کارناموں کی سچی تصویر ہے۔ ان کے مرض قلب اور ذیابیطس میں مبتلا ہونے کا حال، ان کے مختلف سفروں کی کیفیت جس میں اکثر طیب صاحب خود بھی شریک رہتے تھے، یہ سب کچھ بہت سادگی وصفائی کے ساتھ ادبی انداز میں لکھا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے اکتوبر ۱۹۹۱ء میں بیجنگ (چین) میں ہونے والی انٹرنیشنل کانفرنس آن ٹریڈیشنل میڈیسن میں شرکت کے لیے جانے والے سفر کی داستان بھی لکھی ہے اور رزاق صاحب کے 'دیوار چین' پر چڑھنے کی کیفیت کا حال بھی مزے لے کر لکھا ہے۔ رزاق صاحب چونکہ دل کے مریض تھے اس لیے ان کی بیگم ام الفضل صاحبہ نے سفر میں طیب صاحب سے ان کا خیال رکھنے کی درخواست کی۔ طیب صاحب نے اس کا پورا پورا حق ادا کیا، وہ مضمون میں اس سفر کا حال لکھتے ہیں:

"The same Razzaq who had climbed the China wall, had walked through the shopping centre of Beijing for hours, had flown back from Beijing to Delhi via Bangkok and reached his home to be cheered and welcomed by his family members was flown in a coffin from Dubai while there was no strain either in Mecca or in Dubai. This was his last journey. A vaccum left behind friends devoid of his company and family to mourn his irreversible absence."

رزاق صاحب کی وفات پر یہ غم ناک اور تاثراتی جملے لکھنے کے بعد یہ مضمون انہوں نے ان جملوں پر ختم کیا ہے:

"So he was Razzak, ---- my friend, who is no more----. This is the irony of facts that people realize the significance of man too late. History is full of such late realizations. Let his soul be in peace with his creator, let us face sweet- bitter life till the command of withdrawl is received."

حقائق پر مبنی طیب صاحب کا یہ مضمون اتنا دلاویز اور انفرادیت لیے ہوئے ہے کہ جی چاہتا ہے اسے بار بار پڑھا جائے۔

حکیم طیب صاحب نے زندگی بھر یونانی طب کی خدمت کی اگر وہ اردو اور انگریزی زبانوں میں لکھتے رہتے تو بہت اعلیٰ درجہ کے مصنف ہوتے۔ طب یونانی کی علمی اور معالجاتی زندگی میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ وہ جدید طب سے بھی خوب واقف تھے۔ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے اپنے گھر، واقع امیر نشاں، علی گڑھ پر آخر وقت تک مطب کیا اور سیکڑوں بندگانِ خدا کو اپنے دست شفا سے راحت پہنچائی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے نسخوں سے تیار

کی ہوئی، بہت سی دوائیں انہوں نے عوام الناس کے فائدے کے لیے دواخانہ طبیہ کالج کو بھی دیں۔

آہ! طیب صاحب! آپ کتنی خوبیوں کے حامل تھے۔ کتنے بلند درجہ کے معالج، کتنے علم دوست اور کتنے بڑے عالم، اپنی ذات میں ایک گنج گراں مایہ تھے۔ آپ بھی چلے گئے۔ سب ہی کو جانا ہے۔ مگر میرا دل چاہتا ہے کہ مرزا غالبؔ کا یہ شعر پڑھوں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

ایک جامع اوصاف وکمالات شخصیت

پروفیسر حکیم ابوبکر خاں
ڈین فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اے ایم یو علی گڑھ

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی شخصیت گوناگوں اوصاف وکمالات کی جامع تھی۔ انہیں دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان کی ذات میں کونسا وصف زیادہ نمایاں تھا، سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر صفت میں ممتاز تھے، ایک استاذ کی حیثیت سے وہ بے مثال اور معالجہ کے میدان میں لاثانی تھے، انتظامی معاملات میں وہ اپنی مثال آپ تھے، بطور محقق ان کا قد اتنا بلند تھا کہ اس کی نظیر پیش کرنا دشوار ہے، تالیف وترجمہ اور تصنیف کے باب میں انہوں نے جو آثار چھوڑے ہیں وہ نہ صرف روایتوں سے پرے ہیں، بلکہ ان سے، بہت سے لوگوں نے ترغیب پائی ہے، طیب صاحب کی شخصیت میں جو وقار تھا، اس کی وجہ یہی کمالات وحسنات تھے۔

طیب صاحب ۱۹۳۲ء میں مشرقی اتر پردیش کے ضلع بارہ بنکی کے ایک دیندار اور مذہبی خاندان میں پیدا ہوئے۔ یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، پھر تحصیلِ طب کے لیے لکھنؤ کا قصد کیا، مگر طبیعت کی افتاد انہیں لے کر علی گڑھ چلی آئی اور پھر وہ یہیں کے ہو رہے۔

اجمل خاں طبیہ کالج سے فراغت کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ الجامعہ کے ایما پر ان کا تقرر عمل میں آیا، ابتداءً انہیں اصولِ تشخیص وتجویز کی تدریس تفویض ہوئی تھی، اب یہ مضمون Clinical bed side کے نام سے جانا جاتا ہے، دراصل یہ مضمون ان کے طبعی میلان کے عین مطابق تھا، اس پر ان کی قدرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ اس مضمون کو برجستہ پڑھاتے تھے، کلاس میں

آنے کے بعد طلبہ سے پوچھتے کہ پچھلی کلاس میں کیا کچھ پڑھایا تھا، یہ دریافت کرنے کے بعد اس سے آگے پڑھانا شروع کردیتے، ان کا استحضار اور مضمون پر عبور دیکھتے بنتا۔

طیب صاحب کا خیال تھا کہ مرض کی تشخیص میں محض روایتی ذرائع پر انحصار کے بجائے اس سلسلہ کی جدید اختراعات اور آلات سے لازمی طور پر مستفید ہونا چاہیے، اسی طرح نسخہ نویسی کے باب میں بھی ان کا اندازِ فکر بہت منفرد تھا، کتابی نسخوں پر انحصار کے بجائے حسبِ ضرورت وہ انہیں خود تالیف کرتے، ان کے اندر نسخوں کی ترتیب کا بڑا پختہ شعور تھا، وہ محض نسخہ کے اجزا بیان فرمانے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ ایک ایک جزء کی وجہ شمولیت، اس کے روایتی استعمال کے فلسفہ اور جدید تحقیقات سے ثابت اس کے افعال و خواص وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالتے، تشخیص و تجویز کے سلسلہ میں طیب صاحب کو حذاقت کا ملکہ حاصل تھا، ان کی اس صلاحیت کے معترف، ان کے استاذ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی بھی تھے، شفاء الملک کا کہنا تھا کہ نسخوں کی ترتیب کے سلسلہ میں طیب کی Approach بہت سائنٹیفک ہوتی ہے، جب میں علی گڑھ آیا تو بحیثیت معالج طیب صاحب کا ستارۂ شہرت نصف النہار پر تھا، حالانکہ اس وقت وہ جواں سال تھے، ان کے سامنے بزرگ اساتذہ کی ایک لمبی قطار تھی، اتنے سینئر اطباء کی موجودگی میں انہوں نے حذاقت کا درجہ حاصل کرلیا تھا اور فکری بالیدگی کے مرتبہ پر فائز ہوگئے تھے، دواخانہ طبیہ کالج سے تیار ہونے والے مرکبات میں "فواکہین" نے بڑی شہرت پائی ہے، اس کا نسخہ حکیم طیب صاحب کا مرتب کردہ ہے، اسے انہوں نے اس زمانہ میں ترتیب دیا تھا، جب ان کے پیشہ ورانہ کیریئر کی عمر بہت دراز نہیں تھی، اس کے علاوہ دواخانہ سے تیار ہونے والے متعدد نسخوں کی ترکیب حکیم طیب صاحب نے انجام دی ہے، مفصلین، قلبین اور ستاوری وغیرہ اس سلسلہ کے چند اہم نام ہیں، ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی انہوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں کئی مفید نسخے ترتیب دیے۔ اس طرح کے کئی مرکبات دودھ پور، علی گڑھ میں واقع 'دیسی دواخانہ' تیار کررہا ہے، اگر کسی بڑے دواساز ادارہ سے ان کی تیاری کا انتظام ہو پاتا تو اس سے ان کی افادیت کا دائرہ زیادہ وسیع ہوتا۔

طیب صاحب کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی، اس صلاحیت کی بدولت انہوں نے کئی

دواؤں کے ایسے افعال وخواص کی نشاندہی کی، جو روایتی بیانوں سے ہٹ کر تھے، تخم کونچ میں Anti Diabetic اور بیخ اسرول میں Anti Allergic خواص کا مشاہدہ ان کی اس صلاحیت کا بیّن ثبوت ہے۔

حکیم طیب صاحب ایک ماہر استاذ اور حاذق طبیب ہونے کے ساتھ ایک اچھے منتظم بھی تھے، ان کی اس صلاحیت سے طبیہ کالج، ہاسپٹل اور شعبۂ علم الادویہ کو بڑا فائدہ پہنچا۔ وہ ایک اچھے منتظم شاید اس لیے تھے کہ خود ان کی زندگی میں بے حد نظم تھا اور ان کی پوری زندگی اصولوں سے عبارت تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر دورِ انصرام میں خواہ وہ کالج کی پرنسپلی، ڈین شپ اور شعبۂ علم الادویہ کی صدارت کا زمانہ ہو یا پھر ہاسپٹل کی سپرنٹنڈنٹ شپ کا عہد، نظم وضبط کا ماحول تھا، تدریسی اور غیر تدریسی زمرہ کے کسی بھی فرد کو ضابطوں سے سرِ مو انحراف کی اجازت نہیں تھی۔

طیب صاحب نے بہت غیور طبیعت پائی تھی، انہیں کسی بھی قیمت پر غیرتِ نفس کا سودا گوارا نہیں تھا، ۱۹۹۲ء میں ساٹھ برس کی عمر ہونے پر انہیں ریٹائر ہونا تھا، اس وقت یونیورسٹی میں سبکدوشی کے بعد ملازمت میں مزید کچھ مدت کے لیے توسیع کی گنجائش تھی، اس سلسلہ میں طیب صاحب کی فائل جب ضروری کارروائی کے لیے آگے بڑھائی گئی تو ان کے بعض معاندین نے توسیع کے حکم نامہ میں، جو عموماً ایک سال کا ہوتا تھا، "Till the end of Session" لکھوا دیا اور اس واقعہ کی خوب تشہیر کی، اس لیے کہ تعلیمی سشن پورا ہونے میں صرف تین مہینے ہی بچے تھے، جولائی ۱۹۹۳ء میں جب ڈین شپ کا چارج میرے پاس آیا تو میں نے اس وقت کے شیخ الجامعہ پروفیسر نسیم احمد فاروقی صاحب سے مل کر ایک سال کی مزید توسیع کا آرڈر کروایا، دراصل میری خواہش تھی کہ ایسے لائق استاذ سے کالج کو کچھ دنوں اور مستفید ہونے کا موقع ملنا چاہیے، جب یہ مدت پوری ہوگئی تو میں نے ان سے ایک میقات کی توسیع کے لیے رضامندی چاہی، مگر انہوں نے منع کر دیا، ایسے حالات میں جہاں ریشہ دوانیوں کے ذریعہ ان کی غیرت کو ہدف بنانے کی کوشش کی جارہی ہو، وہاں رہنا ان کی غیور طبیعت گوارا نہیں کرسکتی تھی، اس طرح وہ وظیفہ یاب ہو کر ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔

حکیم محمد طیب۔ یونانی طب کی ایک عبقری شخصیت

پروفیسر اقتدار الحسن زیدی
سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ

حکیم محمد طیب کا شمار ہندوستان میں طبِ یونانی کی اہم شخصیات میں تھا۔ ۲۷/ رجب ۱۴۳۴ھ مطابق ۵/جون ۲۰۱۳ء کی شب میں ان کے انتقال سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا، ان کی پیدائش جنوری ۱۹۳۲ء میں اتر پردیش کے بارہ بنکی شہر میں ہوئی۔ ان کے والد ماجد وہاں کچہری میں ملازم تھے، وہ اپنی دیانت داری کے لیے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ حکیم طیب کو دیانت داری اور ایمان داری کے اوصاف اپنے بزرگوں سے ورثہ میں ملے تھے۔ ابتدائی تعلیم وطنِ مالوف میں حاصل کرنے کے بعد طب کی تعلیم کے لیے انہوں نے لکھنؤ میں داخلہ لیا، لیکن اس کی تکمیل اجمل خاں طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے کی۔ یہاں شفاء الملک حکیم عبد اللطیف کی نگاہِ مردم شناس نے ان کے جوہر کو پہچان لیا۔ چنانچہ انہوں نے طبیہ کالج میں تدریس کے لیے اپنے جن تلامذہ کو چُنا اوران کی تربیت کی اور آگے بڑھایا، حکیم طیب صاحب ان میں سے ایک تھے۔ طبیہ کالج میں ۱۹۵۴ء میں ان کا بحیثیت لکچرر تقرر ہوا۔ دورانِ ملازمت انہوں نے پروفیسر نذیر احمد کی نگرانی میں یوسف بن محمد یوسفی کے علمی کاموں کے جائزہ کے موضوع پر مقالہ لکھ کر فارسی زبان وادب میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی حاصل کی۔ موجودہ دور میں حکیم طیب صاحب یونانی طب کی ایک عبقری شخصیت تھے۔ ان کی ذات کئی ایسی اعلیٰ صفات

کا مجموعہ تھی جو انفرادی طور پر بھی کسی کو امتیاز و افتخار عطا کرنے کے لیے کافی تھیں۔ میں نے اجمل خاں طبیہ کالج میں جب طالب علم کی حیثیت سے قدم رکھا تو وہ معالجات میں ریڈر تھے، ان کا شمار کالج کے نہایت باصلاحیت سینئر اساتذہ اور حاذق اطباء میں تھا۔ ان کی شخصیت کا رعب ایسا تھا کہ بہت کم طلبہ ان سے قریب ہو پاتے تھے، اس کے باوجود طلبہ ان کے علمی تبحر اور ڈسپلن کے ہمیشہ معترف رہے۔

اس وقت طبیہ کالج کے وہ اساتذہ جن کا اندازِ تدریس طلبہ کے لیے سب سے زیادہ متاثر کن تھا، حکیم طیب ان میں سرفہرست تھے، وہ عام روش سے ہٹ کر لیکچر دیا کرتے تھے۔ اس وقت عام طور پر درس کا طریقہ یہ تھا کہ کوئی ایک طالب علم، کتاب سے عبارت کے ایک یا دو جملے کی قرأت کرتا تھا، جس کی ضروری تشریح استاذ کر دیا کرتا، جبکہ لیکچر کی صورت میں پڑھانے کا طریقہ طلبہ کو زیادہ دلچسپ لگتا تھا۔ حکیم صاحب اس وقت بی یو ایم ایس سالِ سوئم کے طلبہ کو معالجات امراضِ بطن پڑھایا کرتے تھے۔ ان کی کلاس بالعموم آٹھویں گھنٹہ میں ہوا کرتی تھی۔ اس وقت تک ناشتہ کی دو مٹری اور آدھا ٹکیہ مکھن کی طاقت جواب دے چکی ہوتی تھی اور طلبہ کا دماغ دوپہر کے کھانے میں لگا ہوتا تھا، لیکن جس دن طیب صاحب کی کلاس ہوتی تھی اس دن ساری توجہ ان کے لیکچر پر ہوتی تھی۔ یہ انتظارِ شوق اور ان کے لیکچر میں طلبہ کا انہماک، ان کے رعب وجلال سے زیادہ ان کے طرزِ تدریس کے اعجاز کا مظہر تھا۔ طیب صاحب ڈسپلن کی سخت پابندی چاہتے تھے، چنانچہ دورانِ درس کسی طالب علم کی توجہ میں ذرا بھی کمی پاتے تو فرمایا کرتے کہ تم کلاس میں دلچسپی نہیں لوگے تو کیا میں گھاس کاٹوں گا۔ یہ بھی ان کے طرزِ تدریس کی خوبی تھی کہ جب وہ علم الادویہ میں پروفیسر بنائے گئے تو مفردات بھی انھوں نے اپنے اسی منفرد انداز میں پڑھائی، جس کے لیے وہ جانے جاتے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی انھوں نے طلبہ کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ دورانِ درس ایسے ایسے نکات بیان کرتے تھے جو صرف ان کے تحقیق رساذہن کی ہی دین ہو سکتے تھے۔

حکیم عبدالرزاق مرحوم، حکیم طیب صاحب اور حکیم سید خلیفة اللہ صاحب کے درمیان طبی معاملات اور مسائل کے سلسلہ میں کافی ذہنی ہم آہنگی تھی، جس کا طبی دنیا کو خاطر خواہ فائدہ ہوا۔

حکیم عبدالرزاق مرحوم حکومتِ ہند کی وزارتِ صحت میں جب نائب مشیر برائے طب یونانی مقرر ہوئے تو انہوں نے حکیم طیب صاحب کی ناز برداری کر کے ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا۔ مرکزی کونسل برائے تحقیق طب یونانی کی سائنٹیفک ایڈوائزری کمیٹی کے طیب صاحب عرصہ تک ممبر اور بعد میں اس کے چیرمین رہے، انہوں نے کونسل کے تحقیقی کاموں کو سائنسی نہج عطا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ طب یونانی کے بارے میں طیب صاحب کا موقف اطباء کی عام سوچ سے ہٹ کر تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ طب کی بقاء اس میں ہے کہ اس کو سائنسی بنیادوں پر کھڑا کیا جائے، تبھی اس نظامِ طب کو زیادہ بہتر طریقہ پر سائنسی بنیاد فراہم کی جاسکتی ہے اس لیے کہ یہ طب اپنے اصولوں کے اعتبار سے پہلے سے سائنٹیفک ہے، اس کو صرف منطق کی جگہ سائنسی استدلال کی ضرورت ہے۔

حکیم طیب صاحب کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے یونیورسٹی انتظامیہ نے غالباً ۱۹۷۳ء میں ان کو طبیہ کالج کا پرنسپل مقرر کیا۔ یونیورسٹی کا یہ فیصلہ طبیہ کالج کے لیے نیک فال ثابت ہوا۔ پروفیسر حکیم عبدالحسیب کے انتقال سے علم الادویہ میں پروفیسر کی جگہ عرصہ تک خالی رہی، جس پر بعد میں طیب صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ طیب صاحب مزاجاً طبیب تھے، اس لیے تدریسی فرائض اور تنظیمی امور کے ساتھ مطب و معالجہ سے بدستور ان کا تعلق جاری رہا، حالانکہ پرنسپل کے عہدہ پر تقرری کے ساتھ استاذ معالجات کی حیثیت سے ان کا ہاسپٹل کی او پی ڈی کرنے کا استحقاق ختم ہو جانے پر اعدا نے سمجھا کہ اب مطب سے ان کا رشتہ ختم ہو جائے گا، مگر سب نے دیکھا کہ مطب کا یہ سلسلہ حسب سابق جاری رہا اور ہاسپٹل کے عقبی حصہ میں وہ اپنے کمرہ میں مریضوں کو دیکھتے رہے۔ ہر چند کہ اب مریضوں کو ضابطہ کے مطابق ان کے نسخہ پر اسپتال سے مفت دوا کی سہولت نہیں تھی، مگر مریض ان سے مشورہ کو اس سہولت پر ترجیح دیتے تھے۔ مطب کا ان کا یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری رہا جب وہ شعبۂ علم الادویہ میں منتقل ہو گئے۔ شروع میں وہ اطبائے لکھنؤ کے طرز پر مفردات سے علاج کو پسند کرتے تھے اور ان کے نسخے بہت کم دواؤں پر مشتمل ہوتے تھے۔ بعد میں ان کا یہ انداز بدل گیا تھا اور مرکبات لکھنے لگے تھے۔

اس کا اصل محرک کیا رہا؟ اس پر کبھی کوئی بات ان سے نہیں ہوئی، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ مریضوں کی سہل پسندی کا اس میں بڑا دخل رہا ہوگا۔

یونانی فیکلٹی کے قیام پر اس کے اولین ڈین کی حیثیت سے حکیم صاحب نے اپنی کارکردگی کی نمایاں چھاپ چھوڑی۔ اساتذہ کے تقرر میں صلاحیت کا معیار ہمیشہ ان کی ترجیح ہوا کرتا تھا۔ جب تک وہ یونیورسٹی کے انتظامی عہدوں پر رہے، ہمیشہ ان کی دیانت داری اور ایمانداری کا شہرہ رہا، ان کے بدترمخالفین بھی ان کی اس خوبی کے دل سے قائل رہے۔

حکیم طیب یونانی طب کے قوانین اور اصول وضوابط کی روشنی میں علاج کرتے تھے، اس کے باوصف وہ مرض کی تشخیص میں نہ صرف موجودہ ذرائع سے مدد لینے کے قائل تھے، بلکہ امراض کے بارے میں جدید ترین معلومات سے اپنے آپ کو کما حقہٗ واقف بھی رکھتے تھے۔ معالجین بالعموم اطباء اپنے فن کے تئیں بے جا تعصب کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اپنے طریقۂ علاج کی حدود کا اعتراف آسانی سے نہیں کرتے۔ حکیم صاحب کا عمل اس معاملہ میں بھی اس عام روش سے ہٹ کر تھا، وہ اپنے فن کے تعلق سے بے حد سنجیدہ تھے اور اس کی وکالت نہایت مضبوطی کے ساتھ کرتے تھے، مگر مریض کے معاملہ میں ان کی اولین ترجیح مریض اور اس کی صحت کی بحالی رہتی تھی۔ اس کا اظہار اکثر اس وقت ہوا کرتا جب کوئی مریض ان سے کسی ایسے مرض کے علاج کے لیے رجوع کرتا، جس کا علاج ان کی نظر میں کسی دوسرے طبی نظام سے بہتر طریقہ پر ہو سکتا ہو، طیب صاحب کا ایسے مریض کو یہی مشورہ ہوتا کہ وہ علاج کے لیے دوسرے نظام کے طبیب سے رابطہ کرے۔ ان کو جس طرح اپنے نظام طب کی حدود معلوم تھیں اسی طرح وہ اس کی USP سے بھی بخوبی واقف تھے، ایسے مریض جن کا علاج یونانی طریقہ سے بہتر طور پر ہو سکتا تھا، جب وہ دوسرے طریقۂ علاج کو آزمانے کے بعد ان سے رجوع کرتے تو ان کو حکیم صاحب کا یہ جملہ اکثر سننے کو ملتا کہ اب تک کہاں بھٹک رہے تھے؟ پہلے کیوں نہیں آئے؟۔

حکیم طیب صاحب ڈسپلن کے بے حد پابند تھے، اس لیے دوسروں سے وہ یہی توقع رکھتے تھے، مریضوں سے بے حد تعلق کے باوجود وہ ان کی کسی بھی ڈسپلن شکنی کو برداشت نہیں

کر سکتے تھے، وہ مریضوں سے بھی ڈسپلن کی پابندی چاہتے تھے۔اس ضابطہ کی پابندی ان مریضوں پر شاق گذرتی تھی جو علاج کے سلسلہ میں حکیم صاحب سے خصوصی رعایت کی توقع میں مطب کے اوقات کے علاوہ مشورہ کے خواہاں ہوتے تھے۔ مریضوں سے تمام تر ہمدردی کے باوجود وہ معالج کی پرائیویسی اور اوقاتِ استراحت کے احترام کی پاس داری کے قائل تھے۔

''نیکی کر دریا میں ڈال''-اس مقولہ پر اگر کسی کو عمل کرتے دیکھا تو وہ طیب صاحب تھے۔احسان کر کے اسے بھول جانا ان کے مزاج کی ایک بڑی خصوصیت تھی، اگر کوئی اظہارِ ممنونیت کے لیے ان کے پاس حاضر ہوتا تو وہ اسے پسند نہیں کرتے۔ مجھ پر بھی ان کی عنایتیں رہیں۔ غالباً ۱۹۸۳ء کے دسمبر کی بات ہے۔ایک انٹرویو کے سلسلے میں حیدر آباد گیا ہوا تھا، اسی دوران مرکزی وزیر برائے صحت و خاندانی بہبود کے ہاتھوں وہاں سنٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد کی تقریب تھی، جس میں شرکت کے لیے حکیم صاحب حیدر آباد میں تھے۔ مجھ پر نظر پڑی تو ایک آدمی بھیج کر مجھے پاس بلوایا۔ پوچھا یہاں کیسے؟ عرض کیا کل SRF کے لیے انٹرویو ہے۔ دوسرا سوال کیا " کیا یہ نوکری کرو گے؟" عرض کیا سر! ایم ڈی کرنے کے بعد سرِ دست میرے پاس کوئی جاب نہیں ہے، اس وقت جو بھی موقع ملے گا اس کو غنیمت سمجھوں گا۔''تو پھر میں کہہ دوں؟''۔ میں نے عرض کیا کہ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ مجھے نہیں معلوم انہوں نے کس سے کہا اور کیا کہا، البتہ اگلے دن حکیم سید خلیفۃ اللہ صاحب اور طبیبہ اُم الفضل صاحبہ کے سامنے انٹرویو ہوا اور کچھ دن بعد تقرر نامہ مل گیا۔ میں طیب صاحب کے مزاج سے واقف تھا، اس لیے کبھی میری ہمت ان سے کچھ پوچھنے کی ہوئی اور نہ کبھی انہوں نے اظہار کیا۔

کم آمیزی اور بے نیازی کے ان کے مزاج نے، ان کی شخصیت کے اطراف ایک حصار بنا دیا تھا، حکیم صاحب کے اس مزاج کا، ان کے حاسدین نے خوب فائدہ اٹھایا۔ خداداد صلاحیتوں کی حامل شخصیتوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کم صلاحیتوں کے حامل طالع آزما رفقاء حسد کا شکار ہو کر ان کو اپنی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا شکار بنانے لگتے ہیں۔ ایسے میں بے نیازی اور کم آمیزی سے حاسدین کو اپنے منصوبوں کو انجام دینے میں بہت مدد

ملتی ہے۔ حکیم طیب صاحب کے بعض شاگرد، جوان کے رفقاء کار میں شامل تھے، ان کی علمی قابلیت اور گوناگوں صلاحیتوں کے سبب ان سے حسد کرنے لگے تھے اور انہوں نے حکیم صاحب کے اس مزاج کا خوب فائدہ اٹھایا اور طلبہ کو آلۂ کار بنا کر ان کے خلاف خوب سازشیں رچیں، طیب صاحب کی پرنسپلی کے زمانہ میں ان کے حاسدین نے ان کے خلاف طلبہ کو اُکسانے اور انہیں اپنے مفادات کے لیے جس طرح استعمال کیا وہ اس کی واضح مثال ہے۔ ۱۹۷۶ء کے اگست میں کسی وقت حکیم صاحب کے دفتر میں میرا اپنی انٹرن شپ کی بابت کسی کام سے جانا ہوا۔ طیب صاحب نے مجھے دیکھا تو تقریباً ڈانٹتے ہوئے فرمایا کہ تم لوگوں کو کچھ معلوم بھی ہے، فارسی میں اسپتال کے لیے بیمارستان کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہی لفظ ایران میں رائج ہے۔ دراصل طبیہ کالج اسپتال میں ان ہی دنوں نیا سائن بورڈ لگایا گیا تھا، جس پر اسپتال کے لیے اردو میں 'بیمارستان' کا لفظ استعمال ہوا تھا۔ طلبہ کا ایک گروہ اس کو لے کر احتجاج کر رہا تھا۔ میں اپنی انٹرن شپ جوائن کرنے کے اگلے دن خورجہ چلا گیا۔ ''بیمارستان'' کا بورڈ اس دوران کب بدل گیا؟ نہیں کہہ سکتا۔

میرے ساتھ حکیم صاحب کا رویہ بے حد مشفقانہ تھا، جب میں نے اپنی کتاب 'منافع الاعضاء: غذا، ہضم، استحالہ و اخراج' پیش لفظ کی درخواست کے ساتھ ان کی خدمت میں پیش کی تو اس کو قدرے تأمل سے قبول کر لیا۔ ان کا پیش لفظ میری اس کتاب کی توقیر میں اضافہ کر رہا ہے اور اس کا اصل قلمی نسخہ میرے پاس بطور یادگار محفوظ ہے۔ جب میں نے اپنی کتاب 'علم المزاج' (Temperamentology) ان کی خدمت میں پیش کی تو اسے انہوں نے بلا تبصرہ شرفِ قبولیت بخشا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ جب تک کتاب کا مطالعہ نہ کر لیا جائے اس پر کسی قسم کا اظہارِ خیال احتیاط اور دیانت کے منافی ہے، لیکن اس کی تلافی جس انداز سے ہوئی وہ ضرور حیران کرنے والی ہے۔ اپریل ۲۰۰۱ء میں منافع الاعضاء کی پہلی نیشنل کانفرنس کے اختتامی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے نہ صرف انہوں نے اس پر اپنی رائے کا اظہار کیا، بلکہ احقر کی اس کاوش کی تحسین بھی کی۔ حکیم صاحب سے مبالغہ آمیز تعریف کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

طیب صاحب میں ایک مومنانہ صفت یہ تھی کہ ان کی اپنی زندگی بے حد سادہ تھی، وہ نہ اسراف کرتے تھے اور نہ کارِ خیر میں بخل سے کام لیتے تھے۔ البتہ یہ ضرور تھا کہ خرچ کرنے سے پہلے مصرف کے صحیح ہونے کی تحقیق ضرور کرتے تھے۔ علی گڑھ میں سول لائن میں واقع دودپور کے مغربی حصہ کی ایک آبادی میں مسجد کی ضرورت کا جب ان کو علم ہوا تو اس کی تعمیر میں انہوں نے خوش دلی اور مسرت کے ساتھ بھرپور حصہ لیا۔ جن اداروں کے بارے میں ان کو شرحِ صدر ہو جاتا، ان کی کھلے دل سے اعانت فرمایا کرتے تھے۔

اس حقیر نے سفرِ حج کے دوران ان کو قریب سے دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں مشہور ہیں جو ان کی شخصیت کے بالکل برعکس ہیں، ان کے بارے میں کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ وہ اپنی ذات کے علاوہ کسی دوسرے کی رعایت نہیں کرتے۔ جب کہ دورانِ سفر اپنے ہم سفروں کے بارے میں فکرمند ہوتے ہوئے ان کو خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ہمیں اس سفر میں مکہ مکرمہ پہنچنے میں کافی دیر ہو گئی تھی، جس کی وجہ سے ٹور کے ذمہ داروں نے یہ فیصلہ کیا کہ سرِ دست آرام کیا جائے اور عمرہ اگلے دن صبح کو ادا کیا جائے۔ ہم لوگوں کا خیال ہوا کہ عمرہ سے فارغ ہو کر ہی آرام کیا جائے تو زیادہ بہتر رہے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اس کے لیے رہنمائی کون کرے؟ خیال آیا کہ حکیم صاحب اس سے پہلے بھی عمرہ کی سعادت سے سرفراز ہو چکے ہیں، کیوں نا اس کے لیے ان سے درخواست کی جائے؟ جب ہم نے ان سے اس خواہش کا اظہار کیا تو وہ بخوشی آمادہ ہو گئے، اس طرح ہم نے پہلا عمرہ حکیم صاحب کی رہنمائی میں ادا کرنے کی سعادت حاصل کی۔

طیب صاحب کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کی شخصیت منافقت سے بہت دور تھی ۔ حالانکہ علی گڑھ کی فضا اس وبا سے مسموم ہے۔ طیب صاحب جو مناسب سمجھتے تھے اس کے برملا اظہار میں ان کو کوئی تأمل نہیں ہوتا تھا۔ اس کی وجہ سے بسا اوقات ان کے نہایت قریبی لوگ بھی شاکی ہو جاتے تھے۔ مدراس میں حکیم سید خلیفۃ اللہ نے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا تھا، جس میں طیب صاحب بھی شریک تھے، ان کے ساتھ ڈائس پر پروفیسر اخلاق الرحمان قدوائی

بھی تشریف رکھتے تھے، جو اس وقت حکومتِ ہند کی یونانی کمیٹی کے سربراہ تھے۔ جب حکیم طیب صاحب کو بولنے کے لیے مدعو کیا گیا تو انہوں نے طب یونانی کے بارے میں دوٹوک باتیں کہیں اور اس کا بالکل اثر نہیں لیا کہ ان کے خیالات قدوائی صاحب کو کس حد تک قابلِ قبول ہوں گے یا کانفرنس کے میزبان حکیم خلیفۃ اللہ پر کیا گزرے گی۔ بسا اوقات حکیم صاحب کو اپنی صاف گوئی کے لیے بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور کئی بار ایسے مناصب سے ہاتھ دھونا پڑا، جن کو حاصل کرنے کے لیے لوگ ہر طرح کا سمجھوتا کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ طیب صاحب کے پاس علم الادویہ میں پروفیسر بننے کے بعد پرنسپل طبیہ کالج کا اضافی چارج تھا، بحیثیت پرنسپل وہ یونیورسٹی ایکزیکیٹو کونسل کے ممبر بھی تھے۔ کسی بات پر ان کی رائے یونیورسٹی انتظامیہ کو پسند نہیں آئی، چنانچہ اس نے فیصلہ لیا کہ اس منصب کے لیے فوراً باضابطہ تقرری کا عمل شروع کیا جائے، اس پر باضابطہ تقرر کے بعد حکیم طیب صاحب کو کالج کی پرنسپل شپ اور یونیورسٹی مجلس منتظمہ کی ممبری گنوا کر راست گوئی کی قیمت چکانی پڑی۔ یونیورسٹی انتظامیہ نے یہ فیصلہ منفی جذبوں کے تحت لیا تھا، ہماری مادرِ درس گاہ ایسے بہت سے منفی فیصلوں کی بھاری قیمت ادا کرنے کے عذاب سے عرصہ سے گذر رہی ہے۔ مخلصینِ ادارہ کو خصوصی دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ایسے فیصلوں سے اس ادارے کو محفوظ رکھے۔

حکیم طیب صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور اپنے پیچھے طبِ یونانی اور طبیہ کالج کی زریں خدمات کا ایک روشن باب چھوڑ گئے۔ زندہ قومیں اپنے محسنین کی یاد تازہ رکھنے کے لیے ان کی یادگاریں قائم کرتی ہیں، اس سے رخصت ہونے والے کو تو کوئی فائدہ نہیں ہوتا البتہ قوم کی احسان شناسی کا اظہار ضرور ہوتا ہے۔ اگر یونیورسٹی انتظامیہ ان کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں کوئی یادگار قائم کرتی ہے تو اس کا یہ اقدام طیب صاحب کی اعلیٰ خدمات کی بہترین تحسین ہوگا۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ طبیہ کالج کی اکیڈمک بلاک کے پاس زیرِ تعمیر عمارت کو حکیم طیب صاحب کے نام سے منسوب کر دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ طیب صاحب کی مغفرت فرمائے اور ان کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!

حکیم محمد طیب صاحب

پروفیسر تاج الدین

سابق ڈین، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ

جب بھی مشاہیرِ علی گڑھ کی بات ہوگی، اس وقت ایک صاحبِ منزلت شخصیت، فائق استاذ اور نامور حاذق طبیب حکیم طیب صاحب ضرور یاد آئیں گے، وہ ایسی منفرد شخصیت کے مالک تھے جس نے حاملینِ طب کی آئندہ نسلوں کو متاثر کیا ہے۔

حکیم صاحب بارہ بنکی کے ایک متوسط اور صحیح النسب صدیقی گھرانے میں پیدا ہوئے، ان کی ابتدائی تعلیم بھی وہیں ہوئی، انہوں نے طب کی تعلیم علی گڑھ سے حاصل کی اور اپنے استاذ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کر کے فنِ طب میں لیاقت اور مہارت حاصل کی۔

علم و فن کی ہر قد آور شخصیت کی طرح طیب صاحب کی شخصیت بھی کئی جہات کی حامل تھی، بحیثیت ایک استاذ، بحیثیت ایک طبیب اور بحیثیت ایک منتظم (Administrator) وہ بہت نمایاں رہے۔ طب میں تدریس کو انہوں نے ایک نئی جہت دی، ان کے طریقۂ تدریس میں جدیدیت شامل تھی، کیونکہ وہ سائنسی فکر کے حامل تھے یہی وجہ ہے کہ طلبہ ان کے طریقۂ تدریس اور اندازِ تفہیم سے بہت مطمئن رہتے تھے اور ان کا یہ طریقہ خاص کر ان طلبہ کے لیے جو Science Stream سے طب پڑھنے آتے تھے بہت متاثر کن ہوا کرتا تھا، کیونکہ ان کے

لیے روایتی طریقۂ تعلیم زیادہ Appeal نہیں کرتا۔ وہ ہمیں ایم ڈی میں مفردات کا مضمون پڑھاتے تھے۔ گرچہ یہ مضمون ہم بی یو ایم ایس میں پڑھ چکے تھے، لیکن جب پوسٹ گریجویشن میں طیب صاحب نے اس مضمون کو پڑھانا شروع کیا تو اس سے دلچسپی بہت بڑھ گئی۔ ان کے پڑھانے کا طریقہ بالکل جداگانہ تھا، وہ ہر دوا کے بارے میں اس پر ہونے والی Scientific Studies کے پہلو بھی اُجاگر کرتے تھے، مزید برآں وہ ہر دوا کا Applied Aspect یعنی اطلاقی پہلو بھی بتاتے تھے اور اگر کسی دواء کی معالجاتی افادیت بحیثیت طبیب ان کے ذاتی مشاہدہ میں آئی ہوتی تو اسے بالتفصیل بتاتے تھے۔

وہ کلاس سے باہر جتنے سخت نظر آتے تھے، کلاس میں پڑھاتے وقت اتنے ہی پُر مزاح (Humorous) ہوجاتے۔ دورانِ درس مزاح سے لبریز برجستہ جملوں سے ان کا درس دلچسپ ہوجاتا تھا اور طلبہ اس سے لطف اندوز ہوتے تھے، کبھی کوئی طالب علم ان کے درس کے دوران بوریت کا شکار نہیں ہوتا، بلکہ ہمہ تن گوش ہوکر لکچر سنتا تھا، ان کے اس طریقۂ درس سے متاثر ہوکر راقم الحروف نے جب یونانی مفردات پڑھانا شروع کیا تو انہیں کے طریقہ کو مشعلِ راہ بنایا۔

ان کی شخصیت کا دوسرا پہلو بحیثیت ایک معالج تھا۔ کالج میں پرنسپل اور شعبۂ علم الادویہ میں پروفیسر ہونے سے پہلے وہ معالجات ڈیپارٹمنٹ میں ریڈر تھے، اس لیے وہ زندگی بھر ایک پریکٹسنگ معالج رہے اور بحیثیت معالج اپنی حذاقت کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے، وہ نہ صرف علی گڑھ، بلکہ ہندوستان بھر میں معروف تھے، اپنے ذوق کی تکمیل کے لیے طبیہ کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی انہوں نے مریض دیکھنے کا سلسلہ جاری رکھا، جس سے طب کا فیض عام ہوا۔

معالجہ میں ان کی خاص بات جدت پسندی تھی، وہ منقول نسخے لکھنے کے عادی نہ تھے، ہمیشہ مخترع نسخہ تجویز کرتے تھے۔ دواؤں کے محلِ استعمالات میں وہ Scientfic Approach رکھتے تھے اور اس ضمن میں وہ حقیقت پسند بھی تھے، جس مرض کا علاج یونانی میں ممکن نہیں ہوتا،

بڑی بے باکی سے دوسرے سسٹم میں دستیاب علاج سے رجوع کرنے کا مریض کو مشورہ دے دیتے تھے، بقول ایک جریدہ وہ اسپشٹ وادی تھے، معالجہ میں اپنی Marketing کرنا پسند نہیں کرتے تھے جیسا کہ آج کے دور کے اکثر اطباء کا معمول دیکھا گیا ہے۔

ایک لائق استاذ اور حاذق معالج کے ساتھ طبیب صاحب بہت اچھی انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے، ان کی انتظامی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب نے ان کے بارے میں ایک موقع پر کہا تھا کہ ''طبیب صاحب کی ایڈمنسٹریشن میں صلاحیت، یونیورسٹی میں اس زمرہ کے دوسرے افراد سے کسی طرح بھی کم نہیں ہے'' اور اس کی شاید دو وجوہ تھیں، ان کو انگریزی زبان پر دسترس تھی جو یونیورسٹی میں ایک دفتری زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور دوسرے معاملات میں دیانت داری۔

وہ ایک عرصہ تک CCRUM اور CCIM میں مختلف عہدوں پر متمکن رہے۔ CCIM میں ایجوکیشنل کمیٹی کے چیئرمین رہتے ہوئے انہوں نے UG اور PG کے نصاب میں Pragmatic انداز میں تبدیلیاں کیں، جو ان کی مثبت فکر کی علامت تھی۔ CCRUM میں Scientific Advisory Committee کے چیئرمین کی حیثیت سے سائنسی تحقیق کے جو خطوط انہوں نے متعین کیے، وہ آج تک وہاں رائج ہیں۔

طبیب صاحب فطرتاً ایک بذلہ سنج انسان تھے، سنجیدگی کے ساتھ مزاح سے لبریز جملے اپنی گفتگو میں بڑی برجستگی سے استعمال کرتے، کبھی کبھی کلاس میں بھی ان کے مزاح کے شرارے پھوٹنے لگتے تھے، جس سے طلبہ لطف اندوز ہوتے تھے، کبھی طنز بھی کرتے لیکن اس میں نشتریت بالکل نہ ہوتی تھی۔

ان کی زندگی کا سب سے زیادہ آزمائش کا دور شاید وہ تھا جب انہیں طبیہ کالج کی پرنسپل شپ سے استعفیٰ دینا پڑا تھا، لیکن بعد میں ان کی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے ان کو اس عہدہ پر دوبارہ فائز کیا گیا۔

مجھ سے حکیم طیب صاحب کا تعلق ایک استاذ، شاگرد کے علاوہ ایک محسن کا تھا،

جب میں نے بی یو ایم ایس سال اول میں طبیہ کالج میں داخلہ لیا تو وہ کالج کے پرنسپل تھے، ان دنوں پرنسپل آفس کے باہر لال اور ہری بتی جلا کرتی تھی اگر ریڈ لائٹ آن ہے تو اس کا مطلب تھا کہ کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں، حتی کہ اساتذہ کو بھی نہیں۔ گرین لائٹ آن ہونے پر اجازت لے کر اندر جایا جاسکتا تھا، اس طرح وہ طالب علموں کے لیے ایک بارعب شخصیت کے مالک پرنسپل نظر آتے تھے۔ میرا ان سے نزدیکی تعلق ایم ڈی کے دوران ہوا، وہ میری تھیسس کے سپروائزر تھے، اس حیثیت سے اکثر میں ان کے پاس حاضر ہوتا تھا۔ وہ وقت کے بہت پابند اور اس معاملہ میں بہت سخت تھے، ان کی جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی راست گوئی تھی، منافقت جو عام طور پر علی گڑھ برادری کی سرشت میں پنہاں ہے، ان کو چھو کر بھی نہیں گذری تھی، کالج میں دوسروں کے برخلاف کوئی گروپ انہوں نے منظم نہیں کیا بلکہ ہر مسئلہ سے خود ہی سینہ سپر ہو کر نبرد آزما ہوتے، جس پر احسان کیا اس سے کبھی کسی معاوضہ کے طالب نہیں ہوئے اور نہ کبھی اسے جتانے کی کوشش کی۔ ان کے دوست بہت کم تھے، لیکن جو بھی ان سے قریب تھے، ان سے نجی تعلق کا اظہار کرتے۔

ان کی شخصیت اس جملہ کا مصداق تھی ''شیشۂ دل میں جب بال آجائے تو جاتا نہیں''۔ اگر کسی سے اختلاف ہوتا تو اس کا برملا اظہار کرنے میں وہ تکلف نہ کرتے، ان کی اسی کمزوری کا فائدہ اٹھانے اکثر کچھ لوگ ان کے پاس سیاست کی بساط بچھانے پہنچتے تھے، جسے وہ بخوبی سمجھتے اور بعد میں کسی وقت ملاقات پر اس کا مجھ سے تذکرہ کر دیتے تھے۔

ان کی شخصیت کی ایک خاص بات کسی معاملہ پر Convince ہو جانا تھا، اگر کسی بات سے قائل ہو جاتے تو پھر اسے اپنے وقار کا مسئلہ نہ بناتے۔ کئی سال پہلے ہمدرد میں پروفیسرشپ کا انٹرویو تھا، میں نے ایک دوست کی مدد کی خاطر اس پوسٹ کے لیے درخواست دے رکھی تھی۔ وہ اس سلیکشن کمیٹی میں اکسپرٹ کی حیثیت سے مدعو تھے، انہوں نے لسٹ میں میرا نام دیکھا مگر وہاں موجود نہیں پایا تو علی گڑھ آنے پر خود مجھے ٹیلی فون کیا اور میری وہاں عدم موجودگی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کیا۔ میں نے اپنی معذوری ظاہر کی کہ ایک تو مجھے علی گڑھ چھوڑ کر

جانا پسند نہیں، دوسرے یہ درخواست کسی کی مدد کی غرض سے دی تھی، کیونکہ میرا خیال ہے کہ جو شخص جہاں کام کر رہا ہو، وہ وہیں پر پروموشن پانے کا اصلاً مستحق ہے، اس لیے میرا انٹرویو میں جانا مناسب نہ تھا اس دلیل سے وہ مطمئن ہوگئے تھے۔ یہ میرے لیے ان کی استاذانہ شفقت اور کرم گستری کی ایک مثال ہے۔

اپنے خاندانی پس منظر کی وجہ سے وہ ہمیشہ مذہبی افکار کے حامل رہے، لیکن عمر کے آخر میں مذہبی رجحان بہت زیادہ ہوگیا تھا۔ سبکدوشی کے بعد اپنے مطب پر انہوں نے کچھ دنوں کے لیے مریضوں سے فیس لینا شروع کر دیا تھا، اس بابت میرے استفسار پر کہا کہ صرف پنشن ہی میری ضروریات سے بہت زیادہ ہے، اس لیے جو فیس میں مریضوں سے لیتا ہوں اس کو کارِ خیر میں خرچ کر دیتا ہوں اور لیتا اس لیے ہوں کہ کوئی یونانی معالج کو سستا نہ سمجھے اور ہلکے میں نہ لے۔

انہیں ہمیشہ علم سے رغبت تھی اور زندگی بھر کثیر المطالعہ رہے، کئی لوگوں نے ان سے معالجات پر ایک کارآمد کتاب لکھنے کا اصرار کیا اور بطور خاص ان سے اپنے آزمودہ و مجرب معمولاتِ مطب نسخوں کو قلمبند کرنے کی فرمائش کی، لیکن ایسا نہ ہوسکا ورنہ طبی حلقے کو ان کے علم سے اور زیادہ مستفید ہونے کا موقع ملتا۔ شاید مطب میں منہمک رہنے کی وجہ سے وہ باقاعدگی سے قلم بکف نہ رہ سکے۔ طب میں تحقیق کے تعلق سے وہ کشادہ ذہن تھے اور طب کے علاوہ علومِ حاضرہ پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے اور طب کی ترقی و ترویج کے لیے سائنسی تحقیقات سے استفادہ کرنے کے قائل تھے، دوسرے قدامت پسند طبیبوں کے برخلاف وہ جدید اکتشافات سے بھی استفادہ کے حامی تھے۔ ان کا سانحۂ ارتحال طبی Fraternity کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ ایک دور تھا جو وہ اپنے ساتھ لے گئے۔ اس خلا کو پُر کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

حکیم محمد طیب

اپنی شرائط پر زندگی گزارنے والا ایک انسان

حکیم اشہر قدیر

صدر شعبۂ کلیات، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی

شخص سے شخصیت تک کا سفر بہت سے لوگ طے کرتے ہیں، مگر سب کے راستے یکساں نہیں ہوتے۔ اس منزل تک پہنچنے کی سب سے مشکل راہ وہ ہے، جہاں انسان اپنے اندر جوہرِ خود اعتمادی پیدا کر کے قوتِ عمل کے ذریعہ ارتقاء کی منازل طے کرتا ہے اور سب سے آسان راستہ یہ ہے کہ عیاری اور مکاری کے ذریعہ یہ منزل سر کرلی جائے، بلکہ راہِ عروج کے حصول کے لیے پست ترین مقامات سے بھی گریز نہ کیا جائے۔

حکیم محمد طیب نے اول الذکر راہ اختیار کی اور اپنی لیاقت، صلاحیت اور خود اعتمادی کے بل پر امتیاز حاصل کیا اور کبھی کسی مسئلہ پر حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا، اپنی شرائط پر زندگی گزاری اور یہی پیغام دے کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔

حکیم صاحب کی ذات باصفات کے دشمن بھی قائل تھے، اگر کہیں عداوت غالب آجاتی اور عدو آپ کے تئیں تنگ نظری کا معاملہ رکھتا تو خود ذلیل ہوتا۔ حکیم صاحب کو یہ اعزاز یوں ہی نہیں مل گیا تھا۔ ناقابلِ تسخیر فہم و فراست کے لیے ذہنی بالیدگی اور پختگی درکار ہے، جس کے لیے سر میں سودا رکھنا پڑتا ہے۔ جس کا سیدھا اثر دل پر ہوتا ہے اور طبیعت میں صلابت آجاتی ہے۔

حکیم صاحب نے یہ سب برداشت کیا۔ حتیٰ کہ ان پر مردم بیزاری کا الزام بھی آیا اور وہ کج مزاج بھی تصور کیے گئے۔ یہ وہ کیفیت ہے کہ جہاں قطع رحمی کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بتانا انتہائی مشکل ہے کہ ان کا کوئی ہمراز اور یارِ غار تھا کہ نہیں۔ ان باتوں سے بے پروا، وہ اپنے حصار میں قید رہے، جب زمانہ ان کے اس مزاج کا عادی ہو گیا تو خلوت پسندی ان پر زیب دینے لگی تھی۔

وہ انہی محفلوں میں نظر آتے تھے، جہاں انہیں بطور خاص مدعو کیا جاتا، اس کے باوجود ضروری نہیں تھا کہ وہ ہر دعوت نامہ قبول فرمالیں، وہ جہاں ہوتے اسٹیج کی زینت رہتے اور مرکزی حیثیت میں ہوتے۔ منتظمین ہمیشہ اس بات سے خائف رہتے کہ کہیں کوئی بات انہیں ناگوار نہ محسوس ہو۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی شیئر کرنا ان کو منظور نہ ہوتا، لانے لے جانے کے لیے گاڑی ہو یا ٹھہرنے کے لیے کوئی کمرہ، اس میں تنہا رہتے کبھی کسی کی ہمنوائی پسند نہ فرماتے، ان کے تمام نخرے اس لیے اٹھائے جاتے کہ ان کی آمد پروگرام کے وقار اور کامیابی کی ضامن ہوتی۔

ان کی شخصیت ہمہ جہت تھی، جس میں ادبیت کا عنصر غالب تھا، وہ چاہتے تو ادب میں نام کما سکتے تھے۔ ان کے ادبی کمال کی ایک جھلک ان کے مقالہ ''اردو زبان کے فروغ میں طب یونانی کی خدمات'' ہے، جسے ''طب یونانی اور اردو زبان وادب'' مرتبہ پروفیسر الطاف احمد اعظمی، مطبوعہ سنٹر فار ہسٹری آف میڈیسن اینڈ سائنس، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن خدا نے ان کو خدمتِ خلق کے لیے منتخب کیا تھا اس لیے انہوں نے طبابت کو اپنا میدانِ کار بنایا۔ بطور طبیب ان کی شانِ امتیاز کو ایک جملہ میں بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ذات سے طب کو بے حد فائدہ پہنچا، جبکہ اکثر اطبا نے طب سے فائدہ اٹھایا اور مقام کو پہنچے۔

حکیم طیب صاحب جو کچھ تھے اپنے دم پر تھے، اسی لیے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ بڑے سے بڑوں کو ہیچ گردانتے۔ کسی کی مجال نہ ہوتی کہ ان سے بے تکلف ہوتا۔ مگر قربان جایئے اللہ کی حکمتوں پر کہ اس نے مجھ جیسے ہیچمدان کو طیب صاحب کا قرب بخش دیا۔

یہ کیسے ہوا اس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

جولائی ۲۰۰۵ء میں آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کا اجلاسِ عام حیدر آباد میں منعقد ہوا تھا، جس میں شرکت کے لیے میں ۲۸؍ جولائی کو اے پی اکسپریس میں دہلی سے سوار ہوا۔ جب گاڑی آگرہ پہنچی تو دیکھا کہ پروفیسر ابوبکر خاں صاحب سامنے کھڑے ہیں۔ میں بھی ادباً کھڑا ہو گیا، دعا سلام ہوا۔ خاں صاحب کو شاید یہ پہلے سے علم تھا کہ میں سیکنڈ اے سی میں نیچے کی برتھ پر براجمان ہوں، اسی لیے وہ وہاں تشریف لائے تھے۔ مجھ سے بولے اشہر میاں! ہمارے ساتھ طیب صاحب بھی ہیں، ان کو اوپر کی سیٹ ملی ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمہاری سیٹ پر آ جائیں۔ میں نے فوراً ہاں کہا اور اس طرح میں طیب صاحب کا حیدر آباد تک ہم سفر ہو گیا۔

میں اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ جس ہستی کے ساتھ چند لمحوں کا قرب محال تھا اب اس کے ساتھ گھنٹوں سفر کی معیت ہو گی۔ ایک اور صاحب جو تنہا تھے اور اوپر کی سیٹ پر سونا چاہتے تھے وہ طیب صاحب کی برتھ پر چلے گئے تھے، اب میں اور حکیم صاحب آمنے سامنے کی برتھ پر تھے۔ میں طیب صاحب کے مزاج سے واقف تھا، اس لیے یہ جرأت نہ ہوئی کہ آپ سے ہم کلام ہوتا۔ تبھی آپ کی آواز ابھری ''اشہر میاں بھئی آپ نے مجھے نیچے کی سیٹ دے کر بڑی زحمت سے بچایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کا یہ قرض کیسے اتاروں''۔

ان کے یہ الفاظ ثابت کرتے ہیں کہ وہ ویسے نہیں تھے، جیسے تصور کیے جاتے تھے، بلکہ وہ قدروں کے انسان تھے۔ ان کے اخلاق کا ایک واضح نمونہ قیامِ حیدر آباد کے دوران بھی دیکھنے کو ملا۔

پروفیسر حکیم محمد طیب، پروفیسر نعیم احمد خاں، پروفیسر ابوبکر خاں، چند اور ساتھی اور میں ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ بات تو درست پائی گئی کہ طیب صاحب نے کسی کے ساتھ اپنا کمرہ شیئر نہیں کیا، اس لیے حیدر آباد پہنچ کر ان سے، سب کا ربط ختم ہو گیا۔ اگلے دن صبح کو طیب صاحب کا کمرہ بند تھا، وہ اندر ہیں یا باہر، کسی کو علم نہیں تھا۔ ان کے مزاج کے مطابق کسی نے دروازہ کھٹکھٹانا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ ان کے بغیر ہی سب لوگ ناشتہ کے لیے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ ہم سب ناشتہ کر ہی رہے تھے، تبھی طیب صاحب

بھی وہاں تشریف لے آئے۔ پروفیسر نعیم صاحب نے ان کو ناشتے پر مدعو کیا، اس پر انہوں نے فرمایا میاں میں تو صبح ہی ناشتے سے فارغ ہوگیا، اب تو میں سیر کر کے آ رہا ہوں، یہ تو میرے لنچ کا وقت ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ ہمارے درمیان بیٹھ گئے۔ انہوں نے کچھ کھایا تو نہیں لیکن جب چائے سامنے آئی تو بلا تکلف ایک کپ اٹھا لیا۔ سب سے پہلے چائے ختم کی اور بہت تیزی سے اٹھے اور کیش کاؤنٹر پر جا کر سب کا بل ادا کر دیا۔ پھر پلٹ کر آئے اور بولے ''بھئی یہ چائے تو بہت مہنگی پڑی، پتہ نہیں یہ علی گڑھ کی سینئرٹی کب پیچھا چھوڑے گی''۔ یہ تھا ان کا بڑکپن اور اچھی روایات کو نبھانے کا حوصلہ، جو اور کسی میں کہاں ملتا ہے۔

بات ریل کے سفر کی ہو رہی تھی۔ رات میں تو اور کچھ بات نہیں ہوئی، اگلے دن صبح جب گاڑی بھوپال پہنچی تو طیب صاحب نے ہی گفتگو شروع کی۔ سفر چیز ہی ایسی ہے جہاں بہت جلد تکلفات کی برف پگھل جاتی ہے۔ ابھی تقریباً بارہ گھنٹے کا سفر باقی تھا، میں نے موقع غنیمت جانا اور طیب صاحب سے یہ خواہش ظاہر کر دی کہ اگر اجازت دیں تو میں آپ کا انٹرویو کر لوں، تاکہ آپ کے بارے میں کچھ قیمتی معلومات حاصل ہو جائیں اور آپ کے ساتھ گزارا یہ وقت یادگار بن جائے۔ وہ یہ کہتے ہوئے رضامند ہو گئے کہ ''اگر اس طرح برتھ کی قیمت ادا ہو سکتی ہے تو سودا برا نہیں''۔ اس دن طیب صاحب کا جو انٹرویو میں نے نوٹ کیا تھا، یہاں پہلی بار منظر عام پر آ رہا ہے۔ یہ انٹرویو صبح سے شام تک وقفہ کے ساتھ تین قسطوں میں مکمل ہوا، خلاصہ درج ذیل ہے:

س: آپ کا پورا نام۔

ج: میرا ایک مختصر نام 'محمد طیب' ہی تھا اور ہے۔ البتہ لاحقے تبدیل ہوئے جیسے حکیم محمد طیب، پروفیسر محمد طیب۔

س: آپ کو کیا کہلوانا پسند ہے حکیم یا پروفیسر؟۔

ج: مجھے جو نام پسند ہے اس سے کوئی بلاتا ہی نہیں، صرف 'طیب'۔

س: آپ کا شجرہ، اگر یاد ہو؟۔

ج: والد کا نام حافظ محمد طاہر اور دادا کا نام حافظ محمد احمد تھا۔ میں ہی نالائق حفظِ قرآن سے محروم رہا، جس کا افسوس ہے۔

س: آپ کا سن ولادت اور مقام ولادت؟۔

ج: میرا وطن اتر پردیش کا مشہور خطہ بارہ بنکی ہے، جہاں میں نے ۱۹۳۲ء میں آنکھ کھولی۔

س: آپ کی تعلیم وتربیت کہاں ہوئی؟

ج: یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میرے خاندان میں دینی تعلیم مروج تھی، والد اور دادا صاحب دونوں حفاظ اور مدارس سے فارغ تھے۔ ظاہر ہے میرے لیے بھی یہی حکم صادر ہوا، مگر میں اسکول جانا چاہتا تھا۔ اس وقت اسکول بھیجنے کا رواج کم تھا، ویسے بھی اس وقت آزادی کے نگاڑے زور شور سے بج رہے تھے، اسکولوں کو فرنگی تربیت گاہ تسلیم کیا جاتا تھا، چنانچہ گھر والے میری اس خواہش کے خلاف تھے۔ مجھ میں اسکول جانے کی للک اپنے ماموں کی وجہ سے پیدا ہوئی، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ تھے اور گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی میں بائیولوجی کے استاذ تھے۔ ایک بار میں نے ماموں کو مینڈک پکڑتے دیکھا اور پوچھا اس کا کیا کریں گے؟۔ وہ مجھے اگلے دن اپنے اسکول لے گئے، کیا دیکھتا ہوں کہ ماموں مینڈک کو چھیڑ پھاڑ کر طلبہ کو کچھ سمجھا رہے ہیں۔ میں اس وقت تقریباً آٹھ سال کا تھا۔ مجھے اس میں بہت مزا آیا، بس اسی طرح کی پڑھائی لکھائی میری کھوپڑی میں سما گئی اور میں نے اسکول جانے کی ضد پکڑ لی۔ گھر میں بہت بوال مچا، ماموں پر بھی لعن طعن پڑی۔ مگر چونکہ ہمیں اماں کے بھائی کی پشت پناہی حاصل تھی، اس لیے ابا جلد ہی نرم پڑ گئے اور ماموں کی وجہ سے مجھے اسکول میں داخلہ مل گیا۔ دادا صاحب کو اس بات پر راضی کر لیا گیا کہ اسکول میں رہ کر بھی اردو، فارسی اور دین کی تعلیم میں کمی نہ آنے دی جائے گی۔

۱۹۴۷ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بارہ بنکی سے دسویں کا امتحان پاس کیا اور پہلی پوزیشن حاصل کرنے کی وجہ سے اسکالرشپ کا بھی مستحق قرار پایا۔ میں نے

سائنس کے مضامین کے ساتھ فارسی بطور پروویژنل سبجیکٹ لی تھی اور اس میں بھی امتیازی نمبر حاصل کیے تھے۔ میری کامیابی سے اقربا نے بھی فخر محسوس کیا اور مزید تعلیم کے لیے وطن سے ہجرت کی منظوری بھی دے دی، مزید تعلیم کے لیے میں لکھنؤ آ گیا۔

۱۹۴۷ء میں لکھنؤ کے جبلی انٹر کالج میں انٹرمیڈیٹ میں داخلہ مل گیا، یہاں صرف فرسٹ کلاس اسٹوڈنٹ ہی لیے جاتے تھے۔ ۱۹۴۹ء میں جیسے تیسے یہ کورس مکمل کیا، اس وقت تقسیمِ ہند کی وجہ سے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ ہمارا خاندان بھی بری طرح متاثر ہوا تھا۔ خاندان کے آدھے سے زیادہ لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ ہندوستان میں رہ جانے والا ہر مسلمان محفوظ مقام کی تلاش میں تھا، اس اعتبار سے لکھنؤ کے کچھ علاقے محفوظ سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ میں وہیں جما رہا۔ ۱۹۴۹ء میں لکھنؤ کے سعادت گنج میں ایک یونانی میڈیکل کالج تھا، جہاں ایڈمیشن لے لیا، لیکن وہاں کا معیارِ تعلیم پسند نہیں آیا، اس لیے یہاں سے ادھوری تعلیم چھوڑ کر علی گڑھ آ گیا، سعادت گنج کے یونانی کالج میں رہ کر اتنا سمجھ میں آ گیا تھا کہ طب کی تعلیم حاصل کر کے عزت کی دو روٹی مل جائے گی۔ چنانچہ علی گڑھ میں طبیہ کالج میں داخلہ لے لیا اور ۱۹۵۴ء میں BUTS کی ڈگری حاصل کی۔ میرٹ کی بنیاد پر مجھے چھ ماہ کے لیے ہسپتال میں ہاؤس جاب کرنے کا موقع بھی ملا، جس کے لیے ۲۵ روپے مشاہرہ ملا کرتا تھا۔

س: علی گڑھ میں آپ کے کیریئر کا آغاز کیسے ہوا؟

ج: بزرگوں سے کیے وعدہ کے مطابق میں نے اردو اور فارسی کی تعلیم سے غفلت نہیں برتی، جس کی وجہ سے ادب سے بھی وابستگی قائم رہی، بلکہ علی گڑھ میں قیام کے دوران یہ رجحان اور بڑھا، میری اردو فارسی کی تحریریں جو اس وقت کے مقامی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی تھیں، ڈاکٹر ذاکر حسین کی نظر سے بھی گزریں، جو اس وقت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ تھے، وہ مجھ سے متاثر تھے، انہوں نے طبیہ کالج کے پرنسپل حکیم عبداللطیف فلسفی کو ہدایت دی کہ اس لڑکے کو طبیہ کالج میں ہی کسی پوسٹ پر رکھ لیں۔

طبیہ کالج کی تاریخ میں ایسا پہلی بار ہوا کہ بلا کسی تدریسی تجربہ کے براہ راست لکچرر بنایا گیا، ورنہ اس سے قبل استاذ کی اوّل تقرّری بحیثیت ڈمانسٹریٹر ہوا کرتی تھی۔ تو جناب اس طرح مجھے طبّی درس وتدریس سے جڑنے کا موقع ملا۔ بحیثیت لکچرر میری پہلی تنخواہ ۲۱۰ روپے ماہانہ طے پائی تھی۔ یہ خیال رہے کہ اس تقرّری میں اہم رول اردو اور فارسی کی قابلیت کا رہا، طب وغیرہ کی معلومات تو بعد میں کام آئیں۔ تو بھائی ہم تو ان مادری زبانوں کے ہمیشہ ممنون رہیں گے کہ جو ہماری روٹی روزی کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

س: طبیہ کالج میں آپ نے کن کن عہدوں پر کام کیا؟۔

ج: ۱۹۵۴ء میں تو لکچرر بن گیا تھا۔ ۱۹۶۶ء میں شعبۂ معالجات میں ریڈر مقرر ہو گیا۔ ۱۹۷۳ء میں کالج کے پرنسپل ہونے کا اہل قرار پایا۔ یہ بات بھی میرے لیے فخر کا باعث ہے کہ میں ۱۹۷۹ء میں پروفیسر بنا دیا گیا۔ حالانکہ میں اس پوسٹ کے لیے اپلیکینٹ نہیں تھا۔ اس وقت کے نائب شیخ الجامعہ (PVC) پروفیسر محمد شفیع (جغرافیہ والے) نے وائس چانسلر پروفیسر خسرو سے مجھے ایک فنکشن میں متعارف کروایا تھا۔ خسرو صاحب نے مجھ میں نہ جانے کیا دیکھا کہ مجھے پروفیسر شپ کی پیش کش کردی۔ چنانچہ میں نے پروفیسر شپ جوائن کرلی۔ اس پوسٹ کے حق کو ادا کرنا میرا فرض تھا، اس لیے میں کالج میں پوسٹ گریجویٹ کورس لانے کے لیے کوشاں ہو گیا۔ اس کام میں کامیابی ملی اور ۱۹۷۲ء میں علم الادویہ میں پی جی کورس کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۵ء میں، میں اس شعبہ کا صدر مقرر رہا۔

اس زمانے تک میڈیکل کالج اور طبیہ کالج ایک ہی فیکلٹی کا حصہ تھے، اب تک فیکلٹی کا ڈین میڈیکل کالج کا پروفیسر ہوا کرتا تھا۔ اب چونکہ میری شکل میں طبیہ کالج میں بھی ایک پروفیسر پیدا ہو چکا تھا، اس لیے جب میرے ڈین بننے کا نمبر آیا تو اس بات کو میڈیکل کالج والوں نے ناک پر مکھی بیٹھنے کے مترادف سمجھا اور ان لوگوں نے کافی دوڑ دھوپ کے بعد میڈیکل فیکلٹی کو دو حصوں میں بنٹوا دیا، اس طرح طبیہ کالج کی صورت میں

یونانی کی فیکلٹی علیٰحدہ ہوگئی اور میں اس کا پہلا ڈین بنا، یہ واقعہ ۱۹۸۷ء کا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں اپنے ریٹائرمنٹ تک میں فیکلٹی کا دوبارڈین بنا۔

س: اپنی طبی تحریروں کے بارے میں بتلائیں؟۔

ج: ابتداءمیں نے جو کچھ لکھا وہ تولاپرواہی کی وجہ سے اِدھرادھر ہوگیا۔ بعد کا جو کچھ بچارہ گیا اس میں چند مقالات اور سات کے قریب کتابیں ہیں۔ یہ سب میں نے اپنی تسکینِ طبع کے لیے کیا، ورنہ آج تک ان سات کتابوں کو پڑھنے والے سات آدمی بھی نہ رہے ہوں گے۔

س: اپنی کتابوں میں سب سے عمدہ تالیف کے بارے میں بتائیں؟۔

ج: میرا پسندیدہ سبجکٹ معالجات ہے، مگر اصولِ علاج کے بغیر علاج کرنا کسی جرم سے کم نہیں۔ کلیات کا پڑھنا ایک الگ چیز ہے اور اس کا اطلاق کچھ اور چیز۔ اسباب وعلامات کے خطوط پر تدابیر کا اطلاق ہی معالجہ کی بنیاد ہے اور اسباب وعلامات پر گرفت مشاہدہ کے بغیر ممکن نہیں، ہر طبیب کے مشاہدہ کا طریقہ مختلف ہوتا ہے، اس لیے قدیم اطبا کے طریقۂ استدلال سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور اس کو ایک کتابی شکل بھی دی جو بعنوان 'اطبائے قدیم کے کلینکی مشاہدات' لائبریریز کی الماریوں میں پڑی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ میری کون سی کتاب سب سے بہتر ہے، تو اس کا فیصلہ کتاب لکھنے والا نہیں بلکہ پڑھنے والا کرتا ہے، آپ پڑھیں اور خود فیصلہ کریں۔

س: طب کے بنیادی مضامین تین ہیں، کلیات، علم الادویہ اور معالجات۔ آپ کی نظر میں اہم ترین سبجیکٹ کون سا ہے؟

ج: میری نظر میں طب کے بنیادی یونٹس دو ہیں کلیات اور علم الادویہ۔ کلیات میں اسباب وعلامات سے بحث ہوتی ہے، جس پر تشخیص کا انحصار ہے اور تجویز میں بیشتر رول علم الادویہ کا ہے، اس لیے جس نے کلیات اور علم الادویہ پر محنت کی، اس نے گویا معالجات کو مضبوط کرلیا۔ جو طبیب صرف معالجات پر توجہ دیتا ہے وہ اس میدان میں محض تقلیدی خطوط

کا پابند رہتا ہے، اس سے کسی نئے تجربہ کی امید نہیں کی جاسکتی، جس کی حاجت ہر اس کیس میں رہتی ہے، جہاں روایتی نسخوں کا استعمال لاحاصل ہوتا ہے۔

س: آج کے زمانے میں طب یونانی کی افادیت کس قدر ہے؟۔

ج: طبِ یونانی ہی کیا، بلکہ ہر علم وفن کی قدر ومنزلت وقت اور زمانہ کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔طبِ یونانی جس وقت کی دین ہے، اُس زمانے کا شاید ہی کوئی اور فن آج تک باقی ہو۔طبِ یونانی انسانی ضرورت اور اپنی افادیت کی بناپر آج تک زندہ ہے۔ یہ نہ صرف خودکارآمد ہے، بلکہ ہمیں بھی کسی قابل بنائے ہوئے ہے، سچ کہوں تو آج کے اطبا نے اس کے لیے کچھ نہیں کیا۔ چونکہ کچھ بیماریوں کے علاج میں آج بھی ماڈرن میڈیسن غیر موثر ہے اور سلیقے سے استعمال کرنے پر کچھ قدیم نسخے کام کرجاتے ہیں، اس لیے اس کی قدر ہے۔

س: آپ کی نظر میں وہ کون سے امراض ہیں، جہاں طبِ یونانی بطور خاص کارگر ہے؟۔

ج: جہاں کہیں بھی جسم کے تغذیہ اور تنمیہ میں حائل نقائص کو دور کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، طب کا پرچم بلند رہتا ہے۔اس اعتبار سے معدہ، امعاء، جگر کے امراض۔ امراضِ قلب میں اختلاج اور خفقان۔ امراض راس میں صرع، صداع اور نسیان۔ امراضِ اعصاب میں عرق النساء، خدر اور رعشہ۔ امراض النساء میں عسرتِ طمث، ایک حد تک عقر، سیلان الرحم اور قلتِ لبن۔ امراضِ مرداں میں ضعفِ باہ، جریان اور احتلام۔ امراض گردہ میں حصاۃ الکلیہ اور ضعف الکلیہ۔ جلد اور بالوں کے بیشتر امراض۔ امراضِ مفاصل میں حدار اور نقرس۔ یہ وہ امراض ہیں جو میرے تجربہ میں ہیں، جہاں سنجیدگی سے علاج کرنے پر طبِ یونانی باعثِ شفاء ہوتی ہے۔

س: ایمرجنسی ٹریٹمنٹ میں ایک یونانی طبیب کا کیا رول ہے؟۔

ج: اگر بقراط، جالینوس اور ابن سینا جیسے اطباء بھی آج دوبارہ جنم لے لیں تو ایمرجنسی وارڈ میں فیل ہوجائیں گے۔اس کام کے لیے آج ہر جگہ ڈاکٹر موجود ہیں، یہ کام انہیں کے

ہاتھ میں رہنے دیں، ہمیں اس میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔

س: میں آپ کے تجربہ سے فیض اٹھانے کے واسطے جاننا چاہتا ہوں کہ بعض ضعفِ باہ کے مریض گھوڑے پر سوار ہوکر آتے ہیں اور طبیب سے اصرار کرتے ہیں کہ چند روز بعد ان کی شادی ہے، کوئی جادو کی چھڑی ایسی گھما دیجئے کہ دو دن میں وظیفۂ زوجیت صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہو جائیں، تو کیا یونانی میں کوئی ایسا جادوئی نسخہ ہے؟۔

ج: یہ سب جہالت پر مبنی اور اشتہاری نیم حکیموں کے ذریعہ پھیلائی ہوئی بکواس ہے۔ میری نظر میں کوئی دوا ایسی نہیں ہے جو دو دن میں جلوہ دکھا دے۔ ضعفِ باہ کا باقاعدہ اصولِ علاج ہے، جس کے لیے ایک مدت درکار ہے۔

س: آج یونانی ادویہ کی عدم دستیابی ایک بڑا مسئلہ ہے، جس کی وجہ سے اطباء یونانی پریکٹس نہیں کر پاتے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

ج: نمود و نیست کا سلسلہ دواؤں کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے۔ دواؤں کا غائب ہونا آج کا مسئلہ نہیں اور نہ ہی یہ اتنا پیچیدہ ہے، جتنا بنا لیا گیا ہے۔ اگر ہمیں کلیاتِ ادویہ اور مفردات، دونوں کا گہرا علم ہو تو حل نکل آئے گا۔ اطبا نے اسی راہ سے نادر و ناپید دواؤں کے متبادل تلاش کیے۔ مثلاً اگر موتی دستیاب نہیں ہے تو صدف سے کام چلتا ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کسی دوا کا ہو بہو بدل کوئی دوسری دوا نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے خمیرہ مروارید اور خمیرہ صدف کی نوعیتِ عمل میں فرق ہے، لیکن یہ دونوں دوائیں ایک دوسرے کا قریب ترین بدل ہیں۔ خیال رہے کسی دوا کا بدل تلاش کرنا ہر کسی کے بس کی بات بھی نہیں۔ آج ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ اہم کام بھی فارما کوپیا کمیٹی کے زیر نگرانی ہو۔ اگر آج ادویہ کی معیار بندی اہم کام ہے تو اس کے بعد دوسرا اہم کام ادویہ کے متبادل تلاش کرنا ہے۔

س: آپ مفردات اور مرکبات میں سے کیا تجویز کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں؟۔

ج: اس میں پسند ناپسند کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اگر طبیب کی علم الادویہ پر گرفت ہے تو

مفردات سے علاج کرے گا اور اگر ایسا نہیں ہے تو مرکبات کا استعمال اس کی مجبوری ہے۔

س: آپ کا شمار ممتاز معالجین میں ہوتا ہے اور ایسا خیال ہے کہ ایک ممتاز یونانی معالج کا طرّۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ محض نبض دیکھ کر تشخیصِ کامل پر قدرت رکھتا ہو۔ کیا یہ صحیح ہے؟۔

ج: ایسا کبھی ہوتا رہا ہوگا، آج اگر کوئی طبیب تشخیص کے جدید طریقے میسر ہونے کے باوجود صرف نبض سے تشخیص کرتا ہے تو وہ گویا آنکھیں ہوتے ہوئے بھی آنکھ بند کر کے ہاتھ سے ٹٹول کر کچھ پانے کی کوشش میں لگا ہے۔ یہ حذاقت نہیں حماقت ہے۔ تشخیص کے نئے ذرائع کا استعمال کسی طور ممنوع نہیں ہے۔ البتہ نبض سے بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے، مگر اس پر کلّی انحصار نہ کیا جائے۔

س: میں نے آپ کی طبّی اور کچھ ادبی تحریریں دیکھی ہیں۔ ہر جگہ آپ کے وسیع مطالعہ کی جھلک ہے، زبان و بیان میں بھی گہرائی ہے، انگریزی پر بھی غیر معمولی عبور ہے، اگر آپ طبیب نہ ہوتے تو اچھے ادیب ہو سکتے تھے۔ بیک وقت یہ سب کچھ یکجا ہونے کا اگر کوئی راز ہو تو بتائیں۔

ج: اس راز سے پردہ نہ اٹھنا ہی بہتر ہے۔

س: کیا آپ نہیں چاہتے کہ ہم جیسے بھی اس راز سے استفادہ کریں؟

ج: نہیں یہ بات نہیں۔

س: تو پھر کیا ہے؟ اگر گراں نہ ہو تو بتادیں۔

ج: تو سنئے، کبھی کبھی انسان کے قابل ہونے میں اس کی قابلیت کا نہیں، بلکہ دوسروں کی جہالت کا بھی ہاتھ ہوتا ہے۔

س: آپ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کے جلسہ میں شرکت کے لیے جا رہے ہیں، اس کانفرنس کی اہمیت اور آپ کے اس سے تعلق کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: طبِ یونانی کے تعلق سے کانفرنس کی اہمیت کیا ہے اس کی داستان طویل ہے۔ بس یوں سمجھو کہ آج حکومت کی جانب سے جتنی بھی مراعات طبِ یونانی کو حاصل ہیں، وہ اسی کانفرنس

کی بدولت ہیں۔ آج چونکہ اس کانفرنس میں ایسے مخلص اطبا نہیں ہیں جیسے ماضی میں ہوا کرتے تھے، اس لیے اس کی فعالیت میں کمی آئی ہے۔ جہاں تک میرے اور اس کے مابین ربط کا تعلق ہے تو میں ایک عرصہ سے اس تحریک سے وابستہ ہوں، مگر میں نادم ہوں کہ میں اس کے لیے کچھ خاطر خواہ نہیں کرسکا۔ جب ایسے ناکارہ لوگوں کی بھیڑ اس کانفرنس کا حصہ ہوگی تو اس کا حال کیا ہوگا، سمجھا جاسکتا ہے۔ اس وقت بھی میں اس کے جلسہ میں جا نہیں رہا ہوں بلکہ لے جایا جا رہا ہوں، اب دیکھیے میں اس کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔

س: سر ایسا کیوں ہوا؟ آپ نے کانفرنس کے تعلق سے یہ رویہ کیوں اپنایا؟

ج: وہ اس لیے کہ یہاں وہ خود مختاری نہیں ہے، جس کا میں عادی ہوں۔ تنظیمیں کسی فردِ واحد سے نہیں، بلکہ جماعت سے چلتی ہیں اور اجتماعیت کا نظام بہت سے سمجھوتوں کا متقاضی ہوتا ہے اور سمجھوتہ مجھے پسند نہیں، میں نے اپنی شرائط پر زندگی جی ہے، میری اس کمی نے مجھے کسی جماعت سے جڑنے نہیں دیا۔

س: ویسے تو آپ کی شخصیت کسی انعام و اکرام کی محتاج نہیں ہے، لیکن پھر بھی اگر کوئی ایوارڈ ملا ہو تو بتایئے؟۔

ج: آج کل انعام و اکرام انہیں کو دیئے جاتے ہیں جو اتھارٹیز سے تعلقات بنا کر رکھتے ہیں اور میرا یہ پہلو قدرے کمزور ہے۔ آدمی کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ بے نیاز ہو اور خدا نے میری سرشت میں یہ صفت رکھ دی ہے جو دنیا کے ہر ایوارڈ سے بڑھ کر ہے۔

س: اطبا کی نئی نسل کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے؟۔

ج: نئی نسل کو پیغام مل چکا ہے کہ باپ بڑا نہ بھیا سب سے بڑا روپیہ۔ اب اس پیغام کے بعد وہ کسی اور پیغام کو قبول ہی نہیں کرتے۔ چلو اب بہت ہوگیا، دو گھنٹے کا سفر اور ہے، مجھے بھی مہلت دو تم بھی تھوڑا لیٹ لو۔

تو اس طرح یہ انٹرویو ختم ہوا۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے میں نے طیب صاحب سے کہا کہ میں آپ کو اپنی کچھ تحریریں ارسال کروں گا، آپ ان کے تعلق سے اپنے تأثرات عطا

کر دیجیے گا۔

دہلی آتے ہی میں نے اپنے کچھ طبی مقالے اور کتابیں طیب صاحب کی خدمت میں بھیج دیں۔ مگر ان کا جواب آنے میں کافی وقت گزر گیا، آخر کار ایک دن وہ خط آ گیا، جس کا میں منتظر تھا۔

یہ خط ۹ رستمبر ۲۰۰۶ء کا تحریر کردہ ہے اس کا متن درج ذیل ہے۔

اشہر قدیر صاحب! السلام علیکم

جواب میں دیر ہوئی، اس کا خیال نہ کیجیے گا۔

کچھ لوگ ماضی کے اندھیروں میں تاریخ کے ڈھانچے اکھاڑنے میں اتنے محو ہو جاتے ہیں اور ہر چیز پر آمنا و صدقنا کی دھونی رما کر بیٹھ جانے میں فن کی نجات تصور کر لیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں کہ ہر قدیم تصور اور مشاہدہ و تجربہ کو ناقص و مہمل مان کر حال پر بھروسہ کر کے بڑے نازاں نظر آتے ہیں۔ ایسے بھی ہیں، جو بہت کم ہیں، جو غلط کو غلط ماننے کی جرأت رکھتے ہیں اور تنقیدی نظر، تخریبی نہیں، رکھتے ہوئے جائز مطابقت پیدا کرنے اور بات کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کرتے ہیں اور ہوشمندی کے ساتھ جدید کو حسب ضرورت اپناتے ہیں۔ آپ اس تیسری قسم میں آتے ہیں۔ لگے رہیے آپ کی نسل کا کام یہی ہونا چاہیے۔

آپ کے کیے ہوئے کام دیکھے۔ اچھے عنوانات قائم کیے ہیں، مثلاً سارے عنوانات اہم اور حسب ضرورت ہیں۔

طبی صحائف بھی دیکھی۔ ہمارے یہاں المیہ یہ رہا ہے کہ طلبہ اور اساتذہ فارسی سے ناواقف ہوتے ہیں، بلکہ اردو بھی ٹھیک سے نہیں آتی۔ کم و بیش اساتذہ کا حال بھی کچھ یوں ہے کہ طبی ادب (کلاسیکی) سے ناواقفیت عام ہے۔ ایسی کوئی کتاب جو اہم طبی ذخائر سے تعارف کرادے وقت کی ضرورت تھی۔ اچھا ہوتا اگر طبی صحائف میں شیخ الرئیس کی ادویہ قلبیہ، ابن زہر کی کتاب التیسیر فی المداواۃ والتدبیر، ابوالقاسم زہراوی کی کتاب التصریف، ابن القف کی کتاب العمدہ فی الجراحۃ، ابن بیطار کی جامع المفردات اور بہاء الدولہ نوربخش کی خلاصۃ التجارب وغیرہ بھی شامل کی گئی ہوتیں۔

بہرحال آپ میں جذبہ ہے۔ فکر انگیزی ہے، آپ یقیناً کچھ کر گزریں گے۔

خیر اندیش

'طیب'

اللہ تعالیٰ نے مجھ ناچیز کو اب تک جن نعمتوں سے سرفراز کیا ہے، ان میں طیب صاحب سے

یہ تفصیلی ملاقات، ان سے وابستگی بھی ہے۔ میں اپنے بارے میں ان کے درج بالا تائثرات کو سند سمجھتا ہوں، یہ میرے لیے قیمتی اثاثہ ہیں، جن کا متبادل بڑے سے بڑا ایوارڈ بھی نہیں ہوسکتا۔ ان کے یہ تحسین آمیز کلمات ہمیشہ میرے علمی جذبوں کے لیے مہمیز ثابت ہوں گے۔

آج طبِ یونانی کی یہ قابلِ تعظیم شخصیت ہمارے درمیان نہیں ہے، لیکن اس کے علمی تبرکات اور نصائح شمعِ طب کے پروانوں کے لیے ہمیشہ پرفیض ثابت ہوں گے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب - ایک طبّی دانشور

ڈاکٹر خاور ہاشمی

آرگنائزنگ سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، نئی دہلی

طیب صاحب دانشوری، اعلیٰ ذہنی وفکری صلاحیت، لائف اسٹائل، تعلیمی وسماجی رویے، غرض ہر اعتبار سے اریسٹوکریٹ تھے۔ وہ بے حد تنہائی پسند تھے، کسی شخص سے اشتراکِ عمل میں ان کا اپنا ایک خاص امتیاز اور معیار ہوتا تھا، گرچہ وہ کم آمیز تھے مگر ان کے اس رویہ کو مردم بیزاری قرار دینا صحیح نہیں، کیونکہ اس کی ایک خاص وجہ تھی، وہ اپنی سطح اور اپنے معیار سے نیچے اترنا پسند نہیں کرتے تھے، وہ عام لوگوں میں گھل مل نہیں سکتے تھے، اس لیے کہ ان کی شخصیت کا امتیاز اس کی اجازت نہیں دیتا تھا، طبیعت کی اس کیفیت اور مزاج کی اس نوعیت نے ان کی زندگی میں اصول پسندی اور ایک خاص ڈسپلن پیدا کر دیا تھا، ان کی اپنی ایک خاص سوچ تھی، اوریجنل (Original) اور حقیقت پسندانہ، تحریر وتقریر میں جو بے باکی طیب صاحب کے یہاں ملتی ہے وہ اور کہیں نہیں ملتی۔

طیب صاحب کا وسیع اور شاندار تعلیمی ریکارڈ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ انٹرمیڈیٹ تک انہوں نے سائنس پڑھی، پھر طب یونانی کی ڈگری حاصل کی اور معالجات وتشخیص عملی میں امتیازی پوزیشن حاصل کی، بی اے اور ایم اے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا اور پروفیسر نذیر احمد جیسے بلند پایہ فارسی اسکالر کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی۔ فارسی زبان اور فارسی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔

انہوں نے عملی زندگی کی ابتداء ۱۹۵۴ء میں طبیہ کالج علی گڑھ میں لکچررشپ سے کی، ۱۹۶۶ء میں معالجات میں ریڈر ہوئے، ۱۹۷۳ء میں انہیں طبیہ کالج علی گڑھ کے پرنسپل اور آنریری پروفیسر کا منصب ملا۔ ۱۹۷۹ء میں یونانی فیکلٹی کے علیٰحدہ قیام کے ساتھ وہ اس کے پہلے ڈین ہوئے۔ درس وتدریس اور تشخیص وتجویز کے ساتھ انہوں نے کئی وقیع علمی کام بھی کیے، ان کی سات کتابیں شائع ہوئیں، جنہیں علمی حلقوں میں خاص قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا گیا۔ طیب صاحب نے مختلف علمی موضوعات پر بتیس سے زیادہ علمی اور تحقیقی مقالات لکھے، جونہایت وقیع ہیں، ان کے علاوہ انہوں نے قومی اور بین الاقوامی مجالس میں جوکلیدی اورصدارتی خطبات پیش کیے ہیں وہ نہایت بیش قدر ہیں۔ ان کی نگرانی میں چھ ریسرچ اسکالرس نے تحقیقی مقالے لکھے اور ایم ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔

طیب صاحب عموماً انگریزی میں لکھتے تھے، طبِ یونانی کی تاریخ، فن امراض وعلاج، تعلیم وتحقیق کے مختلف موضوعات پر ان کی انگریزی تحریریں ملتی ہیں۔ طبّی دنیا میں انگریزی زبان پر اس قدر عالمانہ قدرت رکھنے والا کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ ان کی انگریزی کا ایک خاص اسٹائل اور ادبی شان ہے، جابجا بروقت وبرمحل استعاروں اور محاوروں کے استعمال سے وہ اپنی زبان اور انداز بیان کو نہایت دلکش اور بامعنیٰ بنا دیتے ہیں۔ چند نمونے دیکھیے:

"Hunderds of years ago a father was born in the land of greece in the middle of 5th century before christ. He found the medicine of his days rather a shabby state. He take down theories crystalised all medical knowledge of his times into a system. He observed the objective and subjective as two aspects of one reality which is life and pulled the mankind back form the abstract. of course he made the medicine more empirical and less hypothetical medicine thus it became a scientific discipline".

طب یونانی کی تاریخ کے ابتدائی نقوش کی یہ جیتی جاگتی عکاسی، الفاظ کی یہ مصوری اور کہیں نہیں ملتی، یونان کے بعد طب یونانی کے سفر کا پہلا پڑاؤ عرب اور وہ بھی اسلامی عرب میں ہوتا ہے۔ طیب صاحب کے الفاظ کا یہ جادو دیکھئے:

"With the fall of Rome, the medical schools also disappeared and there came an era of dark ages in Europe between 500 and 1500 AD. and this was the period when the Arabs rose with the banner galloping on bare backs of Arabian horess through the distant lands and assimilated all the existing of medicine of that time. They agreed, they enuntiated, they observed, they experimented and thus it emerged as greco-Arab medicine."

طبی کانفرنس کے زیر اہتمام ''طبی اخلاقیات'' پر ایک سیمینار ہوا۔ طیب صاحب نے راقم الحروف کی گزارش پر ایک مقالہ لکھا۔ اول تو مضمون کو دیا ہوا عنوان ہی پورے مضمون کا آئینہ دار ہے۔ اس کا عنوان تھا "Ailing Ethics in Healing profession" اور پھر ابتدائی پیراگراف میں اخلاقیات کی تعریف اور طبی پروفیشن میں اخلاقیات کی اہمیت کا بیان کرتے ہوئے اس مضمون کو ٹی ایس ایلیٹ کے اس جملے پر ختم کرتے ہیں:

"What we call the beginning is often the end and to make an end is to make a beginning. the end is where we start from."

طیب صاحب کی انگریزی تحریروں میں ذہانت وطباعی، گہرا مشاہدہ اور طبی مسائل کی تفہیم میں سماجی زندگی سے قربت محسوس ہوتی ہے۔ شگفتگی ان کے اسلوب کا خاص جوہر ہے۔ ۱۶-۱۵/ جولائی ۱۹۸۳ء کو سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے زیر اہتمام، بمبئی میں منعقدہ

خاندانی منصوبہ بندی اور بڑھتی ہوئی آبادی کے موضوع پر انہوں نے بڑا ہی فکر انگیز خطبہ پیش کیا، اس میں وہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستانی عوام کی مفلسی، بے روزگاری، جہالت، سماجی و معاشی پسماندگی ہی دراصل ملک کی آبادی میں تیزی کے ساتھ اضافہ کا بنیادی سبب ہے۔ خطبہ کی ابتدائی سطور ملاحظہ فرمائیں:

"Those who sleep on thick foam mattresses in airconditioned rooms with soft music in the back ground and intoxicants dashing in their blood, seldom produce more than one or one and a half (I mean a boy and a girl) while those who sleep on rocks in sultry slums with barely a morsel in their stomach, nursing the Koch's infection latent somewhere in their skeletons, produce effortlessly dozen or so. At least do not understand this phenomenon. The nature has actually designed the things that way. The lowest animal, the highest number of offspring the highest animal the lowest birth rate, the bitch drops half a dozen in most casual manner, the tigress cares once in a while to add one or two to her family. The labourer forgets even the names of his so-called God given wealth". the king goes barefoot long distance to a shrine in order to have the blessings of atleast one heir."

فیملی پلاننگ پروگراموں کو "Ill Conceived" قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"Of course we are still in experimental stage and before we come across something as sure as death the heroine mothers of our country are likely to touch the mark of 1000 million by 2000 AD."

یہ بے باکی، یہ شعور اور فکر ونظر کی بلندی طبّی دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی۔ لکھنے والے بہت سے ہیں، خاص طور سے اردو میں بہت کچھ لکھا جاچکا ہے، لیکن زبان و بیان کا وہ رچا ہوا ذوق مفقود ہے، جو طیب صاحب کو ودیعت ہوا تھا، وہ فرسودہ روایتوں کے پابند نہیں تھے، بلکہ ان کی اپنی اوریجنل سوچ تھی۔

طیب صاحب ایک عہد کے امین تھے، انہوں نے طب یونانی کے عروج وزوال کے ایک پورے دور کا مشاہدہ کیا تھا۔ وہ کبھی دُور کے تماشائی نہیں رہے، بلکہ ہمیشہ معاصر طبّی تاریخ کے مدّ و جزر میں شامل رہے۔ طبّی علوم وفنون کی موجودہ ناقدری اور کسمپرسی کو دیکھ کر ان کے ذہن پر چوٹ پڑتی تھی، کیونکہ انہوں نے اس فن کے اچھے دن بھی دیکھے تھے۔ نئی دہلی میں مورخہ ۵-۶/ اگست ۱۹۹۸ء کو سی آر یو ایم کے زیر اہتمام "نیشنل کنسلٹیشن میٹنگ" میں کلیدی خطبہ درج ذیل سطور سے شروع کرتے ہیں:

"Some Urdu poet had prayed in one of his poems God take away any memory as it is the source of my miseries and restlessness."

طیب صاحب کی حقیقت پسندی اور بے باکی کا ذکر آچکا ہے، وہ کبھی کسی مصلحت کے اسیر نہیں رہے، کیونکہ ان کا ذہن وضمیر شارٹ کٹ سے کسی سرکاری یا درباری عہدہ یا مرتبہ تک پہنچنے سے ہمیشہ بغاوت کرتا رہا ہے، اس لیے ہر موقع پر سچی اور کھری بات کہنے کے عادی تھے۔ ۲۰۰۰ء تک سب کے لیے صحت کا الما اتا اعلانیہ پر ہندوستان نے دستخط کیے تھے، لیکن ہندوستان ہی نہیں تیسری دنیا کا کوئی بھی ملک اس ٹارگیٹ کو پورا نہیں کرسکا، ہندوستان میں

اس اعلانیہ کی ناکامی کے بارے میں طیب صاحب لکھتے ہیں:

"In our country where we go slow in every field of work and waste working hours in gossiping tea-sipping smoking lunch munching and knitting and each file moves from one table to another in months and where scapegoats are committees and unending process of sub committees achievement of time bound targets are distant dreams."

طیب صاحب کو ان کی علمی و طبّی خدمات کے اعتراف میں اعزازات بھی ملے، سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے مشاورتی بورڈوں میں وہ نمایاں حیثیت سے شامل بھی رہے۔ ان اداروں کی فہرست خاصی طویل ہے، جنہیں طیب صاحب کی صائب رائے سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ یہاں بھی طیب صاحب کو امتیازی شان حاصل ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ وہ ہر عہدے اور اعزاز سے بے نیاز تھے، اس لیے ان کے حصول کے لیے تگ و دو، سعی و سفارش، جوڑ توڑ کرنا ان کی شخصیت سے فروتر تھا۔ اس لیے سرکاری اور عوامی اداروں میں جو مقام دوسرے لوگ محض جوڑ توڑ، چاپلوسی، گروپ بندی، سیاسی اثر اور دوسرے گھٹیا طریقوں سے حاصل کرتے ہیں، وہ عہدے طیب صاحب کو پیش کیے جاتے تھے اور کوشش کی جاتی تھی کہ طیب صاحب انہیں قبول کر لیں۔ وہ پورے دانشورانہ اعزاز کے ساتھ میٹنگوں اور جلسوں میں شرکت کرتے تھے اور اپنے نقوش چھوڑ جاتے تھے۔

طیب صاحب بنیادی طور پر ایک طبیب تھے، انہوں نے اپنی اس شناخت کو کبھی کھونے نہیں دیا۔ شاید ان کے شرف و سعادت کی اصل وجہ بھی یہی ہے، ایک حاذق طبیب کی حیثیت سے طیب صاحب دور تک جانے پہچانے جاتے تھے، ان کی تشخیص و تجویز بے خطا ہوتی تھی، دور دراز علاقوں سے روزانہ مریض ان کے مکان پر آ کر ان سے استفادہ کرتے تھے اور شفایاب ہوتے تھے۔

حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم ہمیشہ طیب صاحب کے علم و ہنر اور فکر و عمل کے مداح رہے، وہ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے ایک طویل عرصے تک نائب صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ صائب الرائے ہونے کی وجہ سے اس تنظیم میں بھی انہیں امتیازی حیثیت حاصل رہی۔ حکیم عبدالحمید صاحب کے انتقال کے بعد دہلی میں ایک تعزیتی میٹنگ منعقد کی گئی تھی، اس میں شریک کانفرنس کے سینئر اراکین نے حکیم محمد مختار اصلاحی مرحوم کو صدر نامزد کیا، اصلاحی صاحب کا قیام ممبئی میں رہتا تھا، اس لیے انہوں نے صدارت کی تمام ذمہ داریاں طیب صاحب کے سپرد کر دیں، پھر حیدر آباد کے اجلاسِ عام میں طیب صاحب کو متفقہ رائے سے قومی صدر منتخب کیا گیا، لیکن بدقسمتی سے کچھ اپنی افتادِ طبع اور کچھ ان کے خلاف اندرونی مخاصموں کے سبب ان کا دور کامیاب نہیں رہا، جس کی وجہ سے وہ طبی کانفرنس کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔

طیب صاحب نے جس شان اور آن بان سے زندگی گزاری، وہ بہت کم لوگوں کو میسر ہوئی ہے۔ وہ کبھی زندگی کے نہیں، بلکہ زندگی ان کی پابند رہی۔ قحط الرجال کے اس دور میں ان کی شخصیت طبی دنیا کا ایک بیش قیمت اثاثہ تھی، بلاشبہ وہ معاصر طبی دنیا میں فن کی آبرو تھے۔

حکیم محمد طیب صاحب اور آر آر آئی یو ایم، علی گڑھ

ڈاکٹر شارق علی خاں

اسسٹنٹ ڈائرکٹر، ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ

آنجہانی پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کا شمار صفِ اوّل کے طبیبوں میں تھا، وہ طب کے اس طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جو قدیم اصولوں پر کاربند رہتے ہوئے طبِ یونانی میں جدّت اور تحقیق کا علمبردار رہا ہے۔ طبِ یونانی کے بنیادی اصولوں پر غائرانہ نظر رکھنے کے ساتھ وہ علم الادویہ، خاص طور پر مفردات پر ملکہ رکھتے تھے، نسخہ نویسی اور مطب ان کو شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی صاحب کے تلمذ سے حاصل ہوا تھا، لیکن اس میدان میں وہ جدت کو فوقیت دیتے تھے۔ علمِ طب کی جدید معلومات، خصوصاً جدید ٹکنالوجی کے حصول اور اس کے استعمال کی وہ شدت کے ساتھ وکالت کرتے تھے۔ وہ مرکزی کونسل برائے تحقیق طب یونانی کے معماروں میں تھے، اس کا بنیادی ڈھانچہ تیار کرنے اور اس کی تحقیق کے منصوبوں کو وضع کرنے اور ان کو روبہ عمل لانے میں انہوں نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔

راقم الحروف کو اپنے اساتذہ سے جو فیوض و تبرکات حاصل ہوئے ہیں، ان میں سے یہ ایک اہم سرمایہ ہے کہ ان کی زبانی طب کی اہم شخصیات اور ان کے کارناموں کے تذکرے سے خاکسار کے کان زمانۂ طالب علمی سے ہی آشنا ہو گئے تھے، اس طرح اسی زمانہ سے حکیم محمد طیب صاحب کا نام نامی اسم گرامی ایک معتبر شخصیت کے پیکر کی طرح میرے قلب و ذہن میں رچ بس گیا تھا۔ حکیم صاحب براہ راست میرے استاذ تو نہیں تھے، لیکن بالواسطہ طور پر ان سے مجھے

تلمذ کی نسبت ضرور ہے۔ جب میں ۱۹۹۰ء میں ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن (RRIUM) علی گڑھ کے اسٹاف میں شامل ہوا، اس وقت وہ یہاں کے آنریری کوآرڈینیٹر تھے، حالانکہ اس سے پہلے ۱۹۸۶ء میں وہ میرا انٹرویو ARO کے لیے لے چکے تھے، اسی وقت میں ان کی ذہانت، دیانت داری اور علم نوازی کا معترف ہوگیا تھا۔

آر آر آئی یو ایم، علی گڑھ جوائن کرنے کے بعد میں نے ان کی ماتحتی میں ایک عرصہ کام کیا۔ یونیورسٹی کی ملازمت سے سبکدوشی تک وہ ہمارے اعزازی کوآرڈینیٹر رہے، اس دوران ان سے ملاقات کے متعدد مواقع ہاتھ لگے۔ گرچہ وہ لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے، لیکن انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف کے ساتھ ان کا رویہ بالکل برعکس تھا، انسٹی ٹیوٹ کے ہر ایک ملازم کا خیال رکھتے تھے۔ انہیں انتظامی امور میں ملکہ حاصل تھا، کسی کو کبھی شکایت کا موقع نہ دیتے۔ کبھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو وہ کرتے جو قانونی نقطۂ نگاہ سے درست ہوتا۔ کبھی کبھی تکنیکی مجلسوں کا انعقاد بھی کیا کرتے تھے، لہٰذا ان سے تکنیکی مہارت کے متعدد نکات بھی سیکھنے کا موقع نصیب ہوا۔ ان کی ذاتی زندگی اور مطب کے کچھ اصول تھے، جن پر وہ ہمیشہ عمل پیرا رہے۔ ان کے مطب کے اوقات متعین تھے، جس میں چند دقیقے بھی ادھر سے ادھر نہیں ہوسکتے تھے، لہٰذا ان سے ملنے کا مشکل سے کسی کو وقت ہاتھ آتا تھا، لیکن انسٹی ٹیوٹ کے اسٹاف کے ساتھ ان کا رویہ بالکل مختلف تھا۔ جب بھی میں ان سے ملنے گیا اور میں نے ان کے معتمد سے کہلوایا، اگلے مریض سے پہلے وہ مجھے بلا لیتے۔ بیٹھنے کو کہتے اور پوری بات بڑے غور سے سنتے، پھر اپنی رائے پیش کرتے۔

یوں تو ان سے ملاقات کے متعدد مواقع نصیب ہوئے، ان سب کی تفصیلات مضمون کی بے جا طوالت کا سبب ہوگی، لیکن کچھ عرصہ پہلے آر آر آئی، علی گڑھ نے دو بڑے پروگرام منعقد کیے۔ ایک پروگرام ۲۹-۲۷ / مارچ ۲۰۱۰ء کے دوران ورکشاپ آن ریسرچ میتھڈولوجی کے عنوان پر ہوا تھا، دوسرا اہم پروگرام اس ادارہ کی سلور جوبلی تقریب کے سلسلہ میں تھا، جو قیام کے ۲۵ / سال مکمل ہونے پر منعقد ہوا تھا، اس کے ساتھ ایک نیشنل سیمینار آن اِنوویٹیو ٹرینڈ ان

یونانی میڈیسن ۴-۳ رمارچ ۲۰۱۱ء کو کیا گیا۔ چونکہ حکیم صاحب اس ادارے کے بانی کوآرڈینٹر تھے اور انہی کی سعی سے یہ انسٹی ٹیوٹ وجود میں آیا تھا، لہٰذا ان پروگراموں کا خاکہ مرتب کرنے سے پہلے جب ہم نے حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکران سے اس منصوبہ کا ذکر کیا تو انہوں نے بڑی ستائش کی اور اپنے بزرگانہ پرخلوص مشوروں سے نوازا۔ اس ضمن میں انسٹی ٹیوٹ کے قیام وکارکردگی پرمبنی ایک کتابچہ شائع کرنے کا منصوبہ بنایا گیا، اس کے لیے بنیادی مواد حاصل کرنا بڑا دشوار مرحلہ تھا، میں نے حکیم صاحب سے وقت طے کرکے ان کا ایک انٹرویو کیا، اس انٹریو میں میرے ہمراہ حکیم عامر عباس صاحب بھی تھے۔ گفتگو کے دوران حکیم صاحب نے بیش قیمتی معلومات فراہم کیں، جنہیں اس کتابچہ میں شامل کیا گیا۔

انہوں نے بتایا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بہت پہلے سے حکومتِ ہند کے محکمہ صحت کی بہت سی اسکیمیں جاری تھیں، جن میں کیمیکل ریسرچ یونٹ، کمپوزٹ ڈرگ ریسرچ اسکیم جس میں کلینکل اسکریننگ یونٹ، ماڈرن ڈرگ اسکریننگ یونٹ، ڈرگ اسٹینڈرڈائزیشن ریسرچ یونٹ، فارماکولوجی یونٹ، فارماکوگنوسی یونٹ وسروے اینڈ کلٹویشن یونٹ شامل تھیں۔ ۱۹۸۵ء میں حکومتِ ہند کے ایک فیصلہ کے تحت ان سب کو یکجا کرکے ایک متحدہ ادارہ ''ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن'' کے نام سے قائم کیا گیا، جس کے پہلے سربراہ حکیم محمد طیب صاحب مرحوم ومغفور بنائے گئے، دراصل اس ادارے کے قیام میں کونسل کے فاؤنڈر ڈائرکٹر حکیم محمد عبدالرزاق صاحب اور حکیم محمد طیب صاحب کا کلیدی رول تھا۔ اس وقت حکیم صاحب فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے ڈین بھی تھے۔ انہی کی سعی جمیل کے نتیجہ میں موجودہ بلڈنگ، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی ملکیت ہے، اس میں اس ادارہ کا آغاز ہوا اور تا حال اسی میں جاری ہے، اس وقت یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ عالی جناب سید حامد صاحب تھے، حکیم صاحب نے ان کو اس بات پر آمادہ کیا اور ایک تجویز یونیورسٹی کی ایکزیکیٹو کونسل کو ارسال کی گئی، جس میں درخواست کی گئی کہ یہ عمارت نئے وجود میں آنے والے علاقائی تحقیقاتی ادارہ کو دے دی جائے، چنانچہ یونیورسٹی ایکزیکیٹو کونسل نے باقاعدہ ایک ریزولیشن پاس کرکے

موجودہ عمارت آر آر آئی یو ایم کے حوالہ کر دی۔ حکیم صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اس پورے معاملہ میں عالی جناب سید حامد صاحب کے علاوہ پروفیسر اسلم قدیر صاحب نے حد درجہ معاونت فرمائی۔ حکیم صاحب نے اس ضمن میں ایک دلچسپ بات یہ بتائی کہ اس جگہ پر ایک دوسری ایجنسی قابض ہونا چاہتی تھی، لہٰذا راتوں رات اس جگہ پر عمارت بنانے کے لیے فوری طور پر دواخانہ طبیہ کالج سے کچھ رقم کا بندوبست کیا گیا، جو بعد میں یوپی سرکار سے گرانٹ حاصل کرنے کے بعد اس کو ادا کر دیا گیا، اسے حاصل کرنے میں بھی حکیم صاحب کا اہم رول تھا، اس کے لیے انہوں نے خود لکھنؤ کا سفر کر کے اس کام کو انجام دیا تھا۔

اس انٹرویو کے دوران حکیم صاحب سے طبِ یونانی کے متعلق دیگر سوالات بھی کیے گئے تھے، مثلاً حالاتِ حاضرہ اور طبِ یونانی کی مطابقت، طبِ یونانی میں تحقیق کے خطوط اور اس کے خدوخال، عصرِ حاضر میں طبِ یونانی کی تدریس وتحقیق کا معیار اور آپ کی رائے وغیرہ، ان تمام سوالوں کے جواب حکیم صاحب نے اپنے خاص انداز میں بڑے بے باک طریقہ سے دیے جیسی کہ ان کی عادت تھی۔ انہوں نے کہا کہ اس زمانہ میں طبِ یونانی کے علاج ومعالجہ کو کافی چیلنجز کا سامنا ہے، عوام کا رجحان طبِ یونانی کے علاج کی جانب پہلے سے کہیں زیادہ ہوا ہے، لیکن ہمارے پاس وقت کی جدید مرضی صورتوں کے لیے باقاعدہ اصول اب تک منضبط نہیں ہیں، جو وقت کی اہم ضرورت ہے۔ جدید ٹکنالوجی کے حصول پر انہوں نے بہت زور دیا، اس بات کی وکالت کی کہ جدید ٹکنالوجی سائنس کی ترقی کے نتیجہ میں سامنے آئی ہے یہ کسی خاص طریقۂ علاج کی ملکیت نہیں ہے، لہٰذا جدید ٹکنالوجی کو عوام کی بہتری کے لیے طبِ یونانی کو بھرپور طریقہ سے استعمال کرنا چاہیے اور تحقیق وتدریس کے جدید ترین اصولوں کو اپنانا چاہیے۔ علاج ومعالجہ میں فوری طور پر مریض کو تسکین پہنچانے سے متعلق ادویات پر تحقیق کی اشد ضرورت ہے۔ دواسازی کے میدان میں بھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے، بقول ان کے دنیا میں ہربل ڈرگ کی تیاری اور ان کی پیکنگ کا معیار بلند ترین مقام پر پہنچ چکا ہے، لیکن افسوس، طب یونانی کی دواسازی ایک قدم آگے بڑھنے کو تیار نہیں۔

حکیم صاحب عملی معالجات کے معیار کی علامت سمجھے جاتے تھے، ان کے ذاتی مطب میں مریضوں کا آخری دم تک بڑا مجمع رہا، ان کا ماننا تھا کہ ہر طریقۂ علاج کی اپنی کچھ حدود ہیں، اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے علاج و معالجہ کرنا چاہیے۔ بسا اوقات وہ اپنے مریضوں سے کھل کر یہ کہہ دیا کرتے کہ اس مرض میں طبِ یونانی سے افاقہ نہیں ہوگا، آپ فلاں ماہر معالج سے رجوع کریں اور یہ ان کی معالجاتی دیانت داری اور فنی وضعداری کی بڑی مثال ہے۔

طبّی دنیا پر حکیم صاحب کے بڑے احسانات ہیں، انہوں نے طبِ یونانی کی ترقی کی راہ میں اس وقت قندیلیں روشن کیں، جب ترقی کے خطوط طے کرنے کے سلسلہ میں طبِ یونانی کے ماہرین کے اذہان کسی بھی واضح خاکہ سے عاری تھے۔ تحقیق و تدریس نیز عملی معالجات کے میدان میں ان کی کارکردگی ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

پروفیسر حکیم محمد طیب۔ پیکر علم وعمل

حکیم شمس الآفاق

سابق ڈپٹی ایڈوائزر (یونانی) محکمہ آیوش، وزارت صحت، حکومت ہند، نئی دہلی

افسوس کا مقام ہے ابھی کچھ دنوں پہلے حکیم مظہر سبحان عثمانی صاحب چلے گئے، اب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے سابق ڈین، پروفیسر، پرنسپل اور بھارت کے ایک ممتاز یونانی معالج کا امیر نشاں، علی گڑھ میں ان کی رہائش گاہ پر انتقال ہوگیا۔ ''اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون''. ان کی عمر ۸۲/سال سے تجاوز کر چکی تھی۔طب یونانی کا ایک روشن چراغ تھا، نہ رہا۔

یہ لیجئے ابھی ابھی ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے، اس مضمون کو میں Fair کر رہا تھا کہ حکیم غلام مہدی راز صاحب کا ٹیلی فون آگیا۔انہوں نے اطلاع دی کہ کل یعنی بروز بدھ، ۱۹/جون کو حکیم سید صفی الدین علی، جو میرے ساتھ وزارت صحت، حکومت ہند میں ریسرچ اسسٹنٹ تھے،ان کا بھی انتقال ہوگیا۔''اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون''۔

عجب دست قضا کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے توڑ کر پھول اور ویرانے میں رکھ دینا

حکیم طیب صاحب اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ میں استاذ تھے۔ان کا شمار ملک کے ممتاز اساتذہ اور یونانی اطباء میں تھا۔ان کے درس کا انداز بڑا ہی نرالا تھا۔وہ معلومات کے لحاظ سے پڑھاتے وقت ایسے فنی نکات بتاتے کہ طلبہ دم بخود رہ جاتے۔ان کے پڑھائے ہوئے مضامین،

معلومات کے لحاظ سے قدیم اور جدید کا سنگم ہوتے۔ طلبہ اور شاگردوں کے ذہن و دماغ اس کو بحسن وخوبی قبول کر لیتے اور باتیں ذہن نشیں ہو جاتیں۔ انہیں اچھی کتابیں پڑھنے کا ایسا شوق تھا کہ بعض دفعہ تو کھانے کا بھی دھیان نہیں رہتا۔ جن کتابوں کا مطالعہ فرماتے ان پر اپنی علمی بصیرت اور وسعتِ مطالعہ کی روشنی میں نوٹ اور حواشی قلم بند کرتے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طبِ یونانی پر ان کی گہری نظر تھی۔ اس جید عالم طب، فاضل وحاذق طبیب، نیک طبع، شریف النفس، وضع دار شخصیت کے بارے میں کس طرح لکھوں، مجھ جیسے نا اہل کا لکھنا چہ معنیٰ دارد۔ پھر بھی ان کے ساتھ بیتے ہوئے لمحات کے بارے میں دل چاہتا ہے کہ قارئین سے Share کروں، شاید یہ مرحوم کے لیے ایک بہترین خراجِ عقیدت ہو۔

مرحوم حکیم طیب صاحب بڑے منکسر المزاج، تواضع پسند، خوش اخلاق اور پُروقار شخصیت کا نمونہ تھے ساتھ ہی تحمل، بردباری، متانت اور سنجیدگی کا پیکر، انہوں نے اپنی زندگی کا بیش قیمت وقت اس فنِ شریف کے لیے جو اَب غریب ہو چکا ہے، وقف کر دیا تھا۔ Discipline اور وقت کے بہت پابند تھے۔ شدید حالات میں بھی انہوں نے وقت کی پابندی کا التزام کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ سخت بیماری کی حالت میں بھی وہ اپنے فرض سے منھ نہیں موڑتے تھے۔

گزشتہ پچاس برسوں سے پروفیسر حکیم محمد طیب طبّی دنیا اور طبّی اداروں کو اپنی خدمات مہیا کرا رہے تھے۔ انہوں نے زندگی کا بیشتر حصہ طبِ یونانی کی خدمت میں گزارا، ان کی رحلت طبّی دنیا کا ایک بڑا نقصان ہے، اب یہ خلا پُر ہوگا یا نہیں یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا یا پھر اربابِ فن جانیں۔ ملک اور بیرون ملک سے علاج معالجہ کی غرض سے مریض ان کے پاس آتے تھے۔ ان کے انتقال سے طبِ یونانی کا ایک دور ختم ہو گیا۔ ان کے انتقال سے نہ صرف ملکی بلکہ بیرون ملک کے عوام کو گہرا صدمہ پہنچا ہے۔

حکیم طیب ایک کردار کا نام تھا۔ وہ انتہائی ایماندار، بے باک، بے خوف اور با کردار انسان تھے، وہ مرکزی وزارتِ صحت، حکومتِ ہند کی مختلف کمیٹیوں سے وابستہ رہے۔ انہوں نے اجمل خاں طبیہ کالج میں ایک طویل عرصے تک اپنی خدمات پیش کیں اور طلبہ و اساتذہ کے درمیان علمی قابلیت، حسنِ اخلاق اور اپنی پُروقار شخصیت کی وجہ سے نہایت ادب واحترام کی نگاہ سے

دیکھے جاتے رہے۔ آج بھی ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد ملک اور بیرونِ ملک میں طب یونانی کا پرچم بلند کیے ہوئے ہے۔ ان کی عظیم طبّی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۹۵ء میں حکیم اجمل خاں میموریل سوسائٹی نے انہیں آل انڈیا حکیم اجمل خاں ایوارڈ "برائے ماہر طبیب یونانی" سے نوازا تھا۔ یہ ایوارڈ سابق صدر جمہوریہ ہند جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے پیش کیا تھا۔ حکیم صاحب ایک عبقری شخصیت کے مالک تھے۔ بیسویں اور اکیسویں صدی میں بھارت میں جن شخصیتوں نے نامساعد حالات میں فنِ طب کے احیاء، بقاء اور ترقی کے لیے سعی کی ہے اور اس کو عوامی طب بنا کر مقبول عام کرنے میں کردار ادا کیا ہے، اس کی ایک اہم کڑی حکیم طیب صاحب بھی تھے۔ جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے، انہیں سمجھا ہے، جانا ہے، ان کے دلوں میں ہمیشہ ان کی یاد اور ان کی چھاپ تازہ رہے گی اور وہ سب اس ناقابلِ تلافی نقصان پر اظہار رنج وغم کرتے رہیں گے۔

موت اس کی ہے کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ایسے حکماء، ایسے علماء بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں اور بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ ایک پُرکشش شخصیت، سرخ وسفید رنگ کی آمیزش، مکروفریب سے دور، باوقار اور پُرنور چہرہ، بولتی اور چھلکتی ہوئی پُرکشش بڑی بڑی آنکھیں، خاموش رہتے تو وقار چھلکتا، بولتے تو علم کی بوچھار ہوتی، پڑھاتے تو کیا مجال کہ کوئی طالب علم حدِ ادب سے تجاوز کر جائے۔ ایسی عبقری شخصیت کوئی اور نہیں پروفیسر حکیم محمد طیب تھے۔

طبّی کانفرنس سے ان کا گہرا تعلق تھا مگر طبّی برادری نے ان کی خاطر خواہ قدر نہیں کی، ایک دور ایسا بھی میں نے دیکھا کہ حکیم سیف الدین صاحب کے مقابلے ان کا انتخاب بطور صدر طبّی کانفرنس ہو گیا۔ وہ کافی فعال صدر ثابت ہوئے، لیکن واہ رے طبّی سیاست، اس نے

انہیں کام کرنے کا موقع نہیں دیا، نتیجہ یہ ہے کہ یہ آج تک بدحال ہے۔ ایک دور ایسا بھی آیا کہ حکیم صیانت اللہ صدیقی صاحب کے ذریعہ طبّی کانگریس سے بھی متاثر ہوئے، مگر حکیم حماد صاحب کی ہی طرح انہوں نے بھی کسی وجہ سے مجبوری ظاہر کردی اور طبّی کانفرنس سے علاحدگی پسند نہ کی، شاید اس میں بھی کوئی مصلحت رہی ہو۔

حکیم طیب صاحب مرحوم حسنِ اخلاق کے پیکر تھے، حاذق طبیب تھے، فنِ طبابت میں بلاشبہ ان کو علامہ کہا جاسکتا ہے۔ طب سے ان کی والہانہ محبت کا اظہار ان کی کتابوں اور ان کے مضامین سے ہوتا ہے۔ طبِ یونانی کی بقاء اور ترقی کے لیے اپنے یارِ غار حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم ومغفور کے ساتھ وہ کہاں کہاں نہیں گئے۔ طب کے لیے انہوں نے نہایت قابلِ قدر اور ناقابلِ فراموش خدمت انجام دی ہے۔ ہندوستان میں طب کو زندہ رکھنے نیز اسے ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے انہوں نے حکیم شکیل احمد شمسی صاحب مرحوم، حکیم عبدالحمید صاحب مرحوم اور حکیم عبدالرزاق صاحب مرحوم کے ساتھ مل کر کیا کچھ نہیں کیا۔ یہ تو صرف وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے ان حضرات کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔

حکیم طیب صاحب آج کے حکماء کی طرح نمائشی نہیں تھے۔ وہ جھوٹی شہرت اور چمچہ گیری، ضمیر فروشی سے ہمیشہ دور رہے۔ وہ تصنیف اور تالیف کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ گرچہ لکھتے کم تھے، مگر ٹھوس لکھتے تھے۔ مضمون ایسا ہوتا تھا کہ دل ودماغ کی بند کھڑکیاں کھل جاتیں۔ انہوں نے خوشامدیوں اور بے ضمیر لوگوں سے خود کو ہمیشہ دور رکھا۔ آج کے حکماء کی طرح بریف کیس اٹھوانے میں یقین نہیں رکھتے تھے، بلکہ اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ ان کے جیسے باوقار طبیب اور دانشور صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

حکیم طیب صاحب مرحوم میں آج کے اطباء کی طرح خودنمائی اور خودستائی نہیں تھی۔ گرچہ انہوں نے کم لکھا ہے لیکن جو لکھا ہے وہ خود لکھا ہے۔ دوسروں سے لکھوانا، اپنی جھوٹی تعریف کرانا انہیں پسند نہیں تھا، بلکہ ایسی حرکتوں اور ایسے لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ بہت ہی Reserve انسان تھے۔ ہم لوگوں کی بھی ہمت نہ ہوتی کہ برابر بیٹھ جائیں۔ یہ

دوسری بات ہے کہ میٹنگوں میں خوب علمی بحث ہوتی، علم کا آدان پردان ہوتا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملتا۔

اب تو ہر کانفرنس، ہر سیمینار اور طبی ورکشاپ میں صرف تاریخِ طب ہی موضوع ہوتا ہے، اسی پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ لگتا ہے کہ صرف تاریخِ طب ہی مکمل یونانی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ اور نہیں ہے۔ یونانی کی ترقی صرف تاریخِ طب پر ہی منحصر ہے۔ ناسمجھ اطباء کا ایک گروپ بضد ہے تاریخ کو زندہ رکھو، خود زندہ رہو گے، یونانی زندہ رہے گی۔ یہ ٹھیک ہے تاریخ طب ضروری ہے، مگر ایک حد تک، میں کہتا ہوں کہ آخر کب تک طبِ یونانی کا رونا روتے رہو گے۔

کچھ اپنی ذات کے بھی تو جوہر دکھائیے
کب تک یہاں بزرگوں کے قصے سنائیں گے

قصۂ پارینہ کو دہرانے سے ترقی نہ ہوگی، بلکہ حکیم محمد طیب صاحب مرحوم کے بتائے ہوئے اور دکھائے ہوئے راستہ پر چل کر ہی طبِ یونانی زندہ ہوگی اور اس کی ترقی کے امکانات پیدا ہوں گے۔ ورنہ سیاسی دور تو چل ہی رہا ہے، نوکری دو چار لوگوں کو ملتی رہے گی، کچھ نام اور کچھ کام اخباروں کی زینت بنتے رہیں گے۔

بقول کسی شاعر کے

اٹھ اٹھ کے مسجدوں سے نمازی چلے گئے
دہشت گروں کے ہاتھ میں اسلام آگیا

کچھ ایسا ہی حال طبِ یونانی کا بھی ہے، ایک ایک کر کے مخلص اطباء اور ذی علم حضرات، جو صحیح معنوں میں حکیم اور طبِ یونانی کے علمبردار تھے، اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں اور طبِ یونانی، نااہل لوگوں کے ہاتھوں مرجھا رہی ہے، ڈوب رہی ہے۔

حکیم محمد طیب

حکیم ظل الرحمٰن

سابق آرگنائزنگ سکریٹری آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس، نئی دہلی

معروف اردو روزنامہ راشٹریہ سہارا مورخہ ۷رجون ۲۰۱۳ء میں جناب حکیم محمد طیب صاحب کی ۸۲ سال کی عمر میں انتقال کی خبر ملی۔ اقبال مرحوم کے یہ شعر زبان پر آگئے۔

آرزو کو خون رلواتی ہے بیدادِ اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زباں
ہے خزاں کا رنگ بھی وجہ قیام گلستاں
ایک ہی قانون عالمگیر کے ہیں سب اثر
بوئے گل کا گل سے اور گلچیں کا دنیا سے سفر

موت ہر شخص کا مقدر ہے یہ ہم سب کا ایمان ہے، اس کے باوجود کسی کے اس دنیا سے رخصت ہونے پر جس طرح غم والم کا احساس ہوتا ہے، غالباً اس کی وجہ قحط الرجال اور جانے والے کا فوری طور پر کوئی بدل نہ ملنا ہوتا ہے۔ طیب صاحب میرے ہم عمر تھے، میں اب ۸۱ سال کا ہوں اور ان کا انتقال ۸۲ سال کی عمر میں ہوا ہے۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس کی سکریٹری شپ کے دوران میرا اور ان کا ۱۹۷۸ء سے ۱۹۸۶ء تک مسلسل ساتھ رہا، اس کے بعد بھی جب کبھی وہ دہلی تشریف لائے ملاقات ہوتی رہی۔

وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طبیہ کالج کے طالب علم تھے، پھر اسی کالج میں استاذ بنے اور ترقی کر کے ڈین فیکلٹی اور پرنسپل کے عہدوں پر فائز ہوئے۔ طیب صاحب سنٹرل کونسل

فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے اہم رکن تھے۔ آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس میں وہ حکیم محمد مختار اصلاحی صاحب کے بعد صدر رہے۔ دہلی میں حکیم حافظ بشیرالدین صاحب سابق استاذ طبیہ کالج قرول باغ، طیب صاحب سے تعلیمی اعتبار سے دو سال جونیئر تھے۔ حکیم بشیرالدین صاحب ابھی بقیدِ حیات ہیں اور طبیہ کالج قرول باغ دہلی کے فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں۔

آج طبّی دنیا میں قحط الرجال کا یہ حال ہے کہ ہندوستان میں اس وقت جتنی درسگاہیں ہیں، اتنی تعداد میں بھی لائق طبیب دستیاب نہیں ہیں، اس درجہ کا شخصی قحط شاید ہی کسی اور فن میں دیکھنے کو ملے۔ مجھے اپنے ہمدرد کے ایک ساتھی جناب سعادت علی صدیقی کا جو بعد میں علی گڑھ میں دواخانہ طبیہ کالج کے منیجر ہو گئے تھے، ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ ایک بار انہوں نے طبیہ کالج کے ایک فارغ التحصیل جو علی گڑھ ہی میں مطب کرتے تھے، سے کہا کہ کچھ یونانی دوائیں بھی اپنے مطب میں استعمال کیا کریں، تو ان کا جواب تھا کہ حضرت ہمیں یونانی پڑھایا کس نے ہے، جو یہ دوائیں استعمال کریں۔ یہ ایک صداقت ہے، خواہ طبیہ کالجوں کے اساتذہ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ طبّی کالجوں کے فارغین کا مقصود صرف وہ سند حاصل کرنا ہوتا ہے، جس کے ذریعہ وہ ایلوپیتھک مطب کر سکیں، کیونکہ BUMS میں ایک پرچہ ایلوپیتھک ادویہ کا بھی ہوتا ہے اس لیے وہ انگریزی ادویات کے استعمال کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ نبض شناسی تو اب ۹۰ رفیصد اساتذہ کو نہیں آتی تو شاگردوں کو کہاں سے آئے، اب حال یہ ہے کہ

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا
کارِ طفلاں تمام خواہد شد

ان حالات میں کسی ایسے طبیب کا، جو صحیح معنوں میں طب شناس اور مطب و معالجہ کا رمز آشنا تھا، دنیا سے رخصت ہو جانا ایک بڑا سانحہ ہے۔

حکیم عبدالحمید صاحب بانی ہمدرد کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ کسی بھی جگہ کام کا آدمی مل جائے تو وہ اسے اُچک لیتے تھے۔ اسی مردم شناس صلاحیت کے ذریعہ انہوں نے

حکیم طیب صاحب کے جوہر کو پہچانا اور ان کو آل انڈیا یونانی طبّی کانفرنس سے وابستہ کیا اور وہ تاحیات اس سے وابستہ رہے، یہاں تک کہ وہ طبّی کانفرنس کے منصب صدارت پر بھی فائز ہوئے۔

طبِ یونانی میں بھرپور صلاحیت کے ساتھ طیب صاحب کی ایک خوبی انگریزی زبان پر مہارت اور انگریزی کتب کے مطالعہ کا عادی رہنا تھا، اس کے علاوہ جدید طب پر ان کی اچھی نظر تھی، اس سلسلہ میں ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ان حدوں سے واقف تھے کہ اس سے کس قدر استفادہ ہمارے فن کے لیے مفید ہے، اس کا اظہار ان کے مختلف سیمناروں میں پیش کردہ مقالوں سے ہوتا تھا۔

جب طبّی کانفرنس نے BUMS کے سرکاری نصاب کی جگہ ایک جامع نصاب کی ترتیب کے لیے اپنی نصابی کمیٹی تشکیل دی تو یہ خاکسار اس کا سکریٹری تھا، جب نصاب مرتب ہوا تو طیب صاحب کی صلاحیتوں کا مزید راز میرے سامنے آیا، مجھے یہ بات اب تک یاد ہے کہ جب تاریخِ طب کا نصاب مرتب ہورہا تھا تو بیشتر تجاویز کا حصہ تاریخ الاطباء تھا، اس پر میں نے کہا تھا کہ ہم تاریخِ طب کا نصاب مرتب کر رہے ہیں، کسی کی شخصیت کیا تھی؟ اس سے ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے، بلکہ اس کا فنِ طب کی ترقی میں کیا حصہ ہے؟ اصل چیز یہ ہے۔ میرے اس خیال کی تائید صرف طیب صاحب اور حکیم شکیل احمد شمسی صاحب نے کی تھی۔

طیب صاحب خانگی معاملات میں کچھ محرومیوں کا بلاشبہ شکار تھے، لیکن رشتۂ ازدواج تاحیات باقی رہا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اہلیہ کسی کالج میں استاذ تھیں اور اسی زندگی میں مگن تھیں، ورنہ کوئی معاملاتی اختلاف نہیں تھا۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب کسی کو کسی خدمت کا جنون سوار ہو جائے، خاص طور پر علمیت کے میدان کا، تو وہ شخصیت کسی دوسرے میدان کے کام کی رہتی ہی نہیں، یہی صورتِ حال طیب صاحب اور ان کی اہلیہ کے ساتھ تھی۔

طیب صاحب کی ایک خوبی مزاجی اعتبار سے مرنجاں مرنج ہونا تھی، میں نے انہیں کبھی اپنے کسی ساتھی سے ناراض ہوتے نہیں دیکھا۔ دوستوں میں وہ مست رہتے تھے، خاص طور پر جناب حکیم اقبال صاحب، مالک ہمدم دواخانہ سے ان کا مہذب مذاق سب سے زیادہ تھا۔

اپنے تمام ساتھیوں کا احترام ان کی عادتِ ثانیہ تھی اور سب سے اہم بات یہ کہ ان میں اپنی شخصیت کی تشہیر کا ذرہ برابر جذبہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ کسی تکبرِ علمی کے شکار تھے۔ طبّی کانفرنس میں حکیم عبدالحمید صاحب کے بعد جناب حکیم محمد مختار اصلاحی صاحب صدر منتخب ہوئے، ان کے بعد یہ منصب جناب حکیم طیب صاحب کے سپرد ہوا۔ انہوں نے طبّی کانفرنس کو اس وقت سنبھالا جب حکیم عبدالحمید صاحب کے بعد طبّی کانفرنس کے حالات کمزور ہو گئے تھے اور طبّی کانگریس کا ارتقا ہو رہا تھا، جسے شمع لیباریٹریز اور ریکس ریمیڈیز کے ذریعہ آبیاری حاصل ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود انہوں نے طبّی کانفرنس میں کوئی اضمحلال نہیں آنے دیا۔

جانے والا چلا گیا، ہمارا ایمان ہے کہ ہر شخص کو اس جہانِ فانی سے جانا ہے تو پھر یہ افسوس کیوں۔ مگر افسوس اس لیے کہ اب جانے والے کا متبادل تو بڑی چیز ہے چوتھائی متبادل بھی نہیں ہے اور چہار سُو قحط الرجال ہے۔

باتیں ایک منفرد انسان کی

پروفیسر منصور احمد صدیقی
ڈائرکٹر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور

طالب علمی کے زمانہ میں دماغ پر مرتسم ہونے والے نقوش اتنے گہرے ہوتے ہیں جو زندگی بھر نہیں مٹتے اور ہمیشہ پردۂ ذہن پر قائم رہتے ہیں، اسی لیے اس دور کی یادیں تاحیات سوغات بنی رہتی ہیں اور طالب علم اس یادگار زمانہ کو ہمیشہ اپنی یادوں میں سنجوئے رہتا ہے۔ اگر طالب علمی کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہو تو پھر یہ یادیں بھلائے نہیں بھولتیں، شاید ایسا اس لیے ہے کہ علی گڑھ کے مخصوص ماحول میں جو زندگی گزرتی ہے، اس میں یادوں کے بے حد سامان ہوتے ہیں، یہاں کے مشاغل مختلف النوع ہونے کے ساتھ بے حد منفرد ہوتے ہیں، ان کی انفرادیت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ وہ اقدار و روایات سے جڑے ہوتے ہیں، کیا چھوٹا کیا بڑا، یہاں کا ہر فرد اُن روایتوں کا پاسدار اور امین ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہاں خردی اور بزرگی کا جو سسٹم قائم ہے، وہ صرف یہیں دیکھنے کو ملتا ہے، یہاں کے اسی مخصوص ماحول سے 'علیگیریت' کا وجود عمل میں آیا ہے، جس کے مشاکلہ کا سب سے اہم عنصر اقدار و روایات ہیں، اس تشخص کی وجہ سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ہندوستان کی دوسری جامعات سے ہمیشہ ممتاز رہی ہے۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ امتیاز کے حامل اس ادارہ سے مجھے بھی ارتباط کی نسبت حاصل ہے، یہ ربط اس وقت استوار ہوا جب میں نے یہاں اجمل خاں طبیہ کالج میں بی یو ایم ایس میں

داخلہ لیا، یہ واقعہ ۱۹۷۷ء کا ہے، اس رشتہ کو قائم ہوئے اب ۳۵ر برس سے زائد کا عرصہ ہو چکا ہے، مگر ذہن میں یہاں بیتے دنوں کے واقعات اس طرح تازہ ہیں، جیسے یہ ابھی چند روز پہلے ہی پیش آئے ہوں، ان یادوں میں جو بات سب سے زیادہ یادگار معلوم ہوتی ہے، وہ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی شخصیت ہے، جو ممتاز ہونے کے ساتھ متاثر کن بھی تھی۔ ان کی شخصیت کا سب سے بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ علم وعمل کا پیکر تھی، وہ متاثر کن اس لیے تھی کہ ان اوصاف کے علاوہ وہ وضع داری، اخلاق وکردار کی صفات سے متصف تھی، ان کی شخصیت نے زمانۂ طالب علمی میں میرے ذہن پر جو نقوش مرتسم کیے ہیں، وہ نہ صرف بے حد گہرے ہیں، بلکہ بڑے رنگ برنگے ہیں اور ہر رنگ ایک آہنگ لیے ہوئے ہے، بالکل ایک نگار خانہ کی طرح۔ حکیم صاحب سے رشتۂ تلمذ کا یہ واقعہ میری زندگی کی ایک فخریہ داستان ہے۔

میں نے ۱۹۷۷ء میں جب اجمل خاں طبیہ کالج میں داخلہ لیا، اس وقت طیب صاحب کالج کے پرنسپل تھے، ویسے بھی ایک مبتدی طالب علم کا پرنسپل سے کیا تعلق؟ اگر پرنسپل کے عہدہ پر متمکن شخص، حکیم طیب صاحب جیسا رعب ودبدبہ کا حامل ہو تو کسی تعلق کا امکان سرے ہی سے مسترد ہو جاتا ہے، اس لیے طالب علمی کے ابتدائی دنوں میں ان سے واقفیت کا معاملہ بس بالا بالا سا رہا، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ان کے بارے میں سننے سے زیادہ انہیں جاننے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

حکیم طیب صاحب کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ خود صاحبِ علم تھے اور پڑھنے لکھنے والے طلبہ کو بے حد پسند کرتے تھے اور ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے، میں اپنی کلاس کا ٹاپر اور پوزیشن ہولڈر تھا، اس لیے ان کے پسندیدہ تلامذہ کے زمرے میں میرا بھی شمار تھا۔ کسی طالب علم کو طیب صاحب کی نگہِ التفات حاصل ہو جائے، یہ بہت خوش بختی کی بات تھی، اس سعادت کی وجہ سے گاہے بہ گاہے، کوئی بہانا ڈھونڈ کر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا تھا، ایسا ہی ایک بہانا تھا مریضوں کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضری کا، اس وقت یونیورسٹی میں طیب صاحب کی طبابت کا بڑا شہرہ تھا، وہ یونانی علاج ومعالجہ کے لیے یہاں کے طلبہ واساتذہ کی پہلی پسند تھے،

یونیورسٹی کے میرے ساتھیوں کو جب ان کی خدمت میں حاضر ہونا ہوتا تو وہ مجھے بطور وسیلہ استعمال کرتے، اس طرح طیب صاحب کی فنی حذاقت کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان کی تشخیص اتنی تیر بہدف اور نسخے اتنے مؤثر ہوتے کہ شاید ہی کسی مریض کو ان کے پاس دوبارہ جانے کی ضرورت پڑتی۔ ایک بار مجھے Mandibular Joint میں شدید درد ہوا، میں نے کالج کے استاذ ڈاکٹر سمیع الرحمان صاحب سے رجوع کیا، اس وقت فزیشین اور سرجن کی حیثیت سے ان کی بڑی شہرت تھی، انہوں نے ماہیت مرض جاننے کے لیے X–Ray لکھ دیا۔ یونیورسٹی کے طلبہ کے لیے فری اکسرے کی سہولت تھی، لیکن اس کے لیے کالج کے پرنسپل سے مراعت نامہ حاصل کرنا پڑتا تھا، طیب صاحب اس وقت کالج کے پرنسپل تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے فری اکسرے کے فارم پر دستخط تو کر دیا، ساتھ ہی تکلیف کے بابت بھی دریافت کرلیا، میں نے ان سے ساری تفصیل عرض کردی، اسے سننے کے بعد انہوں نے کہا آپ خواہ مخواہ جانچ کے چکر میں پڑے ہیں اور غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو X–Rays سے اکسپوز کرنے جا رہے ہیں، یہ تو بہت معمولی مرض ہے، ایک تیل کا نام بتا کر کہا، اسے چند روز استعمال کرلیجئے، آرام ہو جائے گا۔ میں نے ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے، اس روغن کی مالش کی، اس کے محض چند روز کے استعمال سے میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس واقعہ سے حکیم طیب صاحب کی فنی حذاقت کا پتہ چلتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ یونانی علاج و معالجہ کے یونہی مرجع نہیں بنے تھے، بلکہ ان کے پاس مریضوں کے کثیر مرجوعہ کا سبب، ان کی حذاقت تھی۔

فی زمانہ، ٹیچنگ، پیشہ ورانہ کیریر کا نہایت منفعت بخش شعبہ ہے، خود یونانی طب میں بھی اعلیٰ اسناد کے حاملین کی، یہ شعبہ پہلی پسند ہے، عموماً تدریس کو بہت آسان اور سہل کام سمجھا جاتا ہے اور طبیعت کی سہل پسندی، اس میدان عمل کے انتخاب کی بڑی وجہ ہے، مگر فی الواقع یہ بے حد مشکل کام ہے، گرچہ لوگ اسے آسان سمجھتے ہیں، لیکن اس منصب کی ذمہ داریوں سے کماحقہ، عہدہ برا ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں

بیک وقت طلبہ کی ایک جماعت کو مطمئن کرنا ہوتا ہے، اس لیے اچھی ٹیچنگ کے لیے سبجکٹ پر عبور کے ساتھ ٹیچنگ آرٹ سے واقف ہونا بھی ضروری ہے، اگر یہ کوئی کتابی چیز ہوتو اسے کوئی بھی سیکھ سکتا ہے، مگر یہ کتابی باتیں نہیں ہیں، اس سے آگہی کے لیے ایک خاص قسم کے وجدان اور شعور کی حاجت ہے، اس لیے کم ہی لوگ اس سے واقف ہو پاتے ہیں، حکیم طیب صاحب اس آرٹ کے بڑے ماہر تھے، ان کی مہارت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ علم الادویہ جیسے خشک مضمون کو اس طرح پڑھاتے کہ وہ بے حد دلچسپ ہو جاتا، اس ٹیچنگ آرٹ کی وجہ سے بحیثیت استاذ طیب صاحب کو جو شہرت و ناموری ملی، وہ اس زمانہ کے کسی اور استاذ کے حصہ میں نہیں آئی، اس لیے یہ کہنا حق بجانب ہے کہ وہ صحیح معنوں میں 'معلمِ طب' تھے۔

معالجانہ حذاقت اور درس و تدریس میں غیر معمولی مہارت کے ساتھ، حکیم طیب صاحب اخلاق و کردار کے بے حد اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان حالات کو بدلنے پر قادر نہیں ہوتا ہے تو وہ سمجھوتے کی روش اختیار کر لیتا ہے، ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو زمانہ کے ساتھ مفاہمت کو دانشمندی خیال کرتا ہے اور اسے وقت اور زمانہ کے ساتھ چلنے کی صلاحیت سے تعبیر کرتا ہے، مگر یہ روش کبھی کسی با اصول انسان کے لیے قابل قبول نہیں بن سکی، کیونکہ یہ مفاہمت اصولوں سے دستبرداری کا ایک بہانا ہے، حکیم طیب صاحب اخلاق و کردار سے عبارت تھے، وہ اس سے فروتر کسی چیز سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ہمیشہ ان کے مزاج میں ایک قسم کی درشتی محسوس کی گئی، دراصل وہ اصولوں سے سمجھوتہ نہیں کر سکتے تھے، اس لیے ہمیشہ وہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہے، انہیں اس بات کی ہرگز پروا نہیں تھی کہ مصلحتوں کی یہ دنیا ان کا ساتھ چھوڑ دے گی اور وہ یکہ و تنہا رہ جائیں گے۔ یہ اسلوب ان کی شخصیت کا بڑا منفرد پہلو ہے۔

تملق اور خوشامد پسندی علی گڑھ کی سرشت کا حصہ ہے، وہاں اسے بڑی صلاحیت سمجھا جاتا ہے، جس میں یہ جوہر جتنا زیادہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی کامیاب ہوتا ہے، حکیم طیب صاحب علی گڑھ کے ماحول کے پروردہ ہونے کے باوجود، ان معایب سے بہت دور تھے، وہ کسی کی خوشامد کرنا پسند نہیں کرتے تھے، اسی طرح انہیں یہ بات بھی سخت ناپسند تھی کہ کوئی ان کی خوشامد کرے۔

انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ علی گڑھ میں رہتے ہوئے انہوں نے کس طرح وہاں کی مسموم فضا سے خود کو محفوظ رکھا، دراصل یہی تو انفرادیت تھی حکیم طیب صاحب کی شخصیت کی، اس تفرد کے لیے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ جب بھی مجھے علی گڑھ یاد آتا ہے، حکیم طیب صاحب کی شخصیت نظروں کے سامنے آجاتی ہے، شاید ان کے انہی تفردات کی وجہ سے۔

کتاب العشر مقالات فی العین- ایک تجزیاتی مطالعہ

ڈاکٹر وسیم احمد لکچرر، شعبۂ کلیات، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور
ڈاکٹر بدر الدجیٰ خاں، لکچرر شعبۂ معالجات، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو، علی گڑھ

اقوامِ عالم میں کچھ ہستیاں ایسی بھی ہیں، جو مستقل حق کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں، انہی میں سے ایک جرمن محقق Max Mayerhof بھی تھا، اس کی تحقیق کا مرکز علم العین تھا، اس مستشرق عالم کا شمار اپنے زمانہ کے ایک جید ماہرِ امراضِ چشم کے طور پر تھا، اس نے ۱۹۴۵ء میں ستر سال کی عمر میں وفات پائی اور قاہرہ میں مدفون ہے۔ مصری اسے عقیدت میں Dr. Max کہتے ہیں۔ فنِ جراحت میں کمال کا درجہ رکھنے والے اس عالم طبیب نے اپنی کامیاب سرجری سے ہزاروں انسانوں کی دنیا کو تاریک ہونے سے بچایا۔ مائر ہوف کی شخصیت نہایت متنوع تھی وہ بیک وقت مصنف، مترجم اور محقق تھا۔ اس نے عربوں کی علمی میراث پر متعدد اہم کتابیں تالیف کی ہیں، خود ایک بڑا عالم ہونے کے ساتھ یہ خاندانی لحاظ سے بھی عظیم علمی پس منظر رکھتا ہے، اس کے بھائی پروفیسر Otto Mayerhof کو ۱۹۲۲ء میں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔ میکس مائر ہوف نے طب کا مطالعہ کرنے کے علاوہ ہیڈل برگ (Heidelburg)، برلن اور اسٹراس برگ (Strasburg) جیسی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے ۱۸۹۷ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ ۱۹۰۰ء میں مصر گیا اور وہیں سکونت

اختیار کرلی۔ وہ غریبوں کا مفت علاج کرتا تھا۔ یونانی میڈیسن سے خصوصی تعلق کی وجہ سے ایجپشین انسٹی ٹیوٹ اور میڈیکل ایسوسی ایشن کا نائب صدر منتخب ہوا۔ ۱۹۲۸ء میں لپزگ (Leipzig) یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر مقرر ہوا، لیکن دوبارہ مصر واپس چلا گیا۔

طب پر مائرہوف کی تحقیقات استناد کا درجہ رکھتی ہیں، خصوصاً علم العین سے متعلق اس کے تحقیقی کاموں کو مرجع وماخذ کی حیثیت حاصل ہے، اس لیے کہ یہ موضوع اس کا اہم تحقیقی مجال ہے۔ کتاب العشر مقالات فی العین مصنفہ حنین بن اسحاق (مطبوعہ ۱۹۲۸ء) کتاب المرشد فی الکحل، مصنفہ محمد بن قسوم بن اسلم غافقی (مطبوعہ ۱۹۳۳ء) کتاب المسائل فی العین مصنفہ حنین بن اسحاق، The History of Trachoma Treatment in Antiquity & During Arabic Middle Ages (1936) اور A Short History of Ophthalmia During the Egyptian Compaigns of 1798-1807 (1932) اِس سلسلہ کے اُس کے اہم کام ہیں۔ علم العین سے متعلق اس عظیم مستشرق کی درج بالا کتب، طب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ حالانکہ دیگر موضوعات پر بھی اس کی نگارشات ہیں، جن کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔

حنین بن اسحاق کی شہرت ایک مترجم کی حیثیت سے ہے، 'کتاب العشر مقالات فی العین' جو امراضِ چشم کے حوالہ سے ابتدائی کاوشوں میں شمار ہے۔ حنین کی یہ کوشش نہ صرف 'طب العین' کے ذخیر کا اہم سرمایہ ہے، بلکہ اس موضوع کی وہ پہلی تالیف ہے، جس کی روشنی میں Ophthalmology کی تعمیر وترقی عمل میں آئی۔

میکس مائرہوف نے طب العین کے سلسلہ میں جب تفتیش شروع کی تو اسے متعدد کتابوں میں 'عشر مقالات' کا حوالہ اور ذکر ملا، جیسے تذکرۃ الکحالین وغیرہ میں۔ مگر تلاشِ بسیار کے بعد ان دس مقالوں کا سراغ نہ ملا، حقائق کے متلاشی مائرہوف کی کوشش رنگ لائی اور اس نے دس مقالوں کو جمع کر ہی لیا۔ حنین کے یہ دس مقالے دیگر زبانوں کے تراجم میں محفوظ تھے، جس کو قسطنطیہ کے افریقی پادری قرطجنہ (وفات: ۱۰۸۷ء) نے لاطینی زبان میں ترجمہ کر کے

اپنے نام سے شائع کرلیا تھا۔اس علمی سرقہ کا انکشاف مائرہوف کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔اس نے اس ترجمہ کی مدد سے دس مقالہ مکمل کر کے ۱۹۲۸ء میں شائع کیا۔

ہندستان میں اس کتاب کی اشاعت کا سُراغ علامہ کبیر الدین کے ذریعہ ہوا، انہوں نے شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی سے اس کتاب کا تذکرہ کیا، چنانچہ فلسفی صاحب نے ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے، جب وہ بیروت کے سفر پر جارہے تھے، اس کتاب کے لانے کی فرمائش کی۔ذاکر صاحب کو یونانی طب سے بے حد دلچسپی تھی۔ابن سینا کے مشہور رسالہ 'الادویۃ القلبیہ' کا ترجمہ بھی ان کی تحریک کا نتیجہ ہے۔الغرض ذاکر حسین صاحب کتاب لائے اور ترجمہ کے لیے شفاء الملک حکیم عبداللطیف صاحب کی نگاہِ انتخاب حکیم محمد طیب پر پڑی، اس طرح حکیم محمد طیب صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کیا اور مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ سے ۱۹۵۷ء میں اس کی اشاعت عمل میں آئی۔

حکیم محمد طیب صاحب کے اس کام کو محض ایک ترجمہ سمجھنا بڑی کوتاہ بینی ہے۔طیب صاحب نے آج سے تقریباً چھ دہائی پہلے محسوس کیا کہ طب کی بیشتر چیزیں دستبرد زمانہ ہورہی ہیں، اس ترجمے کے ذریعہ انہوں نے ان متروک ہورہے شعبوں کے احیاء (Revival) کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہا ہے، وہ اپنے وقت کے ایک حاذق طبیب کے علاوہ ماہر معلم بھی تھے، ان کا ہرگز یہ مقصد نہ رہا ہوگا کہ اس ترجمہ سے طب میں اپنا علمی لوہا منوائیں۔

'کتاب العشر مقالات فی العین' دس مقالوں پر مشتمل ایک مجموعہ ہے۔ویسے تو یہ ایک ترجمہ ہے لیکن بنظر غائر جب ورق بینی کی جاتی ہے تو اصل تالیف معلوم ہوتا ہے۔ترجمہ اپنے آپ میں ایک مشکل عمل ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ''خوب پیو ورنہ اس مقدس چشمے کو ہاتھ نہ لگاؤ'' اس اقتباس سے ترجمہ کے کام کی سنجیدگی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔میری ناقص رائے میں حکیم صاحب کا یہ کام طب کے منفرد اور غیر معمولی کاموں میں سے ایک ہے، جس کو بنظر استحسان دیکھنا چاہیے، یہ ایک جامع اور مکمل مسودہ (Draft) ہے، اس کو من وعن انڈر گریجویٹ

نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے، تا کہ طب کے طالب علموں کو یہ باور ہو سکے کہ علم العین کا بیش بہا ذخیرہ ان کے گھر میں بھی موجود ہے۔

حکیم موصوف نے اس ترجمہ میں اطبائے متقدمین کی تشریحی لغزشوں کا استدراک بھی کیا ہے، مثلاً جالینوس کی اتباع میں حنین بن اسحاق کا یہ کہنا کہ عدسہ (Lense) مقلۂ چشم کے وسط میں واقع ہے اور بصارت (Vision) کا اہم ذریعہ ہے۔ شبکیہ (Retina)، عصب بصری (Optic nerve) کا آخری منتشر حصہ ہے، اس کے علاوہ جسم ہدبی (Ciliary Body) سے طبقہ عنبیہ (Iris) کی تفریق نہ کر کے ذکر کرنا وغیرہ۔ جس سے ان کی علمی اور فنی حذاقت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مستشرقین کا یہ کہنا کہ عرب اطباء نزول الماء (Cataract) اور زرق الماء / ماء اخضر (Glaucoma) سے ناواقف تھے، ایک کھلا مذاق ہے۔ حکیم طیب صاحب نے نہ صرف ان کے غلط دعووں کی تردید کی ہے، بلکہ ان موضوعات پر مدلل اور عالمانہ انداز میں گفتگو کر کے یہ ثابت کر دیا کہ آج علم العین سے متعلق جو مواد ملتا ہے وہ انہیں اطباء متقدمین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اطباءِ متقدمین مذکورہ امراض سے کلّی طور پر واقف ہی نہیں تھے بلکہ یہ بھی جانتے تھے کہ، جراحی کہاں کرنی ہے اور کہاں علاج بالدواء پر اکتفا کرنا ہے۔ یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اُس دور میں Ophthalmoscope کی ایجاد نہیں ہوئی تھی، اس لیے اس کی کلی تشریحی مرضیات (Gross pathoanatomy) کا علم زیادہ وسیع نہیں تھا۔

توضیح و تشریح کے باب میں جن خاکوں اور اشکال سے مدد لی گئی ہے، اس سے امراض کے افہام و تفہیم میں کافی مدد مل رہی ہے۔ یہ خاکے اور اشکال آج کے خاکوں کو بنیاد فراہم کر رہے ہیں۔

حکیم محمد طیب صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے نہ صرف اردو داں طبقہ کو علم العین سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں، بلکہ اس کے ذریعہ پہلی بار طبی حلقہ کو اس موضوع کی اولین کاوش سے واقف ہونے کا موقع عطا کیا ہے، حکیم صاحب کی اس کوشش کو طب یونانی میں علم العین

کے ماخذ کے طور پر اطباء کی دلچسپی کا محور ہونا چاہیے تھا، مگر ہماری بد مذاقی اور علمی بے رغبتی کے باعث خاطر خواہ توجہ سے یہ کتاب محروم رہی۔

اس وقت یونانی طب جن المیوں سے دو چار ہے، ان میں سب سے اہم مسئلہ اس کی سکڑتی زمین کا ہے، علاج بالتدبیر، علم الجراحت، علم قبالت اور امراضِ نسواں واطفال وغیرہ سے اطباء کی دستبرداری اس کی بیّن مثالیں ہیں، اسی متروک سلسلہ کا ایک شعبہ 'علم العین' بھی ہے، جسے یونانی طبیبوں نے اپنے دائرۂ عمل سے خارج کر رکھا ہے، پیش رفت کے برعکس معکوس روی کا یہ رویہ بے حد افسوس ناک ہے، ایسے حالات میں کسی نئے موضوع پر تحقیق سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ اِن میدان ہائے عمل میں دوبارہ سرگرمیاں شروع کی جائیں اور ایسے متروک شعبوں کی تجدیدِ نو اور احیاء کیا جائے۔

حکیم محمد طیب صاحب

حکیم شمیم ارشاد اعظمی

لکچرر شعبۂ علم الادویہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور

حکیم محمد طیب صاحب کا قد میانہ، بدن گٹھیلا، چہرہ گول اور وقار و تمکنت سے بھرپور تھا۔ عینک کے پیچھے بولتی ہوئی روشن آنکھوں والے حکیم صاحب، بیٹھتے تو بالکل تن کر، جس میں رعونت نہیں، بلکہ ایک قسم کا شخصی وقار جھلکتا تھا۔ بولتے کم تھے، مگر جب علمی وفنی بحث ہوتی تو خوب بولتے۔ گفتگو نہایت ہی مدلل اور متوازن ہوتی۔ لہجہ میں غضب کا اعتماد تھا۔ صاف گوئی کبھی کبھی دل شکنی کا بھی باعث ہو جایا کرتی تھی۔ حج کے بعد داڑھی نے چہرہ کو اور پُر وقار بنا دیا تھا۔ پروگراموں میں اکثر شیروانی اور علی گڑھ پائجامہ زیب تن فرماتے تھے۔ پینٹ شرٹ بھی پہنتے تھے۔

حکیم محمد طیب صاحب یوں تو ایک سخت مزاج کے طور پر مشہور تھے، لیکن جو لوگ انہیں قریب سے جانتے ہیں وہ ان کے شفقت بھرے انداز سے بھی واقف ہوں گے۔ اصول کی پابندی اور وقت کا صحیح استعمال ان کی زندگی کا خاص امتیاز تھا۔ وہ اپنی ذمہ داری نہایت لگن اور ایمانداری کے ساتھ انجام دیتے تھے، فرضِ منصبی سے سرِ مو انحراف نہیں کرتے تھے۔ مکر و فریب سے معرّیٰ تھے، تملق اور خوشامد کا ان کے یہاں کوئی کالم نہیں تھا، اسی وجہ سے اکثر لوگ باریابی کے باوجود نامراد و ناکام لوٹتے تھے۔ ہمیشہ سچ بات کی وکالت کرتے تھے، انہوں نے اپنے اصولوں سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا، چاہے وہ ذاتی زندگی رہی ہو یا کالج کے انتظامی امور۔

ڈسپلن شکنی ان کو سخت ناپسند تھی، اسی بنا پر انہیں سخت گیر قسم کا انسان سمجھا جاتا تھا۔ ان کے شاگردوں سے سنا ہے کہ جب وہ موڈ میں ہوتے تو محبت، شفقت اور ظرافت بھری باتیں کرتے تھے اور استاذ و شاگرد کا فرق مٹ جایا کرتا تھا۔

راقم کو جب ۲۰۰۴ء میں اجمل خاں طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ترجمان 'آئینۂ طب' کا ایڈیٹر بنایا گیا تو نامورانِ اجمل خاں طبیہ کالج کے عنوان سے ایک گوشہ نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ اس سلسلہ میں حکیم محمد طیب صاحب کی خدمت میں بھی حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ جب میں نے مدعا بیان کیا تو فرمانے لگے کہ میرے پاس ہے ہی کیا کہ میں لکھوں۔ لکھنے والے بہت ہیں، ان سے لکھوالو۔ اس کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے سیمناروں میں بھی ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ ایک بار دہلی میں ایک سیمینار کے موقع پر ملاقات ہوئی، میں نے اپنا تعارف کرایا کہ حکیم ارشاد احمد (اعظم گڑھ) کا بیٹا ہوں اور علی گڑھ میں زیر تعلیم ہوں، انہوں نے بس اتنا کہا کہ اچھی بات ہے اور ارشاد کیسے ہیں؟ یہ تھی مختصر گفتگو۔ گفتگو اتنی ہی فرماتے جس قدر ضرورت ہوتی۔ غیر ضروری بات کرنے کے عادی نہیں تھے، یہی وجہ تھی کہ جو لوگ ان کے ملاقاتی تھے وہ بھی زیادہ دیر ان کے پاس ٹھہر نہیں پاتے تھے۔

حکیم محمد طیب صاحب کی شخصیت بہت متنوع تھی۔ مصنف، منتظم، محقق، معلم اور معالج، بیک وقت یہ ساری ہی خصوصیات ان کے اندر موجود تھیں۔ ۷/جنوری ۱۹۳۲ء کو بارہ بنکی، اتر پردیش میں پیدا ہوئے۔ ہائی اسکول کرنے کے بعد آرٹ اور سائنس کے مضامین میں علاحدہ علاحدہ انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ مولوی کا بھی امتحان پاس کیا تھا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد کچھ دنوں لکھنؤ میں طب کی تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد اجمل خاں طبیہ کالج میں داخلہ لے کر بیچلر آف یونانی طب اینڈ سرجری (BUTS) فرسٹ ڈویزن سے پاس کیا۔ معالجات اور تشخیصِ عملی جیسے مضامین میں امتیازی نمبرات حاصل کیے۔ ۵۴-۱۹۵۳ء میں ہاؤس فیزیشن بنائے گئے۔ دوران ملازمت فرسٹ ڈویزن اور فرسٹ پوزیشن سے بی اے اور ایم اے پاس کیا۔ اس کے بعد فارسی کی عالمی شہرت یافتہ شخصیت پروفیسر نذیر احمد صاحب کی نگرانی میں ۱۹۷۰ء میں پی ایچ ڈی کی۔

طبی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ۱۹۵۴ء میں تشخیص عملی میں لکچرر کے طور پر تقرر ہوا، اس کے بعد

۱۹۶۶ء میں معالجات کے ریڈر مقرر ہوئے اور ترقی کر کے ۱۹۷۳ء میں کالج کے پرنسپل بنائے گئے۔ ۱۹۷۹ء میں شعبۂ علم الادویہ میں پروفیسر ہوئے۔ فیکلٹی آف یونانی میڈیسن کے قیام کے بعد ۱۹۸۷ء میں اس کے اوّلین ڈین بنائے گئے۔ ان کی نگرانی میں شعبۂ علم الادویہ میں نصف درجن سے زائد تحقیقی مقالات تکمیل پائے۔

حکیم محمد طیب کا طریقۂ درس بہت مقبول و مشہور تھا۔ طب یونانی اور طبِ جدید، دونوں پر ان کو یکساں عبور حاصل تھا، افہام و تفہیم کی غرض سے طبّی نظریات کو جدید طب کے تناظر میں سمجھاتے، ان پر نقد و نظر بھی کرتے اور تشریح و توضیح بھی فرماتے۔ آج بھی ان کے شاگرد اُن کے پڑھائے ہوئے نوٹس کو حرزِ جان بنائے ہوئے ہیں۔ راقم نے ان کا مفردات کا نوٹ دیکھا ہے، جس میں ادویہ کی ماہیت، مزاج، افعال و خواص اور جدید تحقیقات سے متعلق بہت ہی نفع بخش اور ٹھوس معلومات فراہم کی گئی ہیں، اگر اسے شائع کرا دیا جائے تو یہ مفردات کی ایک اہم اور مفید کتاب ہو سکتی ہے۔

پیرانہ سالی کے باوجود وہ ہمیشہ چاق و چوبند رہتے تھے۔ امیر نشاں، دودھ پور، علی گڑھ میں مطب فرماتے تھے۔ ان کو علاج و معالجہ میں شروع سے ہی دلچسپی تھی۔ شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی صاحب کے مطب میں بیٹھ کر انہوں نے فنّی مہارت حاصل کی اور علاج و معالجہ کے اسرار و رموز سیکھے۔ مرض کی تشخیص اور علاج میں ان کو کمال حاصل تھا۔ ان کے پاس مختلف خطوں اور علاقوں سے مریض علاج کے لیے آتے اور صحت یاب ہو کر جاتے تھے۔ ان کا شمار علی گڑھ ہی نہیں، بلکہ ہندوستان کے چند پڑھے لکھے اطباء میں تھا۔ مزاج سیمابی تھا لیکن اس کے باوجود مریض ان سے علاج کروانا پسند کیا کرتے تھے اور ان کی تلخ نوائی کو شربتِ شفا سمجھ کر پی جایا کرتے تھے۔ دور دراز سے جب مریض ان کی خدمت میں علاج کے لیے حاضر ہوتا تو سب سے پہلے اس علاقہ کے مشہور طبیب کا نام لے کر فرماتے کہ ان سے کیوں نہیں علاج کرایا، یہ بھی کہتے کہ میرے پاس کیا رکھا ہے کہ اتنی دور سے علاج کے لیے آ گئے۔ اس سے دوسرے اطباء کے تئیں ان کے اکرام کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے مریض جو برسوں سے مشہور و معروف اسپتالوں میں

علاج کروا چکے ہوتے اور تھک ہار کر حکیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تو حکیم صاحب اپنے مخصوص انداز میں پہلے مریض کے تیمارداروں کو ڈانٹ پلاتے، اس کے بعد نسخہ تجویز فرماتے تھے۔ کئی ایسے مریضوں کے بارے میں سنا ہے، جن کا ایمس (دہلی) اور سنجے گاندھی میڈیکل انسٹی ٹیوٹ (لکھنؤ) کے ماہرین علاج کرنے سے قاصر رہے، وہ حکیم صاحب کی خدمت میں آئے اور شفایاب ہوئے۔ ان کے نسخے مختصر اور تیر بہدف ہوتے تھے، ان نسخوں کے ایک دوبار کے استعمال سے ہی فائدہ ہو جایا کرتا تھا۔ امراضِ مخصوصہ کے علاج میں ان کو خاص مہارت حاصل تھی، اس کے علاوہ نظامِ ہضم، امراضِ جگر، وجع المفاصل، لقوہ و فالج کے مریض دور دور سے علاج کے لیے ان کے پاس آتے تھے۔ حکیم صاحب نہایت ہی ایمانداری سے مریضوں کا علاج کرتے تھے، بعض خالص پیشہ ور قسم کے حکماء کی طرح محض پیسہ کمانے کی غرض سے ہر قسم کے امراض کا علاج نہیں کرتے تھے، بلکہ حاذقانہ تشخیص کے بعد وہ امراض، جن کا شافی علاج یونانی میں موجود نہیں ہے، کے مریضوں کو ایمانداری کے ساتھ ایلوپیتھی کے ماہرین کے پاس بغیر جھجک ریفر کر دیا کرتے تھے۔ حکیم محمد طیب صاحب کے نسخے اور مجربات کئی حضرات کے پاس موجود ہیں، اگر انہیں یکجا کر کے مجموعہ تیار کر دیا جائے تو نہایت مفید کام ہوگا۔

حکیم محمد طیب صاحب ہندوستان کی سب سے قدیم طبی تنظیم، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کے شروع ہی سے ایک فعال رکن رہے۔ طویل عرصہ تک نائب صدر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس میں ان کی رائے کو پسند کیا جاتا تھا۔ حکیم عبدالحمید صاحب ان کی آرا اور خیالات کی بہت قدر کرتے تھے۔ حکیم عبدالحمید کے انتقال کے بعد حکیم محمد مختار اصلاحی کو آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کا صدر بنایا گیا، لیکن حکیم اصلاحی صاحب خرابیٔ صحت کے باعث کانفرنس کو خاطر خواہ وقت نہ دے سکے اور اپنا چارج حکیم محمد طیب صاحب کو دے دیا۔ ۲۰۰۶ء میں حیدرآباد کے اجلاس میں حکیم محمد طیب صاحب کو مستقل طور سے اس عظیم طبی آرگنائزیشن کا صدر منتخب کیا گیا، لیکن حکیم محمد مختار اصلاحی کی طرح حکیم محمد طیب صاحب بھی معالجاتی مشغولیت کے

باعث آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس کو زیادہ وقت نہیں دے پائے۔

مختلف آرگنائیزیشنز اور اداروں نے ان کے وسیع تجربات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ کئی تنظیموں سے ان کی وابستگی رہی ہے۔ وہ ریجنل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ کے پہلے کوآرڈینیٹر رہے ہیں۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن، دہلی کی گورننگ باڈی کے ممبر اور اس کی سائنٹیفک ایڈوائیزری کمیٹی کے ممبر رہنے کے ساتھ ساتھ سی آئی ایم کی ایجوکیشنل کمیٹی کے چیرمین بھی تھے۔ ورکنگ گروپ آف انڈین سسٹم آف میڈیسن، گورنمنٹ آف انڈیا کے ممبر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی تھیں۔ سنٹرل کونسل فار ریسرچ ان یونانی میڈیسن میں Clinical Research کے لیے جن دواؤں رفارمولوں کا انتخاب کیا گیا، اس میں حکیم محمد طیب کا اہم رول رہا ہے۔ اسی طرح دواخانہ طبیہ کالج، مسلم یونیورسٹی کے کئی پیٹنٹ نسخے بھی ان کے مرتب کردہ ہیں۔ انعاشین، مفصلین، کبدین، ستاوری، اعصابی وغیرہ اس کی روشن مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ حکیم محمد طیب صاحب نے دواخانہ طبیہ کالج کے مشہور پروڈکٹ ''دماغین'' کے اندر برہمی جیسی دوا کا اضافہ کیا ہے۔ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے میڈیکل پینل کے بھی ممبر رہے ہے۔ اس کے علاوہ فیکلٹی آف انڈین میڈیسن، یونیورسٹی آف دہلی، بورڈ آف اسٹڈیز نظامیہ طبیہ کالج حیدرآباد، گورننگ باڈی نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور کے بھی ممبر تھے۔

حکیم محمد طیب صاحب کو اردو، فارسی اور انگریزی تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ وہ بنیادی طور پر علاج و معالجہ کے آدمی تھے، اس کے باوجود لکھنے پڑھنے کا وقت نکال لیا کرتے تھے۔ ان کی بیشتر کتابیں ابتدائی دور کی یادگار ہیں۔ بعد میں معالجاتی مصروفیت نے تصنیف و تالیف کا وقت ہی نہ دیا کہ مزید کچھ لکھ سکیں۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں مضامین لکھنے پر قادر تھے۔ سیمناروں اور کانفرنسوں کے موقع پر پیش کیے جانے والے خطبات و مقالات انگریزی میں ہوا کرتے تھے، مگر ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ بہتر ہوتا کہ ان کی تمام تحریروں کو یکجا کر دیا جاتا، یہ ایک مستحسن قدم ہوتا۔ انہوں نے دیگر مصنفین کی کتابوں پر مقدمے بھی تحریر فرمائے ہیں۔

حکیم سید محمد کمال الدین حسین ہمدانی کی مرتب کردہ کتاب 'مطب لطیف' میں انہوں نے بہت ہی عالمانہ مقدمہ تحریر کیا ہے، جو کئی صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب شفاء الملک حکیم عبداللطیف فلسفی صاحب کے نسخہ جات و معمولات کا مجموعہ ہے۔ اس مقدمہ میں حکیم محمد طیب صاحب نے فلسفی صاحب کی فنی مہارت اور طبی حذاقت کے کچھ واقعات بھی نقل فرمائے ہیں نیز علاج و معالجہ سے متعلق عمدہ اور مفید بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ راقم نے دو تین کتابوں پر لکھے ہوئے ان کے مقدمے دیکھے ہیں، جو مختصر مگر جامع ہیں۔ ان کی کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ چین میں قدیم طب (۱۹۵۵ء)

۲۔ علم العین اور اطباء قدیم (۱۹۵۷ء)

۳۔ کتاب العشر مقالات فی العین (۱۹۵۷ء)

۴۔ قانون صحت (۱۹۶۱ء)

۵۔ اطباء قدیم کے کلینکی مشاہدات (۱۹۷۱ء)

۶۔ فلاسفی آف گریکو عرب میڈیسن (۱۹۸۳ء)

موخر الذکر ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ یہ چھوٹی تقطیع کے محض ۱۴ ارصفحات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح علم العین اور اطباء قدیم بھی چھوٹی تقطیع کے ۶۳ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں علم العین سے متعلق اطباء قدیم کی کتابوں اور ان کی خدمات کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ قانونِ صحت کی حیثیت ایک طبع زاد کتاب کی ہے، جس میں حفظانِ صحت سے متعلق تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ یہ طبی درسیات کی مقبول کتاب رہی ہے۔ اطباء قدیم کے کلینکی مشاہدات، ان کی سب سے اچھی کتاب ہے۔

چین میں قدیم طب اور کتاب العشر مقالات فی العین جیسی کتابوں کو اردو کا جامہ پہنا کر انہوں نے طبی ترجمہ نگاری کو فروغ دیا ہے۔ ان کی کوششوں سے طبی دنیا حنین بن اسحاق کی مشہور کتاب 'کتاب العشر مقالات فی العین' سے روشناس ہوئی۔

حکیم محمد طیب صاحب کا علاج و معالجہ کے ساتھ اردو زبان سے بہت گہرا تعلق تھا، وہ اردو کے

گرتے ہوئے معیار کے بارے میں بہت فکر مند تھے، ان کو اس بات کا افسوس تھا کہ ہمارے گھروں اور بول چال سے اردو ختم ہوتی جارہی ہے اور اس کی جگہ انگریزی زبان لے رہی ہے، جو ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ گھروں میں اردو اخبارات کی جگہ انگریزی اور ہندی کے اخبارات پڑھے جاتے ہیں جس کی وجہ سے نئی نسل اردو زبان سے نا آشنا ہوتی جارہی ہے، اس کا سدباب ہونا چاہئے۔ تلفظ کی ادائیگی پر کافی زور دیتے تھے، غلط تلفظ پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کرتے۔ حکیم صاحب کا خیال تھا کہ جب تک اردو زبان کو تعلیمی زبان کے طور پر استعمال نہیں کیا جائے گا، اس کا فروغ ناممکن ہے۔

حکیم صاحب کی اردو تحریریں ادب کا بہترین نمونہ ہیں۔ الفاظ کی برجستگی اور خوبصورت طرزِ ادا ان کے اسلوبِ نگارش کا نمایاں وصف ہے، تحریروں کی طرح ان کی اردو تقریروں میں بھی ادبی چاشنی ہوتی تھی، جو ان کے جوہرِ خطابت سے مل کر کانوں میں اتنی پُر تاثیر ہو جاتی کہ سامعین کے مجمع پر سکوت طاری ہو جاتا۔

ع خدا بخشے بڑی اچھائیاں تھیں مرنے والے میں

استاذی پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب۔ احوال و آثار

حکیم اقبال احمد قاسمی
ریڈر شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میرا داخلہ بی یو ایم ایس کورس میں ۷۶-۱۹۷۵ء کے تعلیمی سال میں ہوا، میں علی گڑھ آنے پر بہت خوش تھا، کچھ تو اس لیے کہ میرا داخلہ علی گڑھ میں ہوا تھا اور کچھ اس لیے کہ داخلہ امتحان میں میری پہلی پوزیشن تھی اور امتیازی کامیابی ملی تھی۔

اس دور میں ہندوستان میں چند ہی طبیہ کالج تھے اور اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ کی شان نرالی تھی اور اس کا ایک وقار اور تعلیمی معیار تھا۔

اساتذہ میں تبحر، طلبا میں متانت، ملازمین میں پابندئ وقت اور اپنی ڈیوٹی کا احساس، غرض کہ کالج کا سارا عملہ متحرک اور چاق و چوبند تھا۔

اس زمانہ میں صدرِ شعبہ Head of Department کہلاتے تھے اور ہمارے کالج میں ایک ہی شعبہ ہوتا تھا، شعبۂ یونانی طب و سرجری، اس کے صدر حکیم محمد افہام اللہ ہوتے تھے۔ البتہ کالج کی پرنسپل شپ کی اورنگ پر محترم حکیم محمد طیب صاحب متمکن تھے۔

حکیم افہام اللہ صاحب کا چہرہ کھلتا ہوا، تبسم ریز اور دوسری شخصیت جو حکیم محمد طیب صاحب کی تھی ان پر متانت و بردباری اور انتہائی سنجیدگی کی ایک کیفیت ہمیشہ طاری رہتی تھی۔ شاذ و نادر کسی طالب علم نے کبھی ان کو مسکراتے دیکھا ہو، الا ماشاء اللہ، پرنسپل صاحب کا زیادہ تر وقت اسپتال میں ہی گزرتا، کچھ دفتری کاموں کی وجہ سے اور کچھ اس لیے بھی کہ آپ بہت

پابندی و دل جمعی سے مریضوں کو دیکھتے اور فیض یاب فرماتے، علاوہ ازیں اسپتال کے انتظامی امور پر بھی ہمہ آن توجہ رہتی۔ حکیم افہام اللہ صاحب کے سبکدوش ہونے کے بعد جناب حکیم طیب صاحب نے کالج میں بیٹھنا شروع کیا۔

گوکہ استاذی حکیم محمد طیب صاحب انڈر گریجویٹ کو مفردات پڑھاتے تھے، لیکن ہم لوگوں کو اس کا موقع نہیں ملا اور ہمیں ادویۂ مفردہ، جناب مرحوم حکیم محمد رفیق الدین صاحب نے پڑھائی۔ البتہ پوسٹ گریجویشن میں ادویہ مفردہ پروفیسر حکیم محمد طیب سے پڑھنے کی سعادت مجھے بھی ملی، وہ ایک معتمد اور ماہرِ ادویہ استاذ تھے۔

استاذ محترم سے میری پہلی ملاقات جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج میں ایم ڈی علم الادویہ کے داخلہ کے لیے ہونے والے انٹرویو کی میز پر ہوئی، اس زمانہ میں ایم ڈی میں داخلہ کے لیے تحریری اور تقریری، دو امتحانات ہوتے تھے، دونوں کو الیفائی کرنا ضروری تھا، یہ کمیٹی ڈین فیکلٹی آف میڈیسن اور وائس چانسلر کے نامزد نمائندہ پروفیسر انتصار حسین اور طبیہ کالج کے صدرِ شعبہ پر مشتمل تھی، اس میں راقم سے استاذی پروفیسر طیب صاحب نے متعدد سوالات کیے اور میرے لیے باعث مسرت یہ تھا کہ انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا اور میرا داخلہ ہوا۔

اس زمانہ میں استاذ محترم تار بنگلہ میں رہتے تھے اور میں ان سے گاہے بگاہے ملتا رہتا تھا۔ وہ نہایت متین، سنجیدہ اور بارعب شخصیت کے مالک تھے اور ایک بااصول زندگی گزارتے تھے۔ اپنے زیادہ تر کام خود کرنے کے عادی تھے۔ وہ سخت اور کرخت لب و لہجے کے مالک تھے، اس لیے بہت سے لوگ ان کو ترش مزاج سمجھتے تھے، وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند اور علامہ اقبال کی تعبیر کے مومن تھے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب: کچھ یادیں، کچھ باتیں

پروفیسر مشتاق احمد
صدر چیر طب یونانی، ویسٹرن کیپ یونیورسٹی، ساؤتھ افریقہ
ترجمہ: ڈاکٹر سعود الظفر علی
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ علم الادویہ، آیورویدک اینڈ یونانی طبیہ کالج قرول باغ، دہلی

شمالی ہند کے مایہ ناز یونانی طبیب پروفیسر حکیم محمد طیب سے میری واقفیت اس وقت ہوئی جب میں نے ۱۹۶۹ء میں BUMS میں ایڈمیشن لیا، اس وقت وہ شعبۂ معالجات میں ریڈر تھے، جب کہ مرحوم حکیم عبدالحسیب صاحب اجمل خاں طبیہ کالج میں پرنسپل کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے تھے۔ ۱۹۷۲ء میں شعبۂ علم الادویہ میں پوسٹ گریجویٹ کورس کی ابتدا ہوئی تو حکیم عبدالحسیب مرحوم کو اس شعبہ میں بطور پروفیسر منتقل کر دیا گیا اور اس کی صدارتی ذمہ داری بھی تفویض کر دی گئی۔ جب کہ پرنسپل کے خالی عہدہ کا چارج ڈاکٹر بی آر شکلا صاحب کو دے دیا گیا، جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں شعبۂ علم العین کے استاذ تھے، کچھ دن بعد پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب نے مستقل پرنسپل کے طور پر ذمہ داری سنبھالی۔

علمی تبحر اور تدریس میں مہارت کی وجہ سے وہ طلبہ میں بڑے مقبول تھے اور احترام رکھتے تھے۔ مطب کی تدریس میں انہیں مہارت تھی، سریریاتی، تفتیشاتی اور ماہیت المرضی کیفیات اور اسباب کے بیان میں انہیں عبور حاصل تھا۔ طلبہ ان کے درس سے نہ صرف مطمئن نظر آتے، بلکہ

موضوع سے متعلق نئی جہتوں سے روشناس ہوتے۔فن پر ان کی گرفت تھی اور فنی مطالب کے اظہار کا بھی وہ ملکہ رکھتے تھے۔اس خوبی کی وجہ سے وہ دوسرے اساتذہ سے ممتاز نظر آتے۔دوسروں کے علی الرغم پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب یونانی طب کی معالجاتی حدود کے قائل تھے۔وہ تشخیص، معالجہ اور ادویہ کے میدان میں ہو رہی نت نئی ایجادات واختراعات سے بھی آگہی رکھتے تھے۔شمالی ہند کے صوبہ اتر پردیش میں وہ ایک معروف یونانی معالج اور طبیب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔صوبہ بھر کے مریضوں نے ان سے استفادہ کیا اور اُن سے اپنے دکھوں کا مداوا پایا ہے۔مزاجی درشتی کے باوجود فنی حذاقت کی وجہ سے مریض نہ صرف انہیں انگیز کرتے، بلکہ انہیں قدر واحترام کی نظر سے دیکھتے۔طبیہ کالج ہسپتال میں ان کی او پی ڈی کے باہر یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کی لمبی قطار ہوتی۔میں نے خود کئی عسیر العلاج مریضوں کو یہ کہتے سنا کہ انہیں حکیم صاحب کے علاج سے شفاء ہوئی ہے، حالانکہ پہلے وہ کئی طبیبوں سے رجوع کر چکے تھے اور دوسرے طریقہ علاج بھی اختیار کر چکے تھے۔مطب سے پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی دلچسپی کا عالم یہ تھا کہ شعبۂ علم الادویہ میں تقرر کے بعد بھی ہفتہ میں تین روز او پی ڈی کرتے رہے اور ان کے یہاں دوسرے شعبوں جیسے معالجات، نسواں وقبالت اور جراحت کی او پی ڈی سے زیادہ بھیڑ رہتی۔شعبۂ ادویہ سے منسلک ہونے بعد وہ یہاں کے ریسرچ اسکالرز کے درمیان سب سے زیادہ مقبول رہے۔اُن کے درس میں طلبہ کی حاضری صد فی صد رہتی۔ان کی کلاس سے کسی کا غیر حاضر رہنا نہ صرف خلاف معمول تھا، بلکہ یہ غیر معمولی بات تھی۔پروفیسر حکیم محمد طیب کا شمار یونیورسٹی کے بہترین منتظمین میں تھا، اُن میں انتظامی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔وہ انتظامی قوانین پر گہری نظر رکھتے تھے اور انگریزی زبان پر انہیں خاطر خواہ قدرت حاصل تھی۔انگریزی تقریر وتحریر کے لیے وہ یونیورسٹی کے معدودے چند لوگوں میں سے تھے۔

پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کی شخصیت میں انا پرستی کا عنصر نمایاں تھا۔یہ انا پرستی اُن میں، خودداری اور عزتِ نفس کی پاسداری کی وجہ سے آ گئی تھی۔وہ زندگی میں کبھی submassive نہیں رہے اور اپنے کو کسی سے کم نہیں سمجھا، خواہ سامنے والا کتنے ہی بڑے

عہدے پر ہو۔ پی وی سی اور وی سی تک کے سامنے وہ محکومانہ انداز میں پیش نہیں ہوئے۔ کبھی یونیورسٹی کے کسی عہدہ کے طالب نہیں رہے، نہ کبھی اس کے انتظامی مناصب پرووسٹ، پراکٹر، ڈی ایس ڈبلیواور پی وی سی کے عہدے قبول کیے۔ بے پناہ صلاحیت کے باوجود کبھی یونیورسٹی کے عہدیداروں سے ان کی قربت نہیں رہی۔

مجھے وہ دن بھی یاد ہے کہ طبیہ کالج میں معاون حکیم کی ایک پوسٹ کے انٹرویو کے لیے پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کو پرووائس چانسلر کے دفتر میں مقررہ وقت پر پہنچنا تھا۔ وہ پانچ دس منٹ پہلے ہی پہنچ گئے، مگر وقت پر انٹرویو شروع نہیں ہوسکا۔ اس کا وقت گزرنے کے کچھ دیر بعد انہوں نے پرووائس چانسلر کے سکریٹری سے کہا کہ وقت سے زیادہ انتظار کی میری عادت نہیں ہے، اس لیے جارہا ہوں، اگر سلیکشن کمیٹی میں میری موجودگی ضروری ہوتو کوئی نئی تاریخ طے کرلی جائے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ پرووائس چانسلر، جنہیں اس سلیکشن کمیٹی کی صدارت کرنی تھی، اپنے آفس میں کسی ضروری میٹنگ میں مصروف تھے، جیسے ہی فارغ ہوئے، انہوں نے سلیکشن کمیٹی کے ممبران کو اپنے آفس میں مدعو کیا۔ اس وقت اُن کے سکریٹری نے بتایا کہ پروفیسر حکیم طیب صاحب انتظار کرکے جاچکے ہیں۔ پرووائس چانسلر کے کہنے پر سکریٹری نے جب طیب صاحب کو دوبارہ بلانے کے لیے فون کیا تو انہوں نے صاف منع کردیا کہ اب وہ کسی اور کام میں مصروف ہیں، بالآخر سلیکشن کمیٹی ملتوی کردی گئی۔

پروفیسر ایم اے خسرو صاحب کی وائس چانسلرشپ کا زمانہ تھا۔ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب طبیہ کالج کے پرنسپل تھے۔ کالج کے کچھ غیر سنجیدہ طلبہ حکیم طیب صاحب کے کمرہ میں گھس کر کہنے لگے کہ طلبہ برادری آپ کے طریقۂ کار سے مطمئن نہیں ہے، اس لیے کہ آپ اُن کے مسائل کے حل میں ناکام رہے ہیں، لہٰذا آپ ازخود اس عہدہ سے دستبردار ہوجائیں، یہ سن کر انہوں نے طلبہ سے کہا کہ اس پر آپ لوگ ایک بار پھر غور کرلیں اور آدھے گھنٹہ بعد مجھے اپنی رائے بتائیں۔ نصف گھنٹہ بعد وہ طلبہ دوبارا آئے اور اپنا مطالبہ دہراتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ اس عہدہ سے ہٹ جائیں تاکہ کوئی دوسرا مناسب شخص اس منصب پر کام کرسکے۔ اسی وقت پروفیسر

حکیم محمد طیب صاحب نے اپنے پی اے کو بلا کر درج ذیل مضمون کا ایک خط وائس چانسلر کو لکھوایا:

''مجھے طلبہ کے ایک گروہ نے بتایا گیا کہ ان کی جنرل باڈی کی میٹنگ میں یہ فیصلہ لیا گیا
ہے کہ میں پرنسپل کے عہدہ سے دستبردار ہو جاؤں، چونکہ آپ حاکمِ مجاز ہیں، اس لیے
میری درخواست ہے کہ پرنسپل شپ کی ذمہ داریوں سے مجھے آزاد فرمائیں''۔

درج بالا مفہوم کا لیٹر ڈرافٹ کروا کے حکیم طیب صاحب نے پی اے سے کہا، اسے تیار کر کے میری رہائش گاہ پر دستخط کے لیے بھیج دے۔ یہ کہہ کر وہ دفتر سے گھر آگئے۔ میرا گمان تھا کہ وہ اس پر دستخط نہیں کریں گے، لیکن اس وقت حیرت کی انتہا نہیں رہی، جب پی اے اسے لے کر ان کے گھر پہنچا تو انہوں نے بغیر پس وپیش کے دستخط کر دیے اور ہدایت دی کہ دفتر کی معرفت اسے فوراً ارسال کر دے۔ اگلے دن وہ دفتر نہیں آئے اور اپنے استعفیٰ کی منظوری کا انتظار کرتے رہے۔ کالج میں ان کے استعفیٰ کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ اسی وقت کالج کے طلبہ بڑی تعداد میں جمع ہو کر حکیم طیب صاحب کی رہائش گاہ پہنچے اور اُن سے کالج اور یونیورسٹی کے مفاد میں استعفیٰ واپس لینے کا اصرار کرنے لگے، لیکن انہوں نے ایسا کرنے سے منع کر دیا اور کہا کہ اب اُسی صورت میں کالج آئیں گے کہ اُن کا استعفیٰ مسترد ہو جائے۔ یہ سن کر طلبہ کے جم غفیر نے وائس چانسلر پروفیسر ایم اے خسرو صاحب سے مل کر یہ مطالبہ رکھا کہ حکیم طیب صاحب کا استعفیٰ ہرگز منظور نہ کیا جائے اور انہیں اپنے منصب پر بنے رہنے کا حکم دیا جائے۔ شیخ الجامعہ خود حکیم طیب صاحب کی صلاحیتوں کے معترف تھے اور سمجھتے تھے کہ ان کا کوئی بدل نہیں ہے، لہٰذا اسی وقت تحریری حکم جاری کیا کہ ادارہ اور یونیورسٹی کے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے استعفیٰ کی یہ درخواست مسترد کی جاتی ہے، اس لیے بدستور اپنے منصبی فرائض انجام دیتے رہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ پرنسپل شپ سے استعفیٰ کا مطلب یونیورسٹی کی ملازمت سے دستبردار ہونا تھا، اس لیے کہ طبیہ کالج میں پرنسپل شپ ایک مستقل عہدہ ہے جو اپنی علاحدہ حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب کا یہ عمل ان کی دیانت داری سچائی، دلیری اور بہادری کا غماز ہے۔ چند غیر سنجیدہ طلبہ کے عدمِ اطمینان پر استعفیٰ کی پیش کش کر دینا بڑی جرأت کی بات ہے، کسی عام انسان سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

ایک بار نائب شیخ الجامعہ کے دفتر سے اطلاع آئی کہ شیخ الجامعہ سید حامد صاحب ملاقات کے خواہش مند ہیں، چنانچہ وہ وی سی آفس پہنچے، وہاں معلوم ہوا کہ کسی دفتری کام سے نہیں، بلکہ طبی مشورہ کے لیے بلائے گئے ہیں۔ تفصیلی معاینہ اور مرضی احوال سے آگہی کے بعد دوائیں اور ان کے استعمال کی ترکیب لکھ دیں اور نائب شیخ الجامعہ کے معاون سے کہا کہ انہیں بازار سے منگوالیں۔ عام طور پر یونیورسٹی کے اطباء اور ڈاکٹرس ایسے موقعوں پر خوشنودی کے لیے خود ہی دواؤں کا نظم کر دیتے ہیں، لیکن حکیم طیب صاحب نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا، اُن کا خیال تھا کہ وائس چانسلر کے لیے دوائیں فراہم کرنا طبیب کا کام نہیں ہے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اپنی خودداری اور عزت نفس کتنی عزیز تھی۔

۱۹۸۳ء میں حکومت ہند کے مرکزی ادارہ برائے تحقیق طب یونانی (CCRUM) میں ریسرچ آفیسر (یونانی) کی آسامیوں کے لیے کونسل کے مرکزی دفتر میں انٹرویو تھا۔ اس کے لیے مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ سب انٹرویو شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے، میں نے دیکھا کہ حکیم طیب صاحب آفس میں داخل ہو رہے ہیں، میں نے انہیں سلام کر کے دعا کے لیے درخواست کی، مجھے دیکھ کر فرمایا کہ تم یہاں کیسے؟۔ میں نے عرض کیا کہ ریسرچ آفیسر کے لیے میں بھی امیدوار ہوں، تعجب سے کہنے لگے کہ یہاں روایت ہے کہ کونسل اپنے معاون ریسرچ آفیسرز کو تین سال کی ملازمت کے بعد ہی ترقی دے کر ریسرچ آفیسر بناتی ہے، ابھی آپ کو معاون ریسرچ آفیسر کے طور پر کام کرتے ہوئے محض ایک برس ہوئے ہیں، تو انٹرویو کے لیے کیسے بلالیا؟ پھر کہنے لگے جب انٹرویو کے لیے بلایا ہے تو اب کونسل آپ کے سلیکشن کی مخالفت نہیں کرسکتی۔ خوش قسمتی سے اس انٹرویو میں بحیثیت ریسرچ آفیسر منتخب کرلیا گیا۔ اس کے ایک سال بعد، غالباً ۱۹۸۴ء میں کونسل کی ڈپٹی ڈائرکٹر ڈاکٹر اُم الفضل نے، جو سلیکشن کمیٹی میں موجود تھیں، بتانے لگیں کہ ڈاکٹر عبد الرزاق صاحب (ڈائرکٹر) ریسرچ آفیسر کے لیے میری تقرری پر راضی نہیں تھے، اس لیے کہ بطور معاون ریسرچ آفیسر ابھی میرے تین سال پورے نہیں ہوئے تھے، لہٰذا ریسرچ آفیسر کے عہدے کے لیے میرا انتخاب نہیں ہوسکتا تھا،

لیکن طیب صاحب کے دلائل اور سلیکشن کمیٹی میں ان کے گہرے اثر کی وجہ سے مجھے ریسرچ آفیسر کے طور پر تقرری مل سکی۔ محترمہ اُم الفضل نے مزید بتایا کہ حکیم طیب صاحب نے ڈائرکٹر کونسل کے سامنے یہ بات رکھی کہ جب ایک بار امیدوار کو انٹرویو کے لیے بلالیا گیا تو اب یہ سلیکشن کمیٹی کی ذمہ داری ہے، وہ فیصلہ کرے کہ کنڈیڈیٹ تقرری کا اہل ہے کہ نہیں!۔اس ضمن میں صرف کونسل کے ڈائرکٹر کی رائے کو اس کے ڈائرکٹر ہونے کی وجہ سے فوقیت نہیں دی جاسکتی۔ حالانکہ سلیکشن کمیٹی کے ممبران عام طور پر ادارہ کے سربراہ کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں لیتے، لیکن حکیم طیب صاحب کا معاملہ الگ تھا، وہ جرأت وشجاعت کا عملی نمونہ تھے۔ وہ اپنی خودداری اور عزتِ نفس کا پاس ولحاظ رکھنا جانتے تھے۔

حکیم محمد طیب صاحب کچھ سخت مزاج تھے، عموماً لوگ اُن سے نرم رویہ کی امید نہیں رکھتے تھے، لیکن حقیقتاً وہ ضرورت مندوں کی خاموش مدد کرنے کے عادی تھے، وہ حد درجہ ایمان دار تھے، کبھی کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا، خواہ وہ کسی عہدے پر فائز ہو۔ نہ ہی انہوں نے ذاتی مفاد کے لیے چاپلوسی کی۔ ایک بار ان کے چھوٹے بھائی یونیورسٹی میں M.Sc میں داخلہ کے امیدوار تھے، وہ چاہتے تھے کہ طیب صاحب شیخ الجامعہ پروفیسر کے اے نظامی صاحب سے رسم وراہ رکھتے ہیں، نامزدگی کی سفارش کردیں۔ اُس وقت جو داخلہ کے ضوابط تھے، ایسا کرنا مشکل نہیں تھا، اس زمانہ میں اس کا چلن بھی تھا، لیکن پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب نے صاف منع کردیا، اس لیے کہ وہ اسے غلط سمجھتے تھے۔ ایسے کردار کے حامل تھے پروفیسر حکیم محمد طیب صاحب۔ اُن سے اپنی وابستگی اور اپنی یادوں کی بنیاد پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بنیادی طور پر ایک ایمان دار اور بے حد خوددار شخص تھے۔ انہیں اپنی عزت نفس بہت عزیز تھے۔ پیشہ ورانہ حذاقت، مزاجی خودداری اور عزتِ نفس کی پاسداری کے لیے وہ عرصہ تک یاد کیے جاتے رہیں گے۔ اللہ انہیں جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

زندگی نامہ

نام — فخر عالم

قلمی نام — حکیم فخر عالم

تخلص — اختر

ولدیت — جناب حاجی بدرالدین صاحب

تاریخ پیدائش — 10 جنوری 1971م

وطنِ عزیز — موضع بھورمئو (تکیہ)، پوسٹ پھول پور، ضلع اعظم گڑھ، یوپی-276304

رابطے کا پتہ — ڈی، سکنڈ فلور، ثمرین اپارٹمنٹ، شاہ بشیر کالونی، ہادی نگر، دودھپور معافی، علی گڑھ، یوپی-202002

موبائل نمبر — 9411653041 / 7078281442

ای میل — fakhrealamx7598@gmail.com

تعلیم

☆ فضیلت، مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ

☆ بی یو ایم ایس، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

☆ ایم ڈی (علم الادویہ) شعبۂ علم الادویہ، فیکلٹی آف یونانی میڈیسن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

موجودہ ملازمت — ریسرچ آفیسر (یونانی)/سائنٹسٹ-4، سنٹرل کونسل فار ریسرچ اِن یونانی میڈیسن، وزارتِ آیوش، حکومت ہند، نئی دہلی

سابقہ ملازمتیں

☆ لکچرر زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج، پونہ

☆ یونانی اکسپرٹ، ٹی کے ڈی ایل، سی ایس آئی آر، دہلی

☆ میڈیکل آفیسر صوبہ اتر پردیش

تصنیفات وتالیفات

☆ طبی اخلاقیات (اشاعت:2023، این سی پی یو ایل، نئی دہلی)
☆ رموزِ دواسازی (اشاعت:2021/22/23، ادارہ علم وادب علی گڑھ)
☆ یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد [ایوارڈ یافتہ اتر پردیش اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی] (اشاعت:2019 اے آر انٹر پرائزز، نئی دہلی)
☆ اردو طبی مترجمین [ایوارڈ یافتہ اتر پردیش اردو اکیڈمی] (اشاعت:2017، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی)
☆ ہندوستان کی طبی درس گاہیں [ایوارڈ یافتہ مغربی بنگال اردو اکیڈمی] (اشاعت:2017، آل انڈیا یونانی طبی کانفرنس، دہلی)
☆ نشانِ اجمل (اشاعت:2016، البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی)
☆ رازیٔ ہند: پروفیسر حکیم محمد طیب (اشاعت:2013، الحکمہ فاؤنڈیشن، نئی دہلی)
☆ حکیم سید ظل الرحمان - ایک مطالعہ (اشاعت: نومبر 2010، ابن سینا اکاڈمی علی گڑھ)
☆ عکسِ خامہ (اشاعت 2008)

ترتیب وتدوین میں اشتراک

☆ نقوشِ اجمل، اشاعت 2017، سی سی آر یو ایم، وزارتِ آیوش حکومت ہند، نئی دہلی
☆ اسٹینڈرڈ یونانی ٹریٹمنٹ گائڈ لائن، جلد اول، اشاعت، 2014، سی سی آر یو ایم، وزارتِ آیوش، نئی دہلی
☆ اسٹینڈرڈ یونانی ٹریٹمنٹ گائڈ لائن، جلد دوم، 2016، سی سی آر یو ایم، وزارتِ آیوش، نئی دہلی
☆ تاریخ طب جلد اول، اشاعت 2022، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
☆ تاریخ طب جلد دوم، اشاعت 2023، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

ترجمہ وتدوین	☆ اردو وانگریزی ترجمہ رسالہ در خواص ومنافعِ ادویہ، نجیب الدین سمرقندی ☆ تدوین متن اور اردو ترجمہ علل الاعضاء الباطنہ، جالینوس ☆ تدوین متن اور اردو ترجمہ کتاب الیٰ اغلوقن، جالینوس ☆ اردو ترجمہ کتاب الجدری والحصبہ، ابوبکر محمد بن زکریا رازی ☆ ترجمہ وتحقیق رسالۂ خضاب، حکیم سید کرم حسین
مضامین ومقالات	☆ ہندوستان کے مؤقر تحقیقی رسائل وجرائد میں سو (100) سے زیادہ مضامین اور مقالات
کالم نگاری	☆ قومی سطح کے مختلف اخبارات میں صحتی وطبی موضوعات پر کالم نویسی
علمی مجالس	☆ ستر (70) سے زائد سیمینار، کانفرنس، ورک شاپ اور سمپوزیم میں شرکت
رسائل وجرائد سے وابستگی	☆ سابق رکن مجلسِ ادارت قلمی رسالہ، مدرسۃ الاصلاح ☆ سابق رکن مجلسِ ادارت سالانہ میگزین مدرسۃ الاصلاح ☆ سابق مدیر آفتاب ہال میگزین (اردو سیکشن) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ☆ سابق مدیر صدائے طب (سالانہ کالج میگزین زیڈ وی ایم یونانی میڈیکل کالج، پونہ) ☆ ریویور ترجمانِ طب، نوائے طب وصحت اور یونی میڈ کلیات
اعزازی رکنیت	☆ رکن مجلسِ مشاورت 'ترجمانِ طب'، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن، بنگلور ☆ رکن مجلسِ ادارت 'نوائے طب وصحت' الٰہ آباد ☆ رکن مجلسِ مشاورت ریکس طبی میگزین، دہلی ☆ آنریری فیکلٹی ایٹ رائل میڈیکو ٹیکنیکل سوسائٹیز، رائل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ سائنسز، نوی ممبئی، مہاراشٹرا ☆ رکن ریسرچ بورڈ آف سائنٹیفک ایڈوائزرس آف ابن سینا ریسرچ سنٹر فار یونانی میڈیسن، ممبئی

☆ رکن نصاب ایجوکیشن سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ریسرچ جرنل ان اردو (NESTRJU)[ISSN:2583-5246]

☆ ممبر مجلس منتظمہ ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

☆ ممبر مجلس عاملہ ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ

☆ ممبر سائنٹیفک کمیٹی آف انٹرنیشنل یونانی فورم

☆ اکسپرٹ فار ویلی ڈیشن آف یونانی فارمولیشن ان ٹی کے ڈی ایل، نئی دہلی

☆ رکن مجلس ادارت، یادگار مجلہ عالمی یوم یونانی میڈیسن 2023م، (حکیم محمد افہام اللہ: حیات و خدمات)، زیر اہتمام آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی

اعزازات وانعامات

☆ اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ 2017 برائے 'اردو طبی مترجمین'

☆ نواب واجد علی شاہ ایوارڈ 2017، مغربی بنگال اردو اکادمی، برائے 'ہندوستان کی طبی درس گاہیں'

☆ خلیل عباس صدیقی ایوارڈ 2019، مغربی بنگال اردو اکادمی، برائے 'یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد'

☆ اتر پردیش اردو اکادمی ایوارڈ 2019 برائے 'یونانی طب کا مغل اور برطانوی عہد'

☆ حکیم محمد اشرف میموریل ایوارڈ 2019 برائے اعلیٰ طبی خدمات، منجانب حکیم احمد اشرف میموریل سوسائٹی، حیدر آباد

☆ علامہ حکیم محمد کبیر الدین ایوارڈ 2019 برائے اعلیٰ طبی لٹریری خدمات، منجانب آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، دہلی

☆ ابن سینا انٹرنیشنل ایوارڈ 2020 برائے خدمات علم الادویہ، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، دہلی

☆ حکیم اجمل خاں گلوبل ایوارڈ 2021 برائے بہترین تنظیمی وسماجی طبی خدمات، منجانب مسیح الملک حکیم اجمل خاں میموریل سوسائٹی (رجسٹرڈ)

☆ محمد شفیع علیگ ایوارڈ برائے سائنسی ادب، منجانب یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا اینڈ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن، بموقع عالمی یومِ اردو، مورخہ 9 نومبر 2022

Razi-i Hind: Prof. Hakim Muhammad Taiyab

by

Hakim Fakhre Alam

ISBN: 978-81-940846-9-3

2024 # 500 Copies # 306 Pages

Published by :

Hakim Fakhre Alam

D- 2nd Floor,Samreen Apartment

Shah Basheer Colony,Hadi Nagar

Dhaurra Mafi, Aligarh, UP- 202002

fakhrealamx7598@gmail.com

Mob: 9411653041 / 7078281442

Under the Aegis:

Idara Ilm-o- Adab, Aligarh

Printe at :

A.R.Enterprises

E198,Jaitpur Extn.,New Delhi-44

Distributor :

Maktaba Jamia Ltd.

Shamshad Market

Aligarh,UP-202002

Razi-i Hind

Prof. Hakim Muhammad Taiyab

Hakim Fakhre Alam

Idara Ilm-o-Adab,Aligarh

2024

Rāzī-i Hind

Prof. Hakīm Muhammad Taiyab

Hakīm Fakhre Alam

Idara Ilm-o-Adab, Aligarh

Printed by
A.R. ENTERPRISES
E198, Jaitpur Extn., New Delhi-44
E: barnigraphic@gmail.com

ISBN: 978-81-940846-9-3